چراغاں

حصہ اول ''قندیل''

خصائصِ چہاردہ معصومینؑ

اور

محسنینِ اسلام



سید رفیق عباس جعفری

جناب سید مجاہد عباس صاحب کے
رفیق جعفری
۲۵/جون ۲۰۱۹

چراغاں

حصہ اوّل "قندیل"

خصائصِ چہاردہ معصومینؑ
اور
محسنینِ اسلام

سید رفیق عباس جعفری

ناشر
قمر زہرا میموریل اکیڈمی، کراچی

اشاعتِ اوّل

جنوری/2019ء

نام کتاب : "چہار اماں" حصہ اوّل "تقدیل" (خصائصِ چہاردہ معصومینؑ اور محسنینِ اسلام)
تالیف : سید نقی عباس جعفری
کمپوزنگ : راحت حسین، احمد گرافکس (021-36805931)
سرورق : سید علی اسد جعفری (مانچسٹر)
ناشر : قمر زہرا میموریل اکیڈمی، کراچی
ہدیہ :

ملنے کا پتہ
احمد بک سیلرز
ہول سیلرز اینڈ آرڈر سپلائرز
718/20 فیڈرل بی ایریا، کراچی
فون:021-36364924
Email: sh.jafri786@gmail.com

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

ملیکۃ العرب

جناب خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا

کے نام

فہرستِ مضامین

چہاردہ معصومینؑ

محسنینِ اسلام

اہم مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چراغاں

حصہ اوّل ''قندیل'' کی روشنی

علامہ سید شہنشاہ حسین نقوی

مولائے کائنات، امیر المومنین، امام المتقین، حیدر کرار حضرت مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام'' کچھ زاہدوں کے بارے میں'' فرماتے ہیں:

'' یہ انھیں دُنیا والوں میں سے تھے لیکن اہلِ دُنیا نہیں تھے۔ ایسے تھے جیسے اِس دُنیا کے نہ ہوں۔ دیکھ بھال کر عمل کیا اور خطرات سے آگے نکل گئے۔ گویا اِن کے بدن اہلِ آخرت کے درمیان کروٹیں بدل رہے ہیں اور وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ دُنیا ان کی موت کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں، حالاں کہ وہ خود اِن زندوں کے دلوں کی موت کو زیادہ بڑا حادثہ قرار دے رہے ہیں۔'' (ماخوذ از نہج البلاغہ)

امیر المومنین علیہ السلام نے خطبہ 153 میں یوں رہنمائی فرمائی ہے:

'' اے فتنے والو! اپنی سرمستیوں سے ہوش میں آؤ، غفلت سے آنکھیں کھولو۔ اِس دُنیا کی دوڑ دھوپ کو کم کرو اور جو باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک سے پہنچی ہیں، اُن پہ اچھی طرح غور کرو کہ اُن کے علاوہ نہ کوئی چارہ ہے اور نہ کوئی گریز کی راہ۔ جو ان کی خلاف ورزی کرے، تم اُس سے دوسری طرف رُخ پھیر لو اور اسے چھوڑ دو کہ وہ اپنے نفس کی مرضی پر چلتا رہے۔ فخر کے پاس نہ جاؤ اور بڑائی کے سر کو نیچا کرو۔ اپنی قبر کو یاد رکھو کہ تمھارا راستہ وہی ہے اور جیسا کرو گے ویسا ہی پاؤ گے۔ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ جو آج بھیجو

گے، وہی کل پاؤ گے۔ آگے کے لیے کچھ تیار کرو اور اُس دن کے لیے کچھ سامان تیار رکھو۔ اے سننے والو! ڈرو، ڈرو! اے غفلت کرنے والو! کوشش کرو، کوشش کرو۔ خبر رکھنے والا جو تمھیں بتائے گا، وہ کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا ہے۔"

شیرِ خدا، بابِ مدینۃ العلم، ابوتراب حضرت مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام کے یہ کلماتِ علم و حکمت اور تمام تر فرمودات حمیدہ کے متعلق ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں سونے کے حروف سے لکھنے کے ساتھ ساتھ ہر انسان اپنے دل پر ثبت کرے، ذہن اور رُوح میں جاگزیں کر لے۔

"قرآن اور شہزادی فاطمہ سلام اللہ علیہا" نامی عمدہ ترین کتاب کے مؤلف محترم و مکرّم برادرم جناب حاجی سید رفیق عباس جعفری دامت برکاتہٗ جو نہ صرف ہمارے سفرِ حج کے رفیق ہیں، بلکہ ماشاء اللہ علمی و ادبی اور دینی لحاظ سے نمایاں ہستی ہیں۔ ادیب اور شاعر اہلِ بیتؑ ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ اور وسیع النظر شخصیت ہیں۔

محافل اور مجالس کی رونق، مساجد اور امام بارگاہوں کے راہی، اِن دنوں مختلف عوارض سے دوچار ہونے کے باوجود الحمدللہ علمی و ادبی، فکری و دینی، مذہبی و سماجی اور اصلاحی و ایمانی تحریروں کی دُنیا میں مصروفِ عمل ہیں۔ اِن کی زندگی اور جدو جہد کی ترجمانی اِس شعر کی صورت میں کی جا سکتی ہے:

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا، تب نگیں ہوا

اِن کی حالیہ کتاب بعنوان "چراغاں ــــ حصہ اوّل، قندیل" منظرِ عام پر آرہی ہے، جس کا حصہ دوّم بھی اِن شاء اللہ عن قریب شائع ہوگا۔ اس کتاب میں وہ مضامین جمع کیے گئے ہیں جو ماہ نامہ "خواجگان" لاہور اور ماہ نامہ "طاہرہ" کراچی میں تواتر کے ساتھ

شائع ہوتے رہے ہیں۔ ماہ نامہ "خواجگان" کے محترم سید رفیق عباس جعفری مدیر اعزازی بھی ہیں۔ اِس حوالے سے بھی ان کی قلمی خدمات نمایاں ہیں۔

پوری کتاب کا مطالعہ تو ابھی نہیں کر سکا ہُوں، البتہ جستہ جستہ مطالعے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہُوں کہ واجب الاحترام سید رفیق عباس جعفری جن کا خانوادہ علم و ادب کا خانوادہ ہے، ان کے برادرِ خورد محترم جناب سیّد عقیل عباس جعفری بین الاقوامی سطح کے معروف ریسرچ رائٹر ہیں۔ درحقیقت محترم جناب رفیق عباس جعفری صاحب کے مزاج میں جاننے اور سیکھنے کی جو جستجو اور خُو بُو ہے، مطالعہ اور تحقیق اُس کا حتمی نتیجہ ہیں اور اِن سب کا حاصل اِن کی یہ حالیہ کتاب ہے۔

کتابِ ہٰذا میں موٗلف نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کا نچوڑ معلوماتی، موٗثر اور جامع مضامین کی صورت میں پیش کیا ہے۔ نادرِ روزگار شخصیات اور مشاہیر کی سدا بہار تحریروں میں سے جو "گلاب اور کلیاں" چن کر اپنے اِس "گُل دستے" میں سجائے ہیں، اُن سے اِس حسین گل دستے کے حُسن میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

محترم بزرگوارم سید رفیق عباس جعفری صاحب ایک سنجیدہ مزاج، کام میں مگن اور نہایت شگفتہ اور شفیق اِنسان ہیں۔ حضرتِ سُرور بارہ بنکوی صاحب نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہوجائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہُوں مگر ایسے بھی ہیں

لہٰذا محترم سید رفیق عباس جعفری صاحب سے مل کر بھی دلی خوشی ہوتی ہے۔ کتابوں

اور انسانوں کی دُنیا سے علم و ادب، تہذیب و ثقافت رُوحانیت و معنویت اور اعلیٰ اقدار و افکار کی جو خوشبوئیں وہ اپنی دانست میں کشید کرتے رہتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب اُن بھینی بھینی خوشبوؤں کا امتزاج اُن کی مہربان اور مشفق ہستی کا حصّہ ہے۔

ہمیشہ اچھے ہی لوگوں سے دوستی رکھی
یہ جاننے کے لیے ہم خراب کتنے ہیں

بارگاہِ ایزدی میں دُعا گو ہوں کہ اللہ رحمٰن و رحیم سیّد رفیق عباس جعفری بھائی کی عزت و توقیر، قدر و منزلت اور توفیقاتِ خیر میں اور اضافہ فرمائے، انھیں صحتِ کاملہ، شادابی اور نیک کاموں میں استقامت عطا فرمائے۔

اِن کی حیات ایسی ہی مزید عمدہ عمدہ کتابوں کی تیاری اور اشاعت سے مثالی حیات بنے اور عاقبت بخیر ہو۔ (آمین)

ہم عاشقانِ آلِ محمدؐ ہیں اے صبا
زندہ رہیں گے نام ہمارے فنا کے بعد

والسلام
دُعا گو، طالبِ خیر
علامہ سیّد شہنشاہ حسین نقوی

پیش لفظ

سیلِ نور

دین مبین کی ترویج کے لیے علمائے کرام نے خطبے ارشاد کیے اور کتابیں تصنیف کیں۔ خطبے، کچھ تو لوگوں نے لکھ کر محفوظ کر لیے، بقیہ ہواؤں میں گم ہو گئے لیکن کتابیں زندہ رہیں۔ ان اکابر نے آخری کتاب "قرآن مجید" اور احادیث شریف کے تراجم کیے اور تفاسیر تیار کیں۔ ظاہر ہے ان کاموں میں ان لوگوں کا خون پسینہ شامل ہوا۔ جب یہ کتابیں پیش کی گئیں تو ان کے پڑھنے والے بھی کثیر تعداد میں وجود میں آئے۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ لکھنے والا لکھ کر امر ہو گیا۔ جب تک تحریر موجود ہے تصنیف کرنے والا بھی ہے۔ البتہ پڑھنے والے نے تحریر پڑھ کر اس سے ذاتی طور پر استفادہ کر لیا لیکن اس کی ذات کے ساتھ ہی اس کا مطالعہ ختم ہو گیا۔ اب اگر پڑھنے والا اپنے مطالعہ کو مشاہدے یا تجربے کے ساتھ ملا کر آگے بڑھا دے یا تحریر کی شکل دے دے تو یہ چراغ سے چراغ جلانے والی بات ہو جائے گی۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کسی کی تحریر کو اپنے نام سے آگے بڑھا دینا سرقہ ہے۔ یقیناً کسی کی تحریر کو اپنے نام سے شائع کرنا سرقہ ہے، لیکن ایسی تحریر کے آگے اصل لکھنے والے کا یا کتاب، رسالے، اخبار کا نام بطور ماخذ یا منابع لکھ دیا جائے تو یہ سرقہ نہیں کہلائے گا۔

مجھے مطالعے کا شوق کم سنی سے تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد محسوس کیا کہ جو کچھ میں نے پڑھا وہ تو میرے بعد میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ کیوں نہ تحریر کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ پہلے میں نے مضامین لکھے اور کچھ احباب کو اور چند علمائے اکرام کو دکھائے جنہوں نے انہیں پسند کیا اور شائع کرنے کی تجویز دی۔ چنانچہ میں نے مضامین تالیف کیے اور مختلف رسائل کو ارسال کیے۔ جہاں بھی میں نے یہ مضامین بھیجے سب جگہ قابلِ اشاعت قرار پائے۔

میری تالیف ''قرآن اور شہزادی فاطمہؑ'' سال ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ سال ۲۰۱۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۲۰۱۸ء میں منقبت، سلام اور نوحوں کا مجموعہ ''سخن چراغاں'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

عام طور سے آج کل کہا جاتا ہے کہ کتابیں پڑھنے کا سلسلہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ یہ سلسلہ ختم تو نہیں کم ضرور ہو گیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کی کتابیں شائع بھی ہو رہی ہیں، فروخت بھی ہو رہی ہیں اور پڑھی بھی جا رہی ہیں۔ ہر سال برصغیر ہند و پاکستان میں کتب میلوں، رسم اجرائی کتب کی تقریبات وغیرہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ زبانیں اب ایک علاقہ سے نکل کر عالمی سطح پر پھیل رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر زبان کی کتاب دنیا بھر میں جہاں اس کے بولنے والے ہیں شائع ہو رہی ہیں۔

ناچیز نے رسائل کے لیے مضامین کا سلسلہ ۲۰۰۹ء میں شروع کیا تھا۔ ماہنامہ ''خواجگان'' لاہور، ماہنامہ ''طاہرہ'' کراچی، ماہنامہ ''اصلاح'' کراچی اور چند اور رسالوں اور اخبارات میں یہ مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ سب سے زیادہ میری حوصلہ افزائی ماہنامہ ''خواجگان'' لاہور کے جناب محمد تقی جاوا صاحب نے فرمائی۔ ارادہ یہ ہے کہ ان مضامین کو کتابی شکل دے دی جائے تاکہ یہ ایک جگہ محفوظ ہو جائیں۔ وجہ اشاعت نہ کاروبار ہے نہ شہرت۔ پہلے ان مضامین کو منتخب کیا جو چہاردہ معصومین اور محسنین اسلام علیہم السلام سے متعلق ہیں۔ چہاردہ معصومین علیہم السلام کی حیات اور سیرت سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے ان ہستیوں پر کئی مضامین ان کے خصائص کی روشنی میں مختلف رسائل کے لیے تالیف کیے۔ ان مضامین میں سے جو سب سے اچھا لگا وہ اس انتخاب میں شامل کر لیا۔ آئندہ کتابوں میں بقیہ مضامین شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سید رفیق عباس جعفری

یکم جنوری ۲۰۱۹

چہاردہ معصومینؑ

"خُلقِ عظیم"

"وَ اِنکَ لَعلیٰ خُلُقٍ عَظِیم.

(اور بے شک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں)" القلم۔ آیت ۳۔

یہ آیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلق عظیم یعنی بلند ترین اخلاق پر فائز ہونے کی سند ہے۔

مولانا سید علی نقی النقوی، اپنی کتاب "تاریخِ اسلام" میں فرماتے ہیں:

ابتدائی عمر سے پیغمبر خدا کی بلندی کردار اور پاکیزگی اخلاق کا ہر مشاہدہ کرنے والے کو احساس ہوتا تھا۔ جاہلیت کے غلط رسوم عادات سے آپؐ قطعی بے تعلق رہتے تھے اور مروت وانصاف امانت داری، حسن معاشرت، حقوق ہمسایہ کی ادئیگی، حلم و برداشت اور راست گفتاری میں تمام قوم کے افراد سے امتیاز خاص کے مالک نظر آتے تھے۔ اسی لئے قریش کے لوگ عموماً آپ کو "امین" کے نام سے یاد کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے جناب رسالت مآب کو اس شان سے دنیا میں بھیجا کہ ان کی ولادت سے قبل ہی لوگوں نے ان کے والد گرامی کی پیشانی میں ان کی تجلی دیکھ لی تھی۔ دادا اور چچا نے ان کی رسالت کا ادراک کر لیا تھا چنانچہ آپ کی پرورش انتہائی احتیاط اور دانائی سے کی جاتی رہی۔ اعلان نبوت سے پہلے آپ نے ایک عرصے تک مکہ میں ایک خاموش مگر پر اثر زندگی گزاری۔ اعلان نبوت تک آپؐ نے صداقت، دیانت اور اخلاق سے بھرپور وہ کردار دنیا کے سامنے پیش کیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپؐ نے جبل

فاران پر جا کر لوگوں سے پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک لشکر ہے تو کیا تم یقین کر لو گے۔ لوگوں نے بہ یک زبان ہو کر کہا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ صادق و امین پایا ہے، ہم یقیناً آپ کی بات پر اعتبار کر لیں گے۔ اس اقرار کے بعد آپؐ نے پیغام توحید لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ کے مقدمات اور تقاریر کے مجموعے "سیرت نبویؐ ایک مطالعہ" (ص ۱۰۲) میں لکھا ہے:

"حضرت علیؑ فرماتے ہیں: انبیاء قناعت اور سادگی کے پیکر تھے اور یہی اُن کی سیاست تھی، وہ دلوں کو بے نیاز کرتے تھے لیکن ظاہری جاہ و جلال اور شان و شوکت سے نہیں، بلکہ روحانی جلال سے۔ جس کے ساتھ سادگیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جلال و حشمت سے اس قدر متنفر تھے کہ اس تنفر کی جھلک آپ کی پوری زندگی میں نظر آتی ہے۔ اگر کہیں جانا چاہتے تھے اور اگر کچھ لوگ ان کے پیچھے چلنا چاہتے تو آپ اس بات کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے۔ اگر آپؐ سواری پر ہوتے اور کوئی پیدل چلنے والا آپؐ کے ساتھ آنا چاہتا، تو آپؐ اس سے فرماتے: بھائی! ان دو میں سے کوئی ایک بات کرو، یا تو تم آگے چلو، میں تمھارے پیچھے آتا ہوں، یا میں جاتا ہوں، تم بعد میں آ جانا۔ یا اگر کبھی ممکن ہوتا کہ دو افراد سوار ہو جائیں، تو فرماتے تھے کہ آؤ دونوں ایک ساتھ سوار ہو جاتے ہیں۔ میں سوار رہوں اور تم پیدل چلو، یہ مناسب نہیں ہے۔ محال تھا کہ آپؐ اس بات کی اجازت دے دیں کہ آپؐ تو سواری پر چل رہے ہوں اور کوئی دوسرا پیدل آپؐ کے ساتھ چلے۔ کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے، تو فرماتے: گول دائرے (کی صورت) میں بیٹھتے ہیں، تا کہ ہماری محفل میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ اگر میں صدر مجلس میں بیٹھ جاؤں اور تم لوگ میرے اردگرد بیٹھے ہو، تو تم میرے جلال اور دبدبے کا حصہ بن جاؤ گے، اور میں یہ نہیں چاہتا۔

آنحضرتؐ جب تک زندہ رہے، اپنا یہ اصول نہ توڑا۔ آپؐ اس اصول کی پابندی کو ایک اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ رہبر و رہنما کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اپنی خلافت کے زمانے میں، انتہائی حد تک اس اصول کا لحاظ رکھتے تھے۔ اسلام ایک قائد و رہبر کو (بالخصوص اگر وہ معنوی اور روحانی پہلو کا حامل بھی ہو) ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے لئے جاہ و جلال اور شان و شوکت کا قائل ہو جائے۔ اس کا جاہ و جلال اور شان و شوکت دراصل اس میں پائی جانے والی معنویت اور روحانیت میں ہے، اس کی قناعت میں ہے، اس کی روح میں ہے، نہ کہ اس کے جسم میں یا اس کے ظاہری تکلفات میں۔

وہ واقعہ کسے یاد نہ ہوگا کہ ایک ضعیفہ جو لکڑیوں کا گٹھر اٹھا کر بمشکل چل رہی تھی، حضورؐ نے اس کی مدد فرمائی اور اس کا بوجھ اپنے سر پر رکھ کر اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ راستے میں بڑھیا برابر دعائیں دیتی رہی اور ساتھ ہی تلقین کرتی رہی کہ دیکھو اسی مکہ میں ایک شخص نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور ہمارے بتوں کی نفی کرتے ہوئے ایک اللہ کے معبود ہونے کی تلقین کر رہا ہے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آجانا۔ حضورؐ خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ منزل پر پہنچ کر ضعیفہ نے آپ کا نام پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا میرا نام محمد بن عبداللہ ہے اور میں ہی دعوت اسلام کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔ ضعیفہ حضورؐ کے حسن عمل اور اخلاق سے اتنا متاثر ہوئی کہ فوراً ایمان لے آئی۔

حضور اکرمؐ کی حیات مبارک میں اعلیٰ اخلاق کی ایسی مثالیں لاتعداد ہیں۔ جنگ احد میں آپؐ کے چچا جناب امیر حمزہؓ کا سینہ ایک حبشی غلام سے چاک کروا کے ہندہ زوجہ ابی سفیان نے چبا لیا تھا۔ بعد میں جب حالات پلٹ گئے تو آپؐ نے ابوسفیان، ہندہ اور اس حبشی غلام کو معاف فرما دیا۔ یہ وسیع القلبی اور بلندی کردار کی اعلیٰ مثال تھی۔ اسی طرح صلح

حدیبیہ کے موقع پر آپؐ نے فساد رفع کرنے کی غرض سے اپنے نام کے آگے سے لفظ "رسول اللہ" کو کاٹ دیا۔ یہ بھی اعلیٰ اخلاق کی ایک نادر مثال تھی۔ نہ صرف حضورؐ کی حیات مبارک بلکہ ان کے وصیین کی زندگیاں بھی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ جب اپنی خلافت کے دور میں مدائن تشریف لائے جو کہ بغداد کے نزدیک واقع ہے اور جہاں نوشیرواں کا قدیم محل، یعنی قصرِ مدائن تھا، آپؑ اس محل میں آئے اور اس کا نظارہ کرنے لگے۔ اس موقع پر ایک شخص نے دنیا کی بے وفائی کے بارے میں ایک عربی شعر پڑھنا شروع کیا کہ: "چلے گئے وغیرہ۔۔" آپؑ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ آیت قرآن پڑھو: یہ لوگ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے اور کتنی ہی کھیتیاں اور عمدہ مکانات چھوڑ گئے اور وہ نعمتیں (بھی) جن میں مزے اڑا رہے تھے۔ (دخان ۴۴، آیت ۲۵ تا ۲۷)

جب آپؑ ایران پہنچے اور ایرانیوں کو معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ تشریف لا رہے ہیں، تو گاؤں کے بڑے کسانوں کے کچھ سردار آپؑ کے استقبال کے لئے آئے اور آپؑ کے آگے آگے دوڑنے لگے۔ حضرت نے انہیں آواز دی اور پوچھا: یہ کیا کر رہے ہو؟ ان لوگوں نے کہا: ہم اپنے بزرگوں کا اسی طرح سے احترام کیا کرتے ہیں، ان کی سواری کے آگے آگے دوڑا کرتے ہیں۔ ہم یہی کام آپؑ کے احترام میں بھی کر رہے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: تم لوگ اس عمل کے ذریعے اپنے آپ کو حقیر اور پست کر رہے ہو اور اس سے اس بزرگ کو بھی ذرہ برابر فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے یہ تکلفات پسند نہیں ہیں۔ تم لوگ انسان ہو اور آزاد۔ میں بھی ایک انسان ہوں اور تم بھی ایک انسان ہو۔

آیئے خلق عظیم کی ایک اور مثال دیکھتے ہیں:

حضرت فاطمہؑ کی شادی کی رات ہے۔ آپؑ کے لئے شب زفاف کے پیراہن کے طور پر صرف ایک نیا لباس خریدا گیا ہے۔ ایک لباس ان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ اس

شب میں سائل آپ کے دروازے پر آتا ہے اور صدا لگاتا ہے: میں بے لباس ہوں، کوئی ہے جو میرے لئے لباس کا انتظام کرے؟ وہاں موجود دوسرے لوگ اس سائل کو کچھ دینے کے لئے اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ جناب فاطمہؑ جو اس گھر کی دلہن ہیں اور جو دلہن بنی بیٹھی ہیں، دیکھتی ہیں کہ کسی نے سائل کو جواب نہیں دیا، فوراً اکیلے ہی اٹھ کر تنہائی میں جاتی ہیں اور وہ نیا لباس اتار کر اپنا پرانا لباس پہن لیتی ہیں اور وہ نیا لباس سائل کو دے دیتی ہیں۔ جب واپس آتی ہیں تو لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کا نیا لباس کہاں گیا؟ فرمایا: میں نے اسے راہِ خدا میں دے دیا۔

جناب سیدہؑ اگر فدک کے حصول کی کوشش کرتی ہیں تو وہ اس لئے کہ اسلام حق کے مطالبے کو واجب سمجھتا ہے، ورنہ فدک کی کیا اہمیت ہے؟ اگر آپؑ فدک کے لئے نہ گئی ہوتیں تو یہ ظلم قبول کرنا ہوتا، ظلم کے آگے جھکنا ہوتا۔ فدک جیسی سیکڑوں املاک وہ راہ خدا میں دے چکی تھیں۔ بس ظلم انہیں قبول نہیں تھا اس لئے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ یعنی جناب سیدہؑ کے لئے فدک کی اہمیت اس اعتبار سے تھی کہ وہ ان کا حق تھا۔ اقتصادی اور مادّی اعتبار سے اس کی اہمیت بس اتنی تھی کہ اگر فدک ہمارے پاس ہو تو ہم دوسروں کی زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔ یہ تو ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ان کو فدک مل بھی جاتا تو یقیناً وہ مستحقین کو عنایت کر دیا جاتا۔ ویسے بھی آیۂ تطہیر کی رو سے ہر قسم کا رجس (جس میں جھوٹ یا جھوٹا دعویٰ کرنا بھی شامل ہے) ان سے دور ہے۔ اس اعتبار سے ان کا دعویٰ کرنا ہی کافی ہے چہ جائیکہ ان سے ثبوت اور گواہ طلب کئے جائیں۔

اس گھرانے کی ایک اور مثال ہمیں سورہ ھل اتٰی کی آیات ۷، ۸ اور ۹ کی تفسیر میں نظر آتی ہے۔ ان آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے۔ "یہ بندے نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں، جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اس کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر

کو کھانا کھلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) ہم صرف اللہ کی مرضی کی خاطر تمہیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔" تفسیر ان آیات کی یوں ہے: زمخشری اور فخر الدین رازی دونوں نے نقل کیا ہے کہ یہ آیاتِ کریمہ اہلِ بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ جب حضرات حسنؑ و حسینؑ بیمار ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو نذر ماننے کی دعوت دی اور انہوں نے مع جناب فاطمہؑ اور فضہؓ کے تین تین روزوں کی نذر مان لی۔ اور جب شفا کے بعد روزے رکھے تو تین صاع جو لے آئے۔ جناب فاطمہؑ نے ایک ایک صاع کی پانچ پانچ روٹیاں تینوں دن تیار کیں اور وقت افطار کبھی مسکین، کبھی یتیم اور کبھی اسیر آ گیا اور سب نے اپنی اپنی روٹیاں اس کے حوالے کر دیں اور پانی سے افطار کر لیا۔ تیسرے دن حضورؐ نے جب یہ حال دیکھا تو پریشان ہوئے اور جناب جبریلؑ سورہ لے کر نازل ہوئے کہ یہ اہل بیت کے ایثار کی جزا ہے۔

حضرت امام حسنؑ کا اخلاق: ("چودہ ستارے" تالیف الحاج مولانا سید نجم الحسن صاحب کراروی سے)

علامہ ابن شہر آشوب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت امام حسن علیہ السلام گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں معاویہ کے طرف داروں کا ایک شامی سامنے آ گیا۔ اس نے حضرت کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ آپؑ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ اپنی جیسی کر چکا تو آپؑ اس کے قریب گئے اور اس کو سلام کر کے فرمایا کہ بھائی شاید تو مسافر ہے، سن! اگر تجھے سواری کی ضرورت ہو تو میں تجھے سواری دے دوں، اگر بھوکا ہے تو کھانا کھلا دوں، اگر تجھے کپڑے درکار ہوں تو کپڑے دے دوں۔ اگر تجھے رہنے کو جگہ چاہیے تو مکان کا انتظام کر دوں۔ اگر دولت کی ضرورت ہے تو تجھے اتنا دے دوں کہ تو خوش حال ہو جائے۔ یہ سن کر شامی بہت شرمندہ ہوا اور کہنے لگا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ

زمین خدا پر اس کے خلیفہ ہیں۔ مولا میں تو آپؑ کو اور آپؑ کے باپ دادا کو سخت نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن آج آپ کے اخلاق نے مجھے آپؑ کا گرویدہ بنا دیا۔ اب میں آپؑ کے قدموں سے دور نہ جاؤں گا اور تا حیات آپؑ کی خدمت میں رہوں گا۔ (مناقب جلد ۴ و کامل مبرد ج ۲ ص ۸۶)۔

حضرت امام حسینؑ کا خلق عظیم : (علامہ طالبؔ جوہری مد ظلہ العالی کی کتاب "حدیث کربلا" سے)

"ذوحسم" مکہ اور کوفہ کے درمیانی راستہ میں واقع ہے۔ یہ شراف اور بیضہ کے درمیان ایک پہاڑ تھا جہاں حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کی شکارگاہ تھی۔ جناب حر اپنے ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی حسینی قافلہ کے پہلو میں قیام کیا۔ امامؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان لوگوں کو پانی پلاؤ اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیراب کرو۔ علی بن طعان محاربی کہتا ہے کہ میں جناب حر کے لشکر کا آخری آدمی تھا۔ جب میں پہنچا تو امامؑ نے میری پیاس دیکھ کر کہا: راویہ کو بٹھلا دو۔ راویہ عراقی زبان میں مشک کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا علی بن طعان جملے کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ پھر آپؑ نے فرمایا: اونٹ کو بٹھلا دو۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے اس اونٹ کو بٹھلا دیا جس پر فوج کے لئے مشکیزوں میں پانی بار کیا جاتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: پانی پیو۔ جب میں نے پانی پینا چاہا تو پانی مشک کے دہانے سے گرنے لگا اور میں اطمینان سے پانی نہ پی سکا۔ امامؑ نے فرمایا کہ مشک کے دہانے کو چھوٹا کر لو۔ جب میں کامیاب نہ ہوا تو آپؑ اپنی جگہ سے اٹھے۔ آپؑ نے دہانے کو موڑ کر مجھے اور میرے گھوڑے کو پانی پلایا۔

حضرت امام زین العابدینؑ کا حسن اخلاق: جناب عبدالماجد دریابادی نے "تفسیر ماجدی" میں آیت ۱۳۴ سورۂ آل عمران: (متقی) وہی لوگ ہیں جو تونگری اور تنگ دستی کی حالت میں خرچ کرتے ہیں، غصے کو پی جاتے ہیں، لوگوں (کی خطاؤں) کو معاف کرتے

ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے کی تفسیر میں لکھا ہے کہ متقین وہ ہیں جو لوگوں کے قصوروں اور خطاؤں کو معاف کر دیتے ہیں' یہی نہیں کہ قدرت واستطاعت کے باوجود خطاوار سے انتقام نہیں لیتے بلکہ اسے معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہ درجہ کاظمین سے بلند تر ہے' وہ اگر ایک سلبی کیفیت تھی' تو یہ ایک ایجابی مرتبہ ہے۔ محسنین کا درجہ کاظمین و عافین دونوں سے بلند تر ہے۔ یعنی عفو سے بھی آگے بڑھ کر یہ اور حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ اخلاقی تعلیمات کے موقع پر قرآن نے اکثر تدریج کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور اس کی بہترین مثال یہ آیت ہے۔ تینوں مقامات فضیلت کے ہیں لیکن یہ تیسرا مقام فاضل ترین ہے۔ محدث بیہقی نے سیدنا حضرت علی بن حسینؑ سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ آپ کو ایک جاریہ (کنیز) وضو کرا رہی تھی کہ لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپؑ پر گرا۔ غصہ آنا امر طبعی تھا۔ جاریہ نے فوراً الفاظ قرآنی "الکاظمین الغیظ" اپنی زبان سے ادا کیے۔ آپ کا غصہ دور ہو گیا۔ پھر کنیز نے "العافین عن الناس" پڑھا، آپ نے فرمایا "میں نے معاف کر دیا" اب جاریہ کی زبان پر "و اللہ یحب المحسنین" آیا۔ آپ نے فرمایا جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ رسولؐ کی زندگی تو خیر من وعن قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ہی رسول اکرمؐ سے قرب وقرابت رکھنے والے بھی کس درجہ نفوس قدسیہ کے مالک بن چکے تھے۔

مندرجہ بالا روایت بالکل اسی طرح "تفسیر ابن کثیر" اور "تفسیر نور" میں موجود ہے۔ "تفسیر القرآن" از مولانا سید ظفر حسن امروہوی اور "ترجمہ قرآن الحکیم" از مولانا حافظ سید فرمان علی میں یہ روایت حضرت امام حسنؑ اور ان کے ایک غلام کے حوالہ سے مذکور ہے کہ وہ غلام آپ کو کھانے کے دوران سالن پیش کر رہا تھا کہ یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا اور آپؑ نے اسے آزاد فرما دیا۔

جناب سید مجتبیٰ موسوی لاری نے اپنی تالیف "انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار"

کی "پیش گفتار" میں بجا طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ جس طرح ہمیں یہ یقین ہے کہ اس دنیا میں تغیر و دگر گونی کو ثبات حاصل ہے اسی طرح ہمیں یہ بھی یقین رکھنا چاہئے کہ دنیا میں کچھ اصول اور مفاہیم بھی ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہنے والے ہیں۔ یہ پائیدار اور ہمیشہ رہنے والے اصول "اخلاقی اصول" ہیں جن کی پیروی عقلِ سلیم کی رو سے ہم پر لازم ہے اور ہم اس بات کے پابند ہیں کہ اپنی حیات کو ان اصولوں کے سایہ میں بسر کریں۔

رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی زندگیاں ان اصولوں سے مزین ہے اور ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ ہم اپنی محافل اور مجالس میں ان کو بیان کرتے ہیں یا سنتے ہیں اور اپنی زندگیوں پر ان کا اطلاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں

مسجد نبویؐ میں ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ نوافل ادا کر رہے تھے اور بعد میں آنے والے اپنی نماز ادا کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک سوالی مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی۔ وہ شخص پوری مسجد میں گھوما۔ جب کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی تو اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور گویا ہوا "اے اللہ! گواہ رہنا میں نے تیرے رسولؐ کی مسجد میں سب سے مدد طلب کی ہے لیکن کسی نے بھی میرا جواب دینا گوارا نہیں کیا" ایسے میں اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو انگلی کے اشارے سے دورانِ نماز کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ شخص اس نمازی کی طرف تیزی سے گیا تو دیکھا کہ وہ نمازی حالت رکوع میں اپنی انگلی اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ انگلی میں ایک چاندی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ سائل سمجھ گیا کہ نمازی نے دورانِ نماز اس کا استغاثہ سن لیا ہے اور اپنی نماز کے ختم کرنے سے پہلے اس کے سوال کو پورا کرنا چاہتا ہے اور انگوٹھی والی انگلی سے اشارہ کر کے چاہتا ہے کہ اس سے انگوٹھی اتار لی جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور بآسانی انگوٹھی انگلی سے اتار لی۔ اس کی مایوسی خوشی میں تبدیل ہو گئی کیونکہ اس کی حاجت پوری ہو گئی تھی۔ وہ جھولی پھیلا پھیلا کر دینے والے کو دعائیں دیتا خوشی خوشی چلا گیا۔ انگوٹھی عطا کرنے والے بحرِ جود و سخا حضرت علیؑ تھے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس واقعے کو دیکھا کیونکہ وہ بھی اس وقت حالتِ نماز میں مسجد میں ہی تھے نماز کے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور فرمایا:

"اے اللہ میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی روح کو وسعت دے

اوران کے کام ان پر آسان کردے اوران کی زبان کی گرہ کھول دے تا کہ لوگ ان کی بات سمجھ سکیں۔ جناب موسیٰ نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور مددگار بنادے اوران کے ذریعہ ان کی قوت میں اضافہ فرما اور انہیں ان کے کاموں میں شریک کردے۔ اے اللہ میں تیرا رسولؐ اور برگزیدہ ہوں۔ میرے سینہ کو کھول دے۔ میرے کام مجھ پر آسان کردے اور میرے خاندان سے میرے عم زاد علیؑ کو میرا وزیر بنادے تا کہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط اور قوی ہو جائے۔''

ابھی پیغمبر اکرم کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ جناب جبرئیلؑ نازل ہوئے اور آپؐ سے فرمایا:

''پڑھیے!''

حضورؐ نے فرمایا: ''کیا پڑھوں؟''

تو جناب جبرئیل نے عرض کی:

پڑھیے: ''انما ولیکم اللہ۔۔۔۔

یہ روایت جناب ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے۔اس کے بعد یہی صحابی رسول فرماتے ہیں۔

''جو شخص نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاریؓ ہوں۔ان کانوں سے میں نے خود رسولؐ سے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں۔رسول اللہؐ نے فرمایا: ''علیؑ نیک اور پاک لوگوں کے قائد ہیں اور کفار کے قاتل ہیں جو ان کی نصرت و مدد کرے، اللہ اس کی مدد کرے گا اور جو شخص ان کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لے اللہ بھی اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا''

حضرت علیؑ کی اس عطا کے عوض نازل ہونے والی آیت سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۵۵ ہے۔

''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ

يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ○

یہ آیت آیہِ ولایت کہلاتی ہے لفظ "ولی" قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے۔ لیکن یہ لفظ جتنا خوبصورت اس آیت میں نظر آتا ہے شاید کہیں اور نہیں۔ لفظ "ولی" کے معانی "تفسیر نمونہ" میں "سرپرست" "تفسیر ابن کثیر" میں "مددگار" "تفسیر ماجدی" اور "کنزالایمان" میں "دوست" "تفہیم القرآن" میں "رفیق" لکھے ہیں جبکہ مولانا حافظ فرمان علی نے "مددگار و سرپرست" اور مولانا سیّد ظفر حسن امروہوی نے "سرپرست و حاکم" لکھے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی لفظ اللہ کے لئے اس کے رسولؐ کے لئے اور ان صاحبانِ ایمان کے لئے ارشاد ہوا ہے جو حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اس بات سے لفظ "ولی" کی ہمہ گیری سمجھ میں آتی ہے۔ اب اللہ کے لئے لفظ "دوست" کہنا کیسا ہے اس پر سوچنا چاہئے۔ "مددگار" "سرپرست" اور "حاکم" کے الفاظ میں جامعیت نظر آتی ہے یعنی ان الفاظ کو اگر اللہ کے لئے کہا جائے یا رسول اور صاحبانِ ایمان کے لئے کہا جائے تو زیادہ مناسب محسوس ہوتا ہے۔

اب آیت کے معانی پر غور کرتے ہیں۔

"بے شک تمھارے سرپرست و حاکم اللہ اس کا رسولؐ اور وہ صاحبانِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں حالتِ رکوع میں"۔

تمام تفاسیر نے اس آیت مبارکہ کی شان نزول اور تفسیر کے بارے میں تفصیلاً ذکر کیا ہے سوائے مولانا مودودی کے جنھوں نے اس آیت کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے اور اس کے ترجمے سے سرسری گذر گئے ہیں یعنی نہ اس کی شان نزول یا تفسیر بیان کی ہے نہ ہی حاشیہ قائم کیا ہے۔

تفسیر "درمنثور" اور "تفسیر نمونہ" نے اس کی آیت کی شانِ نزول اور تفسیر ذرا تفصیل سے بیان کی ہے۔ جن دو ذوات کو آیت کے پہلے حصہ میں "ولی" کہا گیا ہے ان کے بارے میں کوئی شک وشبہ اختلاف یا کسی وضاحت کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ ذات

باری تعالیٰ اور ذات پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اور جناب رسالت مآبؐ مومنین کے ولی ہیں۔ بات صرف ان مومنین کے بارے میں وضاحت چاہتی ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ان آیات قرآنی میں سے ایک ہے جو حضرت علیؑ کی امامت وولایت پر دلالت کرتی ہے۔

اسلامی کتب اور تفاسیر میں متعدد روایات موجود ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اس روایت کو ابن عباسؓ، عمار ابن یاسرؓ، عبداللہ بن سلامؓ، سلمہ بن کہیلؓ، انس بن مالکؓ، عتبہ بن حکیمؓ، عبداللہ بن غالبؓ، جابر بن عبداللہ انصاریؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور درجنوں دیگر راویوں نے بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ یہ روایت خود حضرت علیؑ سے بھی منقول ہے۔ مزید یہ کہ تیس سے زیادہ مشہور کتب اسلامی ہیں جن میں یہ روایت درج ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر واضح اور آشکار تھا کہ زمانہ پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسان بن ثابتؓ نے اس روایت کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"آپؑ وہ ہیں کہ جنہوں نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی
آپ پر جان فدا ہو اے بہترین رکوع کرنے والے
اور اس کے بعد اللہ نے بہترین ولایت آپ کے لئے نازل کی
اور اس امر کو قرآن مجید میں ثبت کر دیا"

اس آیت (یعنی آیۂ ولایت) کی تفسیر میں مولانا سید مقبول احمد دہلوی فرماتے ہیں کہ "المجالس" میں جناب امام محمد باقرؑ سے آیت انما ولیکم اللہ کی تفسیر میں یہ وارد ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ داخل زمرۂ اسلام ہوا جن میں عبداللہ ابن سلام، اسد ابن ثعلبہ، ابن امین اور ابن صوریہ بھی شامل تھے۔ ایک موقع پر یہ لوگ جناب رسالتمآب کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور عرض کی یا نبی اللہ! حضرت موسیٰ نے یوشع ابن نون کو اپنا وصی مقرر کیا تھا پس آپ کا وصی اور ہمارا ولی بعد آپؐ کے کون ہے؟ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا: اٹھو چلو۔ جب سب اٹھ کر مسجد میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سائل مسجد سے نکل رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے سائل سے پوچھا کیا تجھ کو کسی نے کوئی چیز دی ہے؟ اس نے عرض کی جی ہاں! یہ انگوٹھی۔ فرمایا کس نے دی؟ اس نے عرض کی اس شخص نے دی ہے جو نماز پڑھ رہا ہے۔ فرمایا کس حالت میں دی؟ عرض کیا جس وقت وہ رکوع میں تھا۔ یہ سن کر آپؐ نے تکبیر فرمائی۔ مسجد میں حاضر لوگوں نے بھی تکبیر کہی۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ علیؑ ابن ابی طالب میرے بعد تمہارا مولیٰ ہے۔ انہوں نے عرض کی "ہم اللہ کی ربوبیت سے، اسلام کے دین سے، محمدؐ کی نبوت سے اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت سے راضی ہیں"۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ومن یتول اللہ... (اور جو لوگ اللہ، اس کے پیغمبر اور صاحبانِ ایمان کی ولایت قبول کرلیں (وہی کامیاب ہیں کیونکہ) اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے) (المائدہ۔ آیت ۵۶)۔ کافی میں آیت ولایت کی تفسیر میں جناب امام جعفر صادقؑ سے وارد ہے کہ ولیکم سے مراد ہے کہ تمہارے معاملات میں تمہاری جانوں پر اور تمہارے مالوں پر سب سے زیادہ استحقاق رکھنے والا اللہ ہے اور اس کا رسولؐ ہے اور وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی علیؑ اور ان کی اولاد میں جتنے امام ہوں گے وہ سب۔ پھر چونکہ لفظ الذین امنو بہت عام تھا اس لئے خاص صفت یہ بیان کی "وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور دوران رکوع زکوٰۃ ادا کرتے ہیں" جناب امیرالمومنینؑ نمازِ ظہر پڑھ رہے تھے، دو رکعتیں پڑھ چکے تھے، حالتِ رکوع میں تھے۔ ایک حلّہ پہنے ہوئے تھے جس کی قیمت ہزار دینار تھی۔ حضورؐ نے وہ آپؑ کو عطا فرمایا تھا۔ حضورؐ کی خدمت میں یہ حلّہ نجاشی بادشاہ حبشہ نے بطور تحفہ بھیجا تھا۔ پس جب سائل نے کہا "اے ولی اللہ اور اے مومنوں سے زیادہ ان کی جانوں پر اختیار

رکھنے والے! آپؑ پر سلام ہو! مسکین کو صدقہ دیجئے"۔ حضرتؑ نے وہ حلّہ جسم اطہر پر سے گرا دیا اور انگلی سے اشارہ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ اسے لے جا۔ اللہ نے یہ آیت نازل کی اور جو کچھ عطا فرمایا اس میں ان کی اولاد کو شریک کر دیا۔ پس جو حضرت علیؑ کی اولاد میں سے درجہ امامت کو پہنچے گا وہ اس نعمت میں مثل ان حضرت کے ہو جائے گا اور وہ بھی حالت رکوع میں تصدق ضرور کریگا۔ اور وہ سائل جس نے جناب امیرؑ سے سوال کیا تھا فرشتوں میں سے تھا۔ اور جو کچھ ان ائمہ سے جو حضرت ہی کی اولاد ہیں ایسے موقع پر سوال کریں گے وہ بھی فرشتوں میں سے ہونگے۔ ظاہراً کافی اور مجمع البیان کی روایت میں فرق یہ ہے کہ وہاں تصدق کرنے میں حلّہ کا ذکر ہے اور یہاں انگوٹھی کا۔ زیادہ روایتوں میں انگوٹھی ہی کا ذکر ہے تو رفع اختلاف کی ظاہر صورت یہ ہے کہ جناب امیرؑ صدقہ دینے کے بہت عادی تھے۔ ممکن ہے کہ ایک وقت رکوع میں حلّہ تصدق فرمایا ہو اور دوسری دفعہ انگوٹھی۔ اور آیت اس دوسرے تصدق کے بعد آئی ہو۔

احتجاج طبرسی میں جناب امیر المومنینؑ سے منقول ہے کہ ان دونوں آیتوں میں جو الفاظ والذین آمنو آئے ہیں ان سے مراد عام مومنین نہیں ہیں بلکہ وہ حجج اللہ اور اوصیاء مراد ہیں جن کو یکے بعد دیگرے اپنی مخلوق پر اپنا امین مقرر فرماتا رہا ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے سے انکار کیا ہے۔ یا ولایت کی تفسیر سرپرستی، تصرف اور امامت کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ آیئے ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱:۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ عربی ادب میں مثالیں موجود ہیں جہاں فرد واحد کے لئے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیۂ مباہلہ (آلِ عمران۔ آیت ۶۱) میں لفظ "نسائنا" جمع کی صورت میں ہے جب کہ اس سے مراد جناب فاطمہ زہراؑ ہیں۔ اسی آیت میں لفظ

"انفسنا" جمع کی صورت میں ہے جب کہ مباہلہ کے لئے جانے والوں میں حضورؐ کے علاوہ صرف حضرت علیؑ تھے۔

بہت سی آیات قرآنی مثلاً مائدہ آیت ۵۲، ممتحنہ آیت ۱، منافقون آیت ۸، بقرہ آیات ۲۱۵، ۲۷۵ وغیرہ جن میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جمع کی شکل میں ہیں لیکن ان کی شان نزول کے مطابق ان سے ایک ہی شخص مراد تھا۔ خود اللہ تعالیٰ جو احد ہے کے لئے بہت سی آیات میں جمع کی ضمیر تعظیماً استعمال ہوئی ہے۔

۲:۔ حالت رکوع میں سائل کی آواز پر توجہ اور پھر اشارے سے زکوٰۃ کی ادائگی حضرت علیؑ سے کیسے ممکن ہے جو نماز میں مخصوص توجہ رکھتے تھے حتیٰ کہ حالت نماز میں ایک بار آپؑ کے پیر سے تیر کا پھل نکالا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی حاجت کو پورا کرنا اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کی طرف توجہ کرنا ہے۔ حضرت علیؑ اس وقت اپنے آپ سے غافل تھے مگر اللہ سے یا اس کے حکم سے غافل نہیں تھے۔ حالت نماز میں سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا عبادت کے اندر عبادت ہے۔ اشارے سے انگلی سے انگوٹھی کا اتر وادینا ہرگز "فعلِ کثیر" نہیں ہے بلکہ بندۂ مستحق کی مدد کرنا عینِ عبادت ہے اور عابد کے خلوص نیت کی آئینہ دار ہے۔

۳:۔ لفظ ولی کا مفہوم دوست اور مددگار ہے نہ کہ سرپرست و حاکم۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دوست اور مددگار ہونے کی صفت تو عام مومنین کے لئے ہے جب کہ یہاں یہ لفظ خاص مومنین کے لئے ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور یہاں یہ لفظ عملاً ایک شخص کے ساتھ مخصوص ہے۔ لفظ "ولی" پر اعتراض جو یہاں کیا جارہا ہے کہ اس کو حضرت علیؑ سے کیوں منسوب کیا جارہا ہے، اس کا عام سا جواب تو یہ ہے کہ یہ لفظ "ولی" علیؑ سے صوتی، ذاتی، وصفی اعتبار سے جتنا قریب ہے کسی اور سے

نہیں۔ غدیر میں تو حضورؐ نے مثال دے کر کہا کہ جس جس کا میں مولا ہوں اس اس کا علیؑ مولا ہے تو وہاں پر ''مولا'' کے ستر معنی گڑھ لئے گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ اس معنی کا اطلاق رسولؐ پر بھی ہو جائے گا۔

۴:۔ اعتراض یہ ہے کہ حضرت علیؑ اپنے لئے مال دنیا جمع ہی نہیں کرتے تھے تو پھر ان پر زکوٰۃ کیسے واجب ہوگئی۔ جواب یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے بہت سا مال کمایا اور اللہ کی راہ میں دے دیا۔ ہزاروں غلام اپنی مشقت کی کمائی سے آزاد کرائے۔ مختلف جنگوں میں مالِ غنیمت ملا۔ تو کچھ ایسا مال یا املاک جس پر زکوٰۃ واجب ہو کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ پھر مستحب زکوٰۃ تو کوئی بھی کسی وقت بھی ادا کر سکتا ہے۔ مستحب زکوٰۃ کا تذکرہ قرآن مجید کی بہت سی مکی آیتوں میں آیا ہے جب کہ زکوٰۃ ہجرت کے بعد واجب ہوئی ہے۔

۵:۔ اعتراض یہ ہے کہ آیت ''ولایت بالفعل'' کا اشارہ کر رہی ہے جب کہ علیؑ اس وقت ''ولایت بالقوۃ'' کے حامل تھے یعنی انہیں خلیفہ، وصی یا امام بعد پیغمبر ہونا تھا نہ کہ حیات رسولؐ میں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سی روایات میں حضورؐ حضرت علیؑ کو ''میرے وصی'' اور ''میرے خلیفہ'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کوئی اپنی زندگی میں کسی کو اپنا ''وصی'' یا ''جانشین'' مقرر کر دے تو اس کو اس وصیت کرنے والے کی زندگی میں ہی وصی یا جانشین پکارا جانے لگتا ہے۔ خود قرآن میں سورہ مریمؑ کی آیت ۵ (فھب لی من لدنک........ ترجمہ ''پس تو مجھ کو اپنی بارگاہ سے ایک جانشین عطا فرما جو میری اور یعقوبؑ کی نسل کی میراث کا مالک ہو) میں جناب ذکریاؑ دعا فرما رہے ہیں۔ یہاں ''ولی'' سے مراد ''مالک'' یا ''سرپرست'' ہے۔

۶:۔ اعتراض یہ ہے کہ آیۂ ولایت کا رابطہ قبل اور بعد کی آیات سے معنوی طور پر

نہیں بنتا کیوں کہ قبل اور بعد کی آیات میں "ولی" سے مراد دوست اور مددگار ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ایسا اکثر جگہ قرآن میں ہے کہ کسی آیت کا ربط پہلے یا بعد والی آیت سے نہیں ہوتا (جیسا کہ آیۂ تطہیر (احزاب آیت ۳۳) میں پہلے یا بعد کی آیات ازواج سے متعلق ہیں اور خود آیۂ تطہیر مخصوص اہل البیت اطہار سے مربوط ہے)۔ لیکن یہاں صورت حال مختلف ہے اور آیۂ ولایت قبل اور بعد کی آیات سے مناسبت رکھتی ہے کہ اس آیت میں "ولی" کے معنی سرپرست اور حاکم ہیں جب کہ آگے پیچھے کی آیات میں ولی کے معنی "دوست اور مددگار" ہے۔ ولی، سرپرست یا حاکم اپنے پیروکاروں کا دوست اور یاور و مددگار بھی ہوتا ہے بلکہ دوست اور مددگار ہونا ولایتِ مطلقہ کے کوائف اور اوصاف میں سے ہے۔

۷۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ ایسی قیمتی انگوٹھی حضرت علیؑ کہاں سے لائے اور کیا یہ اسراف نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انگوٹھی کی قیمت کا تعین نہ آیت میں ہے نہ کسی روایت میں ہے۔ ایک ضعیف روایت میں اس کی قیمت خراجِ شام کے برابر بتائی گئی ہے جو حقیقت سے زیادہ افسانہ محسوس ہوتی ہے۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے اس آیت سے خود استدلال کیوں نہیں کیا۔ جواب یہ ہے کہ مسند ابی شیخ اور کنز العمال کے مطابق یہ آیت خود حضرت علیؑ سے منقول ہے۔ دوسرے یہ کہ کتاب "الغدیر" میں کتاب سلیم بن قیس ہلالی سے ایک مفصل حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضرت علیؑ نے صفین میں اور اس کے علاوہ شوریٰ کے دن بھی اس آیت سے استدلال فرمایا۔

مریمؑ سے کم بلند نہیں رتبۂ بتولؑ

جناب مریمؑ ان چار برگزیدہ خواتین میں سے ایک ہیں جو جناب رسالت مآبؐ کے ارشادِ مبارک کے مطابق خواتین عالم کی سردار ہیں۔ یعنی جناب مریمؑ، جناب آسیہؑ بنتِ مزاحم، جناب خدیجہؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ دنیا بھر کی خواتین میں سب سے افضل ہیں۔ جناب مریمؑ کی شان میں قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں۔ سورۂ آلِ عمران کی آیات ۳۳ سے ۴۷ میں جناب مریمؑ کے حالات اور فضائل تفصیل سے درج ہیں۔ بہت سی تفاسیر میں جب ان آیات کی تفصیل بیان کی گئی تو احادیث کے حوالے سے جناب فاطمہؑ کا ذکر بھی ہوا ہے اور ارشاداتِ پیغمبرؐ کی رو سے جناب فاطمہؑ کو جناب مریمؑ سے افضل قرار دیا گیا۔

ایک محدود مطالعے کے مطابق ان تفاسیر کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ ''تفسیر ابن کثیر'' حافظ عماد الدین ابو الفدا ابن کثیر۔

۲۔ ''تفسیر در منثور'' جلال الدین سیوطی۔

۳۔ ترجمہ و تفسیر مولانا شیخ محسن علی نجفی۔

۴۔ ''تفسیر القرآن'' مولانا ظفر حسن امروہوی۔

۵۔ ترجمہ و تفسیر مولانا ذیشان حیدر جوادی۔

۶۔ ترجمہ و تفسیر مولانا حافظ سید فرمان علی۔

۷۔ ترجمہ و تفسیر مولانا سید مقبول احمد دہلوی۔

۸۔ ''تفسیر نور'' شیخ محسن قرائتی۔

۹۔ تفسیر "فصل الخطاب" مولانا علی نقی النقوی۔

۱۰۔ ترجمہ وتفسیر مولانا امداد حسین الکاظمی۔

۱۱۔ "خلاصۃ التفاسیر" ڈاکٹر محمد حسن رضوی۔

۱۲۔ "تفسیر نمونہ" آیت اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی۔

بنی اسرائیل میں تو قاذ بن قبیل کی دو بیٹیاں تھیں۔ حنہ اور ایشاع۔ حنہ کا عقد عمران سے ہوا، جن سے جناب مریمؑ پیدا ہوئیں اور ایشاع کا عقد حضرت زکریاؑ سے ہوا، جن سے جناب یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ عمران کے انتقال کے وقت حنہ حاملہ تھیں۔ انہوں نے اپنے فرزند کی خدمت خانۂ خدا کے لئے نذر کرلی۔ اس کے بعد جب فرزند کی بجائے جناب مریمؑ پیدا ہوئیں تو بہت حیران و پریشان ہوئیں کہ نذر کو کس طرح پورا کریں گی۔ بہر حال جناب مریمؑ بیت المقدس کی خدمت پر مامور ہو گئیں۔ ان کی کفالت کا قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام نکلا اور اللہ نے مریمؑ کی کفالت کا ایسا مکمل انتظام کردیا کہ جناب زکریا بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ اس واقعے کا ذکر اللہ نے قرآن میں اس طرح فرمایا ہے:

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۷ کا ترجمہ: پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھی طرح اور نگران بنادیا اس کا زکریاؑ کو، (کہ وہ) جب بھی جاتے مریمؑ کے پاس عبادت گاہ میں تو موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں۔ ایک بار پوچھا، اے مریم! یہ (رزق) تمھارے لئے کہاں سے آتا ہے؟ مریمؑ بولیں: یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی "تفسیر دُرِّ منثور" میں لکھتے ہیں:

امام ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسے حضرت ابن عباسؓ سے یہ

روایت نقل کی ہے۔ نیز امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا کہ حضرت زکریاؑ نے حضرت مریمؑ کو اپنی نگہداشت میں لیا۔ آپ حضرت مریمؑ کے حجرہ میں داخل ہوئے تو وہاں انگور پائے جو ایک ٹوکری میں تھے، جب کہ انگوروں کا کوئی موسم نہ تھا۔ آپ نے کہا، یہ انگور کہاں سے آئے ہیں؟ حضرت مریمؑ نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حساب کے بغیر رزق عطا فرماتا ہے تو اس وقت حضرت زکریاؑ نے کہا کہ وہ ذات جو بغیر موسم کے پھل عطا کرتی ہے وہ مجھے بانجھ بوڑھی عورت سے بچہ بھی دے سکتی ہے۔ وہاں ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور التجاء کی۔ جب آپ کو حضرت یحییٰؑ کی بشارت دی گئی تو اس وقت حضرت زکریا نے عرض کی "اے میرے رب! میرے لئے ایک نشانی بنا دے۔" فرمایا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے کلام نہیں کرے گا تو صحیح سالم ہوگا مگر تیری زبان بول نہ سکے گی۔ (تفسیر طبری جلد ۳ ص ۲۸۶)۔

اس واقعہ میں جناب مریمؑ کا یہ فرمانا کہ "یہ اللہ کی طرف سے ہیں جو بے حساب رزق عطا فرماتا ہے" خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اسی آیت (آیت ۳۷، آل عمران) کی تفسیر میں آگے چل کر فاضل مفسر (علامہ سیوطی) فرماتے ہیں:

"امام ابو یعلی نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک بار حضور اکرمؐ نے چند روز کھانا تناول نہ فرمایا۔ آپؐ اپنی ازواج مطہرات کے پاس تشریف لائے مگر ان کے پاس کوئی چیز نہ پائی۔ پھر آپؐ جناب فاطمہؑ کے پاس آئے۔ پوچھا اے بیٹی! کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے جسے میں کھالوں کیوں کہ میں بھوکا ہوں۔ جناب فاطمہؑ نے عرض کی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ جب حضورؐ جناب فاطمہؑ کے گھر سے باہر تشریف لے آئے تو آپ کی ایک پڑوسن نے دو روٹیاں اور گوشت کا ایک ٹکڑا بھیجا۔ جناب فاطمہؑ نے اس عورت سے

کھانا لے لیا اور اسے برتن میں رکھ لیا۔ پھر فرمایا: میں اس کھانے کے بارے میں اپنے آپ اور گھر والوں پر حضورؐ کو ترجیح دوں گی۔ جب کہ جناب فاطمہؑ کے سب گھر والے سخت بھوکے تھے۔ جناب فاطمہؑ نے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو رسول اللہؐ کی طرف بھیجا۔ حضورؐ واپس تشریف لائے۔ جناب فاطمہؑ نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان، اللہ تعالیٰ نے ایک چیز عطا فرمائی ہے جسے میں نے آپ کے لئے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اے بیٹی وہ پیالہ لے آؤ۔ جناب فاطمہؑ نے پیالہ سے پردہ ہٹایا تو وہ روٹیوں اور گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ جب جناب فاطمہؑ نے یہ دیکھا تو حیران رہ گئیں اور جان گئیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی برکت ہے۔ جناب فاطمہؑ نے اللہ کی حمد وثناء کی اور کھانا حضورؐ کی بارگاہ اقدس میں پیش کیا۔ جب حضورؐ نے اسے دیکھا تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی۔ پھر پوچھا، اے بیٹی! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے؟ عرض کی، اے بابا جان! یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی پھر کہا: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، جس نے تجھے بنی اسرائیل کی عورتوں کی سیدہ (جناب مریمؑ) کی طرح بنایا کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں رزق حسن عطا فرماتا اور ان سے پوچھا جاتا کہ یہ رزق کہاں سے آتا ہے؟ تو وہ کہتیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔

یہ روایت ''تفسیر ابن کثیر'' اور ترجمہ وتفسیر جناب مولانا سید مقبول احمد دہلوی میں بھی کم وبیش اسی طرح موجود ہے۔

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آلِ رسولؐ اپنے ہر ہر کام میں کس قدر قرآنی احکامات کی پیروی کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ مفسرین عظام نے مندرجہ بالا آیات (سورۂ آل عمران کی آیات ۳۳

سے ۴۷) کی تفسیر کرتے ہوئے جناب مریمؑ کی عظمت کے ساتھ ساتھ جناب فاطمہؑ کی عظمت بھی بیان کی ہے۔ خلاصہ کے طور پر مختلف تفاسیر سے اخذ شدہ مواد پیش خدمت ہے۔

ا۔ مولانا شیخ محسن علی نجفی نے (سورۂ آل عمران کی آیت ۳۶ کی تفسیر میں) تحریر فرمایا ہے کہ اللہ نے عمران ابن ماثان کو وحی کی تھی کہ میں تم کو ایک لڑکا عطا کروں گا جو صحیح وسالم جسم والا اور مبارک ہوگا۔ وہ اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھوں کو اچھا کرے گا۔ کوڑھیوں کو تندرست کرے گا اور مردوں کو زندہ کرے گا اور میں اس کو بنی اسرائیل میں رسول بنا کر بھیجوں گا۔ عمران نے یہ سب بات اپنی زوجہ سے کہہ دی۔ حنہ (والدۂ جناب مریمؑ) کو جب حمل ٹھہر گیا تو دونوں نے یہی خیال کیا کہ لڑکا پیدا ہوگا مگر جب لڑکی پیدا ہوئی تو متعجب ہو کر کہنے لگیں کہ لڑکی اور لڑکے میں فرق ہے۔ لڑکی رسول نہیں ہوسکتی۔ اور اللہ نے فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تو نے کیا جنا۔ پھر جب اللہ نے حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ دیے تو عیسیٰؑ وہی نبی ورسول تھے جن کے بارے میں عمران کو خوش خبری دی گئی تھی تاکہ لوگ پہلے ہی سے ان کے آنے کے منتظر رہیں اور ان کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے اور یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ بیٹی کی اولاد اس شخص کی نسل ہی سے شمار ہوگی جس کی بیٹی ہے اور بیٹی کی نسل سے بھی ہادی پیدا ہوسکتا ہے، تاکہ جب حضورؐ کی دختر جناب فاطمہؑ کی اولاد اور نسل میں ہادی پیدا ہوں اور وہ آل محمدؐ ہی کہلائیں تو کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

۲۔ اس ضمن میں مولانا ظفر حسن امروہوی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ (آیت ۳۳، آل عمران): عمران نام ہے حضرت ابوطالب کا۔ ان کی اولاد یعنی ائمہ اثنا عشر کو یہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ان میں ایک نہ ایک فرد ہر زمانہ میں بہ مصداق "وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ"۔ (اور ہم نے ہر قوم کے لئے ہادی بھیجا، سورہ رعد، آیت ۷) ہدایت کے لئے موجود رہے گا۔ آل ابراہیمؑ میں سوائے آل محمدؐ کسی کو یہ فضیلت حاصل ہی نہیں ہے۔ تفسیر اہل بیت میں وارد ہوا

ہے کہ آل عمران سے مراد علی ابن ابی طالبؑ اوران کی اولاد ہیں، کیونکہ عمران ابوطالبؑ کا نام ہے۔ (آیت ۳۷، آل عمران): کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت اسد مادر امیر المومنینؑ کے لئے حضرت علیؑ کی ولادت کے وقت جنت سے کھانا آیا، یا جناب فاطمہ زہراؑ کے لئے ایسا ہوا تو لوگ مانتے نہیں لیکن جناب مریمؑ کے لئے کھانا آنا تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ جناب خاتون جنت کا مرتبہ جناب مریمؑ سے کہیں زیادہ ہے۔ (آیات ۴۲ تا ۴۷ آل عمران): (الف) حضرت مریمؑ کا اصطفاء دوبار ہوا۔ پہلا اس بنا پر ہے کہ اولاد انبیاء میں سے ان کو نساء العالمین کا سردار بنانے کے لئے چنا گیا۔ دوسرا اس لئے کہ ان کو بغیر شوہر بچہ جننے کے لئے چنا گیا۔ یہ فضیلت ایسی ہے کہ دنیا کی کسی عورت کو اس میں شرکت نہیں ہے۔ رہیں اور صفات ان میں دیگر عورتوں کی شرکت بھی ہے مثلاً جناب مریمؑ کے باپ نبی نہ تھے اور جناب فاطمہؑ کے باپ خاتم الانبیاء تھے۔ دوسرے جناب مریمؑ کو شوہر کی طرف سے کوئی فضیلت نہ تھی مگر جناب فاطمہؑ کے شوہر افضل الصدیقین، امیر المومنین اور خلیفۂ خاتم الانبیاءؐ تھے۔ جناب مریمؑ کی نسل سے صرف ایک معصوم آئے اور جناب فاطمہؑ کی نسل سے گیارہ معصومینؑ ہوئے۔ (ب) "طھرک" اولاد جناب اسحٰقؑ میں صرف ایک جناب مریمؑ ایسی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کے رجس سے پاک رکھا تھا یعنی جسمانی نجاستوں کے علاوہ گناہوں کی نجاست سے بھی ان کا تعلق نہ تھا۔ تاہم یہ تاکیدی طہارت نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ یہودیوں نے ازراہ عداوت ان پر معاذ اللہ بدکاری کی جھوٹی تہمت عائد کردی، لیکن جناب فاطمہؑ جس آیت تطہیر کی مصداق ہیں اس میں یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ہے یعنی اہل بیتؑ سے طہارت کاملہ کا تعلق ہے۔ کوئی افترا پردازی بھی اڑ کر ان کی طرف نہیں آسکتی۔ جناب مریمؑ کا یہ واقعہ جناب رسالت مآبؐ کی رسالت کی تصدیق کے لئے کافی ہے، کیونکہ یہ واقعہ ہزار ہا برس پہلے کا ہے۔ نہ تو حضرتؐ

وہاں موجود تھے اور نہ آپؑ نے توریت کو پڑھا، بلکہ ان تمام واقعات کا علم آپؐ کو کیسے ہوتا۔ اس لئے آپؐ کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت تھی تاکہ شک کرنے والے یہ شک نہ کریں کہ فلاں کتاب میں پڑھ لیا ہوگا۔

۳۔ اس سلسلے میں مولانا ذیشان حیدر جوادی فرماتے ہیں: ''جناب سیدہؑ کے بارے میں روایت میں آیا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک دینار قرض لیا اور راستہ میں جناب مقدادؓ کی غربت کو دیکھ کر انہیں دے دیا تو خدا نے طعام جنت سے بھیج دیا۔ جب حضرت علیؑ نے جناب سیدہؑ سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے اور رسول اکرمؐ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ علیؑ کی کیفیت زکریاؑ جیسی اور فاطمہؑ کی حالت مریمؑ جیسی ہے۔ جناب فاطمہؑ کو سیدۃ نساء المومنین اور سیدۃ نساء اہل الجنۃ کہا گیا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ کا قول ہے کہ مریمؑ اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھیں اور فاطمہؑ ہر زمانے کی عورتوں کی سردار ہیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''یہ بات تو مریمؑ کے لئے ہے کہ وہ اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھیں اور فاطمہؑ اولین و آخرین میں سے تمام زمانے کی عورتوں کی سردار ہیں۔''

۴۔ مولانا حافظ سید فرمان علی صاحب رقم طراز ہیں کہ: ''حضرت رسول خداؐ آلِ ابراہیمؑ سے ہیں۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ حضرت ابراہیمؑ کے اہل بیت ہیں۔ اس طرح ثابت ہوا کہ اللہ نے جناب رسالت مآبؐ اور ان کے اہل بیت کو سارے جہان سے افضل بنایا۔ فرشتے ہوں یا جنات، آدمی ہوں یا غیر، حتیٰ کہ پیغمبروں پر بھی فضیلت ثابت ہوگئی۔ تفسیر ثعلبی میں ہے کہ مصحف ابن مسعود میں آلِ عمران کے بعد آلِ محمدؐ بھی تھا۔'' ایک بار جناب رسالت مآبؐ جناب فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے اور پانی مانگا۔ جناب سیدہؑ نے ایک لکڑی کے پیالے میں پانی حاضر کیا۔ آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈبویا اور پانی کو جناب فاطمہؑ کے سر اور سینے پر

چھڑکا اور دعا کی خداوندا میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے فریب سے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔ یہ جناب سیدہؑ کے معصوم ہونے کی کافی دلیل ہے اور اس سے ظاہر ہوا کہ آیت ۳۶ سورۂ آل عمران بظاہر جناب مریمؑ کے واسطے ہے مگر حقیقتاً مریم کبریٰ جناب فاطمہؑ کے واسطے ہے۔"

۵۔ جناب شیخ محسن قرائتی "تفسیر نور" میں، آیت ۳۷، آل عمران کی ذیل میں فرماتے ہیں "اولیائے خدا سے کرامت کا ظاہر ہونا کوئی مشکل کام نہیں۔ (ھو من عند اللہ) تفسیر روح البیان، جلد ۲، ص ۲۹، میں ایک حدیث مرقوم ہے کہ قحط کے دوران میں جناب رسالت مآبؐ نے حضرت فاطمہؑ سے پوچھا کہ یہ سب غذا تمہارے پاس کہاں سے آگئی؟ انہوں نے فرمایا "ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہ" یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ میری بیٹی بھی مریمؑ کی مانند ہے۔"

۶۔ جناب مولانا امداد حسین الکاظمی سورۂ آل عمران کی آیت ۴۲ کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ "علل الشرائع" میں امام جعفر صادقؑ کی تصریح موجود ہے کہ جناب فاطمہؑ کا نام محدثہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ فرشتے آسمان سے نازل ہوتے تھے اور ان کو اسی طرح آواز دے کر بلاتے تھے جس طرح جناب مریمؑ کو۔ جناب فاطمہؑ فرشتوں سے باتیں کرتی تھیں اور فرشتے ان سے۔ ایک رات جناب سیدہؑ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا مریمؑ بنت عمران کو تمام زمانے کی عورتوں پر فضیلت نہیں دی گئی؟

انہوں نے کہا کہ اے سیدہؑ! حضرت مریمؑ تو صرف اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھیں اور آپ کی شان یہ ہے کہ آپ ان کے زمانے کی عورتوں کی اور اس زمانے کی عورتوں کی، بلکہ اولین کی جس قدر گزر چکی ہیں اور آخرین کی جس قدر عورتیں ہوں گی ان سب کی آپ سردار ہیں۔

"تفسیر فصل الخطاب" از علامہ سید علی نقی النقوی اور "تفسیر نمونہ" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی میں سورۂ آل عمران کی ان آیات کی تفسیر جناب فاطمہؑ کے حوالے سے بہت تفصیل سے کی گئی ہے۔ مضمون طویل نہ ہو جائے اس لئے ہم انہیں یہاں نقل نہیں کر رہے۔

حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کی بارگاہِ عصمت پناہ میں جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں مخدومۂ کونین سے کمال درجہ عقیدت تھی۔ کلیات اقبال فارسی کی نظم بعنوان "در معنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمہ الزہراؑ اسوۂ کاملہ ایست برائے نسائے اسلام" کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو سیدۂ کونین کا ایسا عرفان تھا کہ انہوں نے قرآن و احادیث کی روشنی میں اپنے افکار کو نہایت ہی والہانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اقبال کا پہلا شعر ہی ولائے اہل بیت کا آئینہ دار ہے۔ "مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز" کے بعد یہ کہنا کہ "از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز" اقبال جیسے محبِ اہل بیت کی بصیرت ظاہر کرتا ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کو "بانوئے آں تاجدارِ ھل اتیٰ" کہہ کر تفسیر آیۂ قرآنی کی تو حضرت علی مرتضیٰ کے متعلق دوسرے ہی مصرع میں کہا "مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا" اقبال کا تمام کلام پڑھ جایئے، توصیف و مدحت کا یہ معیار اور انداز صرف حضور اکرمؐ، حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ اور ان کی اولاد طاہرینؑ کے لئے ہی ملتا ہے جس سے اقبال کا عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمۃ للعالمینؐ — آں امامِ اولین و آخرین
آں کہ جاں در پیکرِ گیتی دمید — روزگارِ تازہ آئیں آفرید
بانوئے آں تاجدارِ ھل اتیٰ — مرتضیٰ، مشکل کشا، شیرِ خدا

پادشاہ و کلبۂ ایوان او — یک حسام و یک زرہ سامان او
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق — مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمعِ شبستانِ حرم — حافظِ جمعیتِ خیرالامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں — پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں — قوتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؑ — اہلِ حق حریت آموز از حسینؑ
سیرتِ فرزند ہا از امہات — جوہرِ صدق و صفا از امہات
مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ
بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت — با یہودی چادرِ خود را فروخت
نوری و ہم آتشی فرمانبرش — گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او زبالیں بے نیاز — گوہر افشاندے بدامانِ نماز
اشکِ او برچید جبریلؑ از زمیں — ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں
رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست — پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است
ورنہ گردِ تربتش گردیدمے — سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

نظم کیا ہے، ایک عظیم شاعر کا جناب سیدہؑ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت ہے۔ پوری نظم کا ترجمہ اور تشریح طوالت کا باعث ہوگا، لہٰذا ابتدائی چند اشعار کا ترجمہ وتشریح، جس کے لئے جناب پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی کی کتاب ''علامہ اقبالؒ بارگاہِ پنجتن میں'' سے استفادہ کیا گیا ہے اور جو اس مضمون سے مطابقت رکھتا ہے، پیشِ خدمت ہے:

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ بی بی مریمؑ ایک نسبت سے لائق احترام ہیں اور وہ یہ کہ

آپؑ حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر اور صاحبِ کتاب نبی کی والدہ ہیں مگر جناب سیدہؑ کو تین نسبتوں سے عزت و عظمت اور شرف حاصل ہے۔ آپؑ کا پہلا شرف یہ ہے کہ آپؑ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پارۂ جگر ہیں۔ جنابِ رسالت مآبؐ وہ ہستی ہیں جس نے دنیا کے مردہ پیکر میں اپنے پیغام اور اسوۂ حسنہ سے جان ڈال دی اور دنیا کو مہذب بنایا اور نئی معاشرتی فضا تشکیل دی، جس سے یہ زمین جنت فشاں ہوگئی۔ اس طرح جنابِ فاطمہؑ کا یہ شرف ہے قابلِ ذکر ہے کہ آپؑ ان پیغمبرِ اعظمؐ کی دخترِ نیک اختر ہیں جنہوں نے دنیا اور آخرت کے خوشگوار ثمرات سے ہمیں بہرہ ور کیا۔

آپؑ کا دوسرا اعزاز یہ ہے کہ آپؑ تاجدارِ ھل اتیٰ، مشکل کشا حضرت علی مرتضیٰؑ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ وہ جو کی روٹی کھانے والا جو ولایت کا شہنشاہ ہے۔ جس کے پاس شادی کے موقع پر ایک تلوار اور ایک زرہ تھی۔ اس کی بدولت اسلام کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا۔ جس نے فقر میں شاہی کی اور دینِ مبین کی تشریح و تفسیر میں اپنی حیات صرف کی وہ مردِ بے مثل، شوہرِ فاطمہؑ ہوا۔ یہ شرف یقیناً قابلِ ذکر ہے۔

تیسرا اعزاز جو حضرت فاطمہؑ زہرا کو حاصل ہے وہ یہ کہ آپؑ حضرات امام حسنؑ (مرکزِ پرکارِ عشق) اور حضرت امام حسینؑ (کارواں سالارِ عشق) کی والدۂ گرامی ہیں۔ ان دونوں فرزندوں سے ایک یعنی حضرت امام حسنؑ کی ذاتِ عالی صفات ہے۔ اقبالؒ نے انہیں شمعِ شبستانِ حرم کہا ہے اور یہ کہ امام حسنؑ کی ذات کی برکات سے امتِ مسلمہ کا فتنہ ختم ہوگیا۔ آپؑ نے محض دینِ مبین کی ترقی کی خاطر حکومت ترک کر دی اور بحیثیت صلح و امن کے رہبرِ اعظم کی حیثیت سے دو گروہوں کو تصادم سے بچانے میں انتہائی ایثار کا ثبوت فراہم کیا۔ علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر کہا ہے کہ امام حسنؑ نے ملت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیا بلکہ حکومت کو ٹھکرا دیا۔ وہ جانتے تھے کہ جس دین کی آبیاری کے سلسلے میں میرے نانا اور باباؑ نے خود کو وقف کر رکھا

تھااس کی بقااسی میں مضمر تھی کہ آپؑ گوشہ نشین ہو گئے اور لوگ ان کے در دولت پر بدستور فیض حاصل کرنے آتے رہے۔ حکومت کا کیا تھا وہ تو یادگار شہنشاہِ کونینؐ تھے۔

دوسرے فرزندِ فاطمہ زہراؑ یعنی حضرت امام حسینؑ کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ وہ دنیا کے نیک بندوں کے مولا اور سردار تھے، جن سے دنیا میں عزم و حریت کو عروج حاصل ہوا۔ امام حسینؑ نے یزید کے ظلم وجور کو ختم کرنے کے لئے حریت کا درس اس طرح دیا کہ مظلومیت ہر زمانے میں امام عزم و حریت کا نام لے کر باطل قوتوں سے اور جابران وقت سے مقابلہ کرتی رہے گی۔ جناب فاطمہؑ اس ''مولائے ابرارِ جہاں اور امامِ عاشقاں کی والدۂ ماجدہ ہیں، جس کے دم سے زندگی میں صداقت و حریت اور حقانیت کی تڑپ قائم ہے۔ مردان حق آگاہ امامِ حریت حضرت امامِ حسینؑ سے درسِ حریت لیتے رہیں گے۔ بچوں کی سیرت پر ماؤں کی تربیت کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عظیم مائیں صدق و صفا کے جوہر سے اپنے بچوں کو آراستہ کرتی ہیں۔ اقبالؒ نے عظمت جناب فاطمہؑ بیان کرتے ہوئے آپؑ کے کمال تربیت کو بیان کیا ہے کہ امام حسنؑ اور امامِ حسینؑ کی پرورش ان خطوط پر ہوئی جن کی مثال نہیں ملتی۔ ان دونوں شہزادوں کے کردار میں جناب فاطمہ زہراؑ کا عکس ملتا ہے۔

ان اشعار اور ان کے مفاہیم سے یہ صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ کو حضرت خاتون جنتؑ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ حضرت مریمؑ کے مقابلے میں حضرت فاطمہ زہراؑ کو تین نسبتوں سے معزز سمجھتے تھے اور یہ تلقین کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی خواتین اگر اسوۂ جناب فاطمہ زہراؑ پر عمل کریں تو ملت بیضا کی قسمت ہی بدل جائے اور ایک روشن انقلاب پیدا ہو جائے۔

سردارِ جوانانِ جنت حضرت امامِ حسنؑ

لوحِ جبینِ عظمتِ آدمؑ پہ حشر تک
نامِ حسینؑ ثبت ہے لیکن حسنؑ کے بعد مرحوم محسن نقوی

جناب محمد اظہار الحق (فرزند حافظ محمد ظہور الحق ظہور) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"آخر کیا وجہ ہے کہ انسان کو جتنی محبت اور تشویش اپنی اولاد کے لئے ہوتی ہے اتنی ماں باپ کے لئے نہیں ہوتی؟

محبت اور ذمہ داری کا یہ بہاؤ آگے کی طرف کیوں ہے؟ پیچھے کی طرف کیوں نہیں؟"

داداجان نے اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ آدمؑ کے ماں باپ نہیں تھے، صرف اولاد تھی، وہ پلٹ کر دیکھتے بھی تو کیسے؟ ان کا رجحان اور شوق کا بہاؤ آگے کی طرف ہوتا تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ والدین کی اپنی اولاد کے لئے بے غرضی، وابستگی، ایثار اور بے لوث محبت یہ سب کچھ عاشقانہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اولاد کا رویہ ماں باپ کے ساتھ معشوقانہ ہوتا ہے، جس میں تعلق تو ہوتا ہے اور محبت بھی ہوتی ہے مگر کچھ کچھ تغافل، کچھ کچھ بے رخی بھی ہوتی ہے۔"

یہ اقتباس لکھنے کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ انسان کو جتنی محبت اور انسیت اپنی اولاد سے ہوتی ہے کسی اور سے نہیں۔ خاص کر پہلی اولاد سے یا پھر سب سے چھوٹی اولاد سے۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ اولاد سے زیادہ اولاد کی اولاد سے محبت ہو جاتی ہے۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ افضل البشرؐ، اشرف الانبیاءؐ، سرورِ کونین کو اپنی چہیتی اور اکلوتی بیٹی سے جو خود بھی سیدۃ النساء العالمینؑ ہیں کتنی محبت ہو گی؟ پھر ۱۵ ر رمضان المبارک سن ۲

ہجری میں گلشن علیؓ وزہراؑ میں پہلا پھول کھلنے یعنی حضرت امام حسنؑ کی ولادت پر آپ کو کتنی مسرت ہوئی ہوگی اور خانوادۂ رسالت میں کیسی بہار آئی ہوگی۔

ابھی حضرت امام حسنؑ ایک سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اللہ نے ان کا اکیلا پن دور کرنے کے لئے حضرت امام حسینؑ کو بھیج دیا۔ اب یہ دونوں بچے ماں باپ اور نانا کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ دونوں یکساں نور و جمال کا پیکر بلکہ قرآن کی زبان میں لولوء و مرجان تھے (سورۂ رحمٰن آیت ۲۲۔ ترجمہ: ان دونوں (سمندروں) میں سے لولو و مرجان نکلتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے یہاں لولو و مرجان سے حضرات حسنین علیہم السلام مراد لئے ہیں)۔ ان کی باتیں گھر بھر کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ ماں باپ تو واری صدقہ تھے ہی، نانا بھی دل و جان سے قربان ہوئے جاتے تھے۔ ہر وقت انہیں آنکھوں کے سامنے رکھنا، ان سے باتیں کرنا، ان کی معصومانہ باتیں سننا، ان کی تربیت کا سامان کرنا ان کی عین خوشی تھی۔ حضورؐ شروع سے یعنی ان کی پیدائش سے پہلے بھی بچوں کو بہت پسند کرتے تھے، پھر یہ تو تھے اپنے جگر گوشے۔ ایک بار عید کے موقع پر جب بچوں نے اپنے لباس کے لئے پوچھا تو ماں نے بتایا تمہارے لباس درزی کے پاس ہیں۔ اللہ نے ماں کی تسلی کو اتنا پسند کیا کہ رضوانِ جنت درزی بن کر دروازے پر دونوں شہزادوں کے لباس لے کر حاضر ہو گئے۔

ان دونوں سے نبی کریم کی محبت و شفقت کے معاملے میں ہر روایت میں دونوں شاہزادے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں چاہے وہ عید گاہ جاتے ہوئے آپؐ کے کاندھوں کی سواری ہو یا آپ کی زلفوں کو باگ بنا لینے کی بات ہو۔ حضورؐ نے دونوں کے لئے فرمایا کہ یہ دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ مسجد نبویؐ میں دورانِ خطبہ دونوں میں سے کوئی بھی پہنچ جاتا تو آپ خطبہ روک کر انہیں گود میں اٹھا لیتے اور کہتے "یہ میرا ٹکڑا ہے، جو اس کا دوست وہ میرا دوست، جو اس کا دشمن وہ میرا دشمن ہے۔" دونوں اگر ساتھ آتے تو دونوں کو سینے سے لگا

لیتے۔ ایک کا دہن تو دوسرے کی گردن چومتے۔ یہ فطری محبت نانا ہونے کے حوالے سے تو تھی ہی، دوسری طرف پیش بیں نظریں مستقبل کو دیکھ رہی تھیں کہ یہ دونوں فرزند اپنی جانوں پر کھیل کر ان کے پیغام کی، ان کی جدوجہد کی، ان کی قربانیوں کی حفاظت کرنے والے اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے والے ہیں۔ جب ایک کے بعد ایک حضورؐ کے بیٹے وفات پاتے رہے تو دشمنوں نے آپ کو ابتر یعنی مقطوع النسل ہونے کا طعنہ دیا، جس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ جناب فاطمہؑ مصداق کوثر قرار پائیں اور جناب امام حسنؑ اور امام حسینؑ حضورؐ کی نسل کو آگے بڑھانے والے بنے۔ آج دنیا میں سادات ان ہی کی نسلِ مبارک ہیں۔

آیۂ تطہیر جب نازل ہونے والی تھی اور حضورؐ نے ردائے مبارک اوڑھ رکھی تھی تو یہ جناب حسنؑ ہی تھے جو حضورؐ کے بعد اس چادر میں داخل ہونے والے سب سے پہلے فرد تھے۔ حضرت امام حسینؑ، مولائے کائنات اور شہزادی فاطمہؑ چادر میں بعد میں داخل ہوئے۔ سب کے جمع ہو جانے پر حضور نے دعا فرمائی "اے اللہ یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔۔۔ تو اپنی خاص رحمتیں، برکتیں، بخششیں اور خوشنودیاں میرے اور ان کے لئے قرار دے۔ ان سے نجاست کو دور رکھ اور انہیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھ کہ جو پاک رکھنے کا حق ہے۔" اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی دعا کو من و عن قرآنی آیت میں ڈھال دیا اور قیامت تک اسے محفوظ فرما دیا۔ اس آیۂ تطہیر یعنی آیت ۳۳ سورۂ احزاب (ترجمہ: اے اہلِ بیتؑ، اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ (ہر طرح کی) نجاست اور گناہ کو تم سے دور رکھے ہر طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے، جس طرح پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے) کی سند سے حضرت امام حسنؑ اور چہاردہ معصومینؑ معصومؑ قرار پائے۔

مباہلہ میں جب نجران کے عیسائیوں کے مقابل حضورؐ تشریف لے جاتے ہیں تو شان یہ ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی انگلی تھامے ہوئے اور جناب امام حسینؑ کو گود میں لئے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ ان نورانی صورتوں کو دیکھ کر بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ فوراً مباہلے سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

آیۂ مودت (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۳) کے نزول پر جب اللہ کا یہ ارشاد سامنے آیا کہ اے رسول کہہ دیجئے میں کوئی اجر رسالت طلب نہیں کرتا سوائے اس کے کہ میرے اقربا کی مودت اختیار کرو، تو لوگوں نے پوچھا کہ "قربیٰ" سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا بلاشبہ "قربیٰ" سے مراد علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ اور ان کی معصوم ذریت ہے۔ (یہ روایت تفسیر ابن کثیر اور تفسیر دُرّ منثور میں آیۂ مودت کی تفسیر میں موجود ہے)۔

ایک بار جب شہزادیؑ نے باباؐ کے کہنے پر جناب حسنینؑ کی صحت یابی کے لئے نذر کے روزے رکھے تو حضرت علیؑ اور جناب فضہؓ نے بھی روزے رکھ لئے۔ دونوں شہزادے بھی گھر والوں کے ساتھ روزہ داری میں شریک ہوگئے۔ اب ان بچوں کی بزرگی دیکھئے، سائل کے سوال پر جب بڑوں نے اپنی روٹیاں اٹھا کر سائل کو دینا چاہیں تو یہ بچے بھی پیچھے نہ رہے اور اپنی اپنی روٹیاں اٹھا کر راہ خدا میں دے دیں۔ یہ سلسلہ تین دن جاری رہا۔ اللہ نے اس ایثار کو دیکھ کر ان کی شان میں ۳۱ آیات پر مشتمل سورہ "ھل اتیٰ" نازل فرمایا۔ اللہ اللہ! یہ بچے کتنے "بڑے" تھے۔ جن لوگوں سے ان حضرات کا موازنہ کیا جاتا ہے، کیا ان کے بچپن کے واقعات میں ایسی کوئی مثال ہے؟

آیۂ درود (سورۂ احزاب آیت ۵۶) کے نزول پر جب حضورؐ سے پوچھا گیا کہ "آل" سے کیا مراد ہے تو حضورؐ نے ان ہی ہستیوں یعنی علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ اور ان کی ذریت پاک کے نام لئے۔

کتنی ہی تفاسیر میں سورۂ بقرہ کی آیت ۳۷ (اس کے بعد آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھ لئے تو اس نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ کلمات سے مراد اللہ کی بہترین مخلوق کے ناموں کی تعلیم تھی، یعنی محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ۔ اور آدمؑ نے ان کلمات کے وسیلے سے درگاہ الٰہی سے بخشش طلب کی اور اللہ نے انہیں بخش دیا۔ سورۂ بقرہ ہی کی آیت ۱۲۴ (اور وہ وقت

یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ کے رب نے اس کا امتحان لیا چند کلمات سے تو اس نے انہیں پورا کر دیا، تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں سب انسانوں کا امام بنانے والا ہوں)۔اس آیت میں کلمات سے مراد اسمائے پنجتن پاکؑ یعنی محمدؐ،علیؑ، فاطمہؑ،حسنؑ اور حسینؑ ہی ہیں۔شیخ صدوقؒ کی کتاب ''خصال'' صفحہ ۳۱۷ پر مذکور ہے کہ جنت کے دروازے پر چھ کلمات سونے کے پانی سے لکھے ہوئے ہیں۔ان کلمات میں پنجتن پاکؑ کے نام بھی ہیں۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں راقم کی تالیف ''قرآن اور شہزادی فاطمہؑ'' باب ۸۔اسمائے پنجتن)۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۴ (جو خوش حالی اور کٹھن وقت میں بھی (خدا کی راہ پر) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کی خطا سے درگزر کرتے ہیں۔اور نیکی کرنے والوں سے اللہ الفت رکھتا ہے) کی تفسیر میں مولانا حافظ سید فرمان علی نے حضرت امام حسنؑ سے متعلق روایت نقل کی ہے۔ایک مرتبہ آپؑ اشراف عرب کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔اسی اثناء میں آپ کا ایک غلام سالن کا پیالہ لئے ہوئے آیا اور آپ کے رعب سے اس کا پاؤں تھرتھرایا، حتیٰ کہ وہ لب فرش گر پڑا اور پیالہ معہ سالن آپ کے چہرہ اور سر پر گرا۔حضرت نے اس کی طرف دیکھا وہ متحیر ہو کر رہ گیا اور دفعتاً اس کی زبان ''والکاظمین الغیظ'' جاری ہوا۔آپ نے فرمایا میں نے اپنا غصہ دور کر دیا۔اس نے فوراً ''والعافین عن الناس'' کی تلاوت کی، آپ نے فرمایا ''میں نے معاف کیا''۔اس نے عرض کی ''واللہ یحب المحسنین''۔آپ نے فرمایا میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کیا۔

تفسیر دُرِّ منثور مترجم اردو جلد ۲ ص ۵۱۔سورۂ آل عمران۔آیت ۳۳۔(ترجمہ: بے شک اللہ نے چن لیا آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہاں والوں پر۔یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے) کی تفسیر میں مرقوم ہے:

''امام ابن سعد اور ابن ابی حاتم نے حضرت جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے دادا سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ شیر خدا نے حضرت امام حسنؓ سے فرمایا، اٹھو لوگوں کو خطبہ دو۔ حضرت حسنؓ نے عرض کی میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ خطبہ دوں اور آپ میرے سامنے ہوں۔ حضرت علیؓ شیر خدا ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ حضرت حسنؓ کی گفتگو سن رہے تھے مگر حضرت حسنؓ کو نظر نہیں آتے تھے۔ حضرت حسنؓ اٹھے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی گفتگو کی، پھر نیچے اترے تو حضرت علیؓ شیر خدا نے انہیں الفاظ کو پڑھا: ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ط وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ''O

چند قرآنی آیات، جن میں فضائل حضرت امام حسنؓ صراحت سے موجود ہیں کی نشاندہی کے بعد دل چاہتا ہے، کچھ اور کتابوں سے حضرت امام حسنؓ کے جواہر فضائل چننے کی سعادت حاصل کروں۔

(الف) سب سے پہلے علامہ سید عقیل الغروی کی کتاب ''چراغ راہ''۔ (صفحہ ۲۶۸ سے ۲۷۰)

'': حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تقریباً آٹھ برس اپنے جد بزرگوار حضرت سرور کونین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش رحمت و نور میں تربیت پائی۔ آپ کے بارے میں آنحضرتؐ کے ارشادات اور واقعات لطف و شفقت حدیث و سیرت کی کتابوں میں مندرج ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ حدیث نبویؐ بہت مشہور ہے:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے کہ اللہ اس کے وسیلہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔'' (بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الفتن)

یہ حدیث جس قدر مشہور ہے اسی قدر اس کے راویوں اور اس کے متن کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ درحقیقت آنحضرتؐ کے اصل الفاظ کیا تھے؟!

بعض معتبر محدثین نے صرف یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عن قریب اللہ اس کے ذریعہ سے صلح وسازگاری فرمائے گا۔"

آنحضرتؐ کے بعد امام حسنؑ اپنے پدر بزرگوار حضرت امیر المومنینؑ کے ساتھ مہمات دین میں منہمک رہے۔ لوگوں کو قرآن مجید اور سیرت نبویؐ کی تعلیم دینا، تزکیہ نفس کے لیے کوشاں رہنا، معارف دین اور حکمت الٰہیہ کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ فرمانا اور اپنی ایک ایک سانس کو توحید حقہ کے اثبات کے لیے وقف رکھنا آپؑ کا اور تمام ائمہ اہلبیت کا شیوۂ زندگی تھا۔

امام حسنؑ نے حضرت ختمی مرتبتؐ سے کتنی حدیثیں سنی ہوں گی اور نقل فرمائی ہوں گی؟ اسی طرح اخلاق وسیرت نبویؐ کے کتنے واقعات اور نکات آپ نے لوگوں کو تعلیم فرمائے ہوں گے؟ اس کا کوئی احصا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خاص آپؑ کے حوالے سے صرف چند ہی حدیثیں جمہور مسلمین کی کتب حدیث میں درج کی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک روایت یہ ہے:

امام حسنؑ نے فرمایا کہ میں نے اپنے نانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

اے مسلمان! مجھے تین باتوں کی ضمانت دے دے، میں تیرے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔ اگر تو اللہ نے جو کچھ قرآن میں فرض کیا ہے اس پر عمل کرے تو سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہوگا، اور اگر اللہ نے جو کچھ قرآن میں حرام قرار دیا ہے اس سے بچے تو سب سے زیادہ پرہیزگار ہوگا، اور اگر اللہ نے جو کچھ رزق تجھے عطا کر دیا ہے اس پر قناعت کرے تو تو سب سے زیادہ غنی ہوگا۔"

(ب) جناب رسول جعفریان کی کتاب "ائمہ اہل بیت علیہم السلام۔ فکری و سیاسی زندگی" (صفحہ ۱۶۸ سے ۱۶۹):

"۔۔۔۔ رسول اللہؐ نے متعدد کلمات میں اپنے فرزند امام حسنؑ کے ساتھ اپنی بے پناہ محبت کا ذکر کیا ہے، دوسروں سے بھی کہا ہے کہ وہ ان سے محبت کریں:۔

ا۔ بارالہا! میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو کوئی ان سے محبت کرتا ہے اس سے بھی محبت فرما۔

۲۔ جو کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ ان سے بھی محبت کرے۔

۳۔ جس نے حسنؑ اور حسینؑ سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے عداوت کی۔

۴۔ جو کوئی اہلِ جنت کے سردار کو دیکھ کر مسرور ہونا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ حسنؑ ابن علیؑ کو دیکھے۔

(ج) پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی کی کتاب "علامہ اقبالؒ بارگاہِ پنجتنؑ میں" (صفحہ ۷۱ سے ۷۲):

علامہ اقبالؒ کی مشہور نظم بعنوان "در معنی ایں کہ سیدہ النساء فاطمۃ الزہرا اسوہ کاملہ ایست برائے نسائے اسلام" کا ایک شعر ہے:

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم　　حافظِ جمعیت خیر الامم

اس شعر کی تشریح میں جناب نعیم تقوی فرماتے ہیں:

ان میں (دونوں فرزندان فاطمۃ زہرا) سے ایک یعنی حضرت امام حسنؑ علیہ السلام کی ذات عالی صفات ہے۔ اقبالؒ نے انہیں شمعِ شبستانِ حرم کہا ہے اور یہ کہ امام حسنؑ کی ذات کی برکات سے امت مسلمہ کا فتنہ ختم ہو گیا۔ آپ نے محض دین مبین کی ترقی کی خاطر حکومت ترک کر دی اور بحیثیت صلح و امن کے رہبر اعظم کی حیثیت سے دو گروہوں کو تصادم سے بچانے میں انتہائی ایثار کا ثبوت فراہم کیا۔ علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر کہا ہے کہ امام حسنؑ نے ملت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیا بلکہ حکومت کو ٹھکرا دیا وہ جانتے تھے کہ جس دین کی آبیاری میں میرے نانا اور بابا نے خود کو وقف کر رکھا تھا اس کی بقا اسی میں مضمر تھی کہ آپؑ گوشہ نشین ہو گئے اور لوگ ان کے در دولت پر بدستور فیض حاصل کرنے آتے رہے۔ حکومت کا کیا تھا وہ تو یادگار شہنشاہِ کونینؐ تھے۔

''شعبان کی تیسری کو چمکا مہ امامت''

کون سی دولت ہے تیری گود میں اے فاطمہؑ
مصطفیٰؐ کو دیکھتا ہوں ہاتھ پھیلائے ہوئے

شعبان کی تیسری تاریخ وہ متبرک اور مقدس رات ہے۔ جس میں تیسرا ماہِ امامت طلوع ہوا۔ خانۂ علیؑ و فاطمہؑ میں یہ بہار کا دوسرا جھونکا تھا۔

جناب زہرا سلام اللہ علیہا اور مولائے کائنات کی شادی خانہ آبادی مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد ہوئی تھی۔ جناب زہرا علیہا السلام کے دونوں پھول حسنؑ اور حسینؑ کی ایک سال کے اندر ہی کھلے تھے۔ بمشکل دونوں میں سال بھر کا فرق تھا۔ رمضان دو ہجری میں جناب امام حسنؑ اور شعبان تین ہجری میں جناب امام حسینؑ دنیا میں تشریف لائے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ویسے ہی بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ قدر مشترک 'معصوم' ہونا ہو۔ یہاں تو معاملہ اپنے جگر گوشہ کے جگر گوشوں کا تھا۔ پھر ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی اپنی اولاد نرینہ زندہ نہ رہ سکی تھی۔ جناب فاطمہؑ پیدائش سے ہی ان کی نور نظر تھیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ باپ بیٹیوں سے ماں کی بہ نسبت زیادہ انسیت رکھتے ہیں اور اولاد کے مقابلے میں اولاد کی اولاد سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ کسی عام انسان کا نہیں تھا۔ نہ باپ کوئی عام آدمی تھا، نہ بیٹی عام بیٹی تھی اور نہ ہی اس کی اولاد عام اولاد تھی۔ انسانیت کی تاریخ میں بیٹی سے ایسی محبت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ اس بیٹی کو دیکھ کر ان کی پیش بین نظریں دیکھ رہی تھیں کہ ان کی عمر بھر کی مشقت کو بچانے والا اور ان کے عظیم مشن کو آگے بڑھانے والا اس بیٹی کی اولاد کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا۔ آپ کا معمول تھا کہ صبح اپنے گھر سے

ڈن کر سیدھے بیٹی کے پاس جاتے، بچوں کی خیریت معلوم کرتے پھر مسجد جاتے۔ دن بھر کی مشقتوں کے بعد واپسی میں پھر بیٹی کے گھر جاتے۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے، پھر گھر جاتے۔ یہی حال اس وقت ہوتا جب آپؐ مدینہ سے باہر جاتے تو سب سے آخر میں بچوں کو دیکھ کر جاتے اور جب واپس آتے تو سب سے پہلے ان کے پاس آتے۔

روایتوں میں اس بچے کی ولادت پر گھر میں خوشی اور غمی دونوں تاثرات کا اظہار ملتا ہے۔ حسینؑ ابھی شکم مادر ہی میں تھے کہ ماں کو محسوس ہوا کہ یہ بچہ ماں سے باتیں کرتا ہے۔ آپؑ نے حضورؐ سے کہا، بابا! یہ بچہ عام بچوں سے مختلف لگتا ہے۔ یہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ لیکن اس کی باتوں سے میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ کبھی یہ کہتا ہے "اماں! میں پیاسا ہوں" کبھی کہتا ہے "اماں میں عریاں ہوں"۔ حضورؐ جناب سیدہؑ کو تسلی دیتے، ہاں بیٹا! میں جانتا ہوں۔ یہ کوئی عام بچہ نہیں۔ یہ بہت عظیم ہے۔ اللہ اس سے بہت اہم کام لینے والا ہے۔ یہ ہماری تمہاری نہ صرف نسل کا ضامن ہے بلکہ میرے مشن کو آگے بڑھانے والا اور اپنے خون سے اس دین کی حفاظت کرنے والا ہے جسے پہنچانے کی ذمہ داری اللہ نے مجھے دی تھی اور اس کی حفاظت اور آگے بڑھانے کی اسے۔ یہ ایک دن بھوکا اور پیاسا شہید کیا جائے گا اور اس کی میت بے گور و کفن پڑی رہے گی۔" جناب سیدہؑ ان باتوں کو سنتی اور آئندہ کے حالات سوچ سوچ کر پریشان رہا کرتیں۔ (اس سلسلے میں سورۂ احقاف کی آیت کا حوالہ اور اس کا انطباق ہم نے تفصیل سے اپنے مضامین "ام المصائب" اور "صدمات جو بنا دیں دنوں کو سیاہ رات" میں کر دیا ہے)۔ شہزادی کونینؑ پیدائش کے بعد اس بچے کا خاص خیال رکھتیں۔ کبھی پیاسا نہ رہنے دیتیں۔ حسینؑ کو بچپن ہی سے پیاس بہت لگتی تھی۔ مرزا دبیرؔ کے ایک مرثیہ کے بند سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ جس میں جناب ام سلمہؑ اور جناب صغراؑ کربلا والوں کو یاد کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

گرمی سے کنویں خشک ہوئے جاتے ہیں جانی
پوچھے کوئی پردیسیوں سے تشنہ دہانی

وہ بولی یہ کہتے ہوئے میں ڈرتی ہوں نانی
سوکھا نہ ہو دریا کا کہیں راہ میں پانی
فاقے کی جو پوچھو تو یہ ارشہ دیں ہے
بابا کو مرے پیاس کی برداشت نہیں ہے

غرضیکہ دن گزرتے رہے۔ ذرا بڑے ہونے کے بعد یہ بچے مسجد جانے لگے۔ وہاں حضورؐ کی باتیں سنتے اور واپس آکر ماں کو سناتے۔ ماں، باپ کی باتیں ان کی توتلی زبان سے سنتی تو نہال ہو ہو جاتی۔ ایک بار حضورؐ مسجد میں خطبہ میں مصروف تھے، دیکھا کہ حسینؑ تیز قدم منبر کی طرف آرہے ہیں۔ اچانک آپ کو ٹھوکر لگی اور قریب تھا کہ زمین پر گر جاتے، حضورؐ خطبہ روک کر منبر سے اترے، انہیں گود میں لیا اور واپس منبر پر پہنچ کر فرمایا، دیکھو یہ حسینؑ ہے۔ یہ مجھ سے اور میں اس سے ہوں۔ جو اس کا دوست وہ میرا دوست اور جو اس کا دشمن میرا دشمن ہے۔ اس کے بعد خطبہ جاری رکھا۔

ایک دن دونوں بچوں نے تختیاں لکھیں اور نانا سے پوچھا بتایئے کس کی تحریر زیادہ اچھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، جاؤ اپنے بابا سے پوچھو۔ بچے باپ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا، اپنی ماں سے پوچھو، وہ زیادہ صحیح بتائیں گی۔ جب معاملہ ماں کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے دونوں کا دل رکھنے کی کوشش کی۔ فرمایا: دونوں کی لکھائی اچھی ہے۔ بچوں نے ضد کی، نہیں یہ بتایئے کس کی زیادہ اچھی ہے۔ اب ماں کس کا دل رکھے اور کس کا توڑے۔ جلدی سے گلے کا ہار توڑ کر موتی زمین پر بکھیر دیئے۔ بولیں: جو زیادہ موتی چن لے، اس کی لکھائی اچھی ہے۔ اب بچے جلدی جلدی موتی چننے لگے۔ دونوں نے برابر تعداد چن لی تو دیکھا ایک موتی بچ رہا ہے۔ دونوں کے ہاتھ بہ یک وقت بڑھے۔ قدرت نے موتی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ دونوں نے آدھا آدھا اٹھا لیا۔ فیصلہ برابری پر ختم ہوا۔

حسینؑ چھوٹے ہی تھے کہ ایک دن مسجد میں اس وقت پہنچے جب اللہ کے رسولؐ

امامت فرما رہے تھے اور حالتِ سجدہ میں تھے۔ آپؑ نانا کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ مشفق عالمؐ نے بچے کی دل شکنی منظور نہ کی اور سجدہ کو اتنا طول دیا کہ ستر بار سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ کہا۔ جب حسینؑ خود پشت سے اتر گئے تو آپؐ نے سجدے سے سر اٹھایا۔

ایک بار کسی نے رسول اللہؐ کو ایک ہرنی کا بچہ تحفہ میں دیا۔ اتنے میں حسنؑ آ گئے، حضورؐ نے وہ ہرن کا بچہ انہیں دے دیا۔ فوراً ہی حسینؑ پہنچ گئے اور کہا مجھے بھی ایسا ہی ہرن چاہئے۔ حسینؑ آب دیدہ ہو گئے۔ ایسے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہرنی بچہ لئے چلی آتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا دیکھو حسینؑ اللہ نے تمہارے لئے بھی ایک بچہ بھیج دیا ہے۔

ایک دن دونوں بھائیوں نے دیکھا ایک بزرگ صحابی مسجد میں غلط وضو کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا ہم چھوٹے ہیں اگر کچھ کہیں گے تو ان کی عزت نفس مجروح ہو گی۔ فوراً نزدیک جا کر کہنے لگے "ذرا دیکھئے، ہمارے وضو کرنے میں کوئی غلطی تو نہیں۔" جب بچوں کو وضو کرتے دیکھا تو بزرگ کو احساس ہوا کہ وہ غلط وضو کر رہے تھے۔ فوراً اپنی اصلاح فرمائی اور ان کی اصلاح کار کے معترف ہو گئے۔

ایک بار عید کی شب تھی۔ بچے ماں سے بولے، سب بچوں کے عید کے نئے کپڑے بنے ہیں، ہمارے کپڑے کہاں ہیں؟ ماں کیا کہتی۔ ایک آہ بھر کر بولی، تمہارے کپڑے درزی کے پاس ہیں، تیار کر کے لاتا ہی ہو گا۔ مشیت نے فاطمہؑ کی بات کی لاج رکھ لی۔ ذرا دیر میں رضوان جنت، درزی کے روپ میں نئے لباس لئے حاضر تھا۔

عید کے دن بچوں نے دوسرے بچوں کو سواریوں پر عیدگاہ جاتے دیکھ کر کہا "نانا جان، ہماری سواری کہاں ہے"۔ ناناؐ نے جلدی سے دونوں کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا "لو یہ ہے تمہاری سواری۔" اب بچے کہتے ہیں "ان کی سواریوں کی تو نکیل ہے، ہماری سواری کی نکیل کہاں ہے؟"۔ ناناؐ نے اپنی زلفیں ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں تھما کر کہا "لو یہ رہی تمہاری سواری کی نکیل۔" پھر بچے فرمائش کرتے ہیں" ناناؐ سب بچوں کے اونٹ تو بولتے

ہیں"۔ آپؐ نے جھٹ عف عف کہہ کے اونٹ کی آواز نکالی۔ بچے خوشی سے سرشار ہو گئے۔ بار بار جھک کر ںانا کو چومتے۔ نانا ان سے زیادہ خوشی سے سرشار۔ مگر ان کی نگاہ میں ان بچوں کو پیش آنے والے امتحانات تھے۔ بار بار سوچ کر آنکھیں بھیگ جاتیں۔

ایک بار حسنین بیمار پڑ گئے۔ نانا عیادت کے لئے آئے۔ بیٹی کو مشورہ دیا۔ ان کی صحتیابی کے لئے کوئی منت مان لو۔ سیدہ نے جلدی سے تین روزوں کی منت مان لی۔ بچے جیسے ہی صحت یاب ہوئے، آپؑ نے روزے کا ارادہ کیا۔ روزے کا ذکر سن کر علیؑ نے کہا ہم بھی روزے رکھیں گے۔ بچوں نے کہا ہم بھی۔ گھر کی کنیز فضہؓ نے کہا ہم بھی روزے رکھیں گے۔ سب پہلا روزہ افطار کرنے بیٹھے تو دروازے پر سائل نے صدا دی "ہے کوئی یتیم کو روٹی کھلانے والا"۔ سیدہ نے جلدی سے اپنے سامنے کی روٹی اٹھا کر سائل کو دے دی۔ علیؑ، فضہؓ اور بچوں نے بھی اپنی اپنی روٹیاں اٹھا کر سائل کو دے دیں۔ پانی پی کر افطار کر لیا گیا اور دوسرے دن کا روزہ رکھ لیا۔ دوسرے دن بھی عین افطار کے وقت سائل نے صدا لگائی "ہے کوئی مسکین کو کھانا کھلانے والا۔" سخی گھرانہ کب کسی کا سوال ٹال سکتا تھا۔ سب نے جلدی جلدی اپنی اپنی روٹیاں اٹھا کر مسکین کے حوالے کر دیں۔ تیسرے دن بھی سخاوت کا ایسا ہی مظاہرہ ہوا۔ آج کوئی اسیر دروازے پر روٹی کا سوالی تھا۔ سب نے پھر وہی فیاضی کی اور سائل کو سیر کر دیا۔ اللہ کی رحمانیت جوش میں آئی اور اکتیس آیتوں کا سورہ "الدھر" اہل بیت اطہار کی شان میں نازل فرما دیا۔

ایک دن حضورؐ متفکر بیٹی کے گھر میں داخل ہوئے۔ بات یہ تھی نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ آیا ہوا تھا اور کئی روز سے مسجد میں مباحثہ میں مصروف تھا کہ اللہ کا حکم آیا کہ اے رسولؐ اگر یہ دلائل نہیں مانتے تو ان سے کہہ دیجئے کہ کل اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفسوں کو لے کر میدان میں آجائیں اور ایک دوسرے کے لئے بددعا کریں۔ اللہ جھوٹوں پر لعنت کرتا ہے۔ حضورؐ منصوبہ بنا رہے تھے کہ کس کس کو مباہلے میں لے کر جائیں۔ بیٹی کے گھر پہنچ کر

آپؐ نے ایک چادر طلب کی اور اوڑھ کر لیٹ گئے۔ ذرا دیر میں حسنؑ تشریف لے آئے اور اجازت لے کر چادر میں داخل ہو گئے۔ فوراً ہی حسینؑ آ گئے اور چادر میں داخل ہو گئے۔ اتنے میں علیؑ پہنچ گئے اور اجازت لے کر چادر میں آ گئے۔ اب جناب فاطمہؑ بھی قریب آئیں اور شاملِ کساء ہو گئیں۔ چاروں نے حضورؐ کا مسئلہ حل کر دیا۔ ہادی برحقؐ نے اللہ سے عرض کی اے اللہ یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔ اللہ نے اپنے محبوب کی بات سن لی اور فرمایا اے اہلِ بیت نبوت میں نے ارادہ کر رکھا ہے کہ تم سے ہر قسم کی آلودگی دور رہے۔ تم تو میرے چنے ہوئے لوگ ہو۔ یہ کائنات اور اس کی ہر چیز میں نے تمہارے لئے ہی خلق کی ہے۔ اب صورت حال یہ ہوئی کی حضورؐ میدان مباہلہ میں تشریف لائے تو بیٹوں کی جگہ حسنؑ کی انگلی تھامے ہوئے، حسینؑ کو گود میں اٹھائے ہوئے، بیٹی کو اپنے پیچھے لئے ہوئے اور سب سے پیچھے اپنے نفس (علیؑ) کو لے کر نصرانیوں کے مقابل پہنچ گئے اور ان سب سے گویا ہوئے جب میں بددعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ ابھی آپؐ کے لبوں کو جنبش بھی نہیں ہوئی تھی کہ عیسائیوں کا سردار کہہ اٹھا۔ ہم وہ چہرے دیکھ رہے ہیں جو اگر پہاڑ کو اشارہ کر دیں تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں، خدارا آپ لوگ بددعا نہ فرمائیں ہم اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔

ایک دن جناب سیدہؑ عصر کی نماز سے فارغ ہوئیں تو حسینؑ کے رونے کی آواز سنائی دی۔ پوچھا ”کیا ہوا بیٹا!“

”امی! ہمیں نانا جان سے شکایت ہے“

”یا اللہ! نانا جانؐ سے کیا شکایت ہوگئی“

”آج نانا جان نے بھائی حسنؑ کا منہ چوما اور ہمارا منہ نہیں چوما۔ ہمارے صرف گلے کو چوما۔“

سیدہؑ پریشان ہو گئیں۔ سر پر ردا ڈالی اور مسجد کی طرف روانہ ہو گئیں۔ حضورؐ مسجد میں اصحابؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ بیٹی کو آتے دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ حسب عادت

کھڑے ہو گئے۔ بیٹی کو بٹھایا۔ اصحابؓ پہلے ہی بی بی کو آتا دیکھ کر پہلو سے اٹھ گئے تھے۔آپ نے حسینؑ کو روتے دیکھ کر پوچھا: کیا معاملہ ہے، حسینؑ کیوں اشک بار ہیں۔ شہزادیؑ نے کہا: یہ اس لئے گریہ کناں ہیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے جب یہ دونوں یہاں آئے تھے تو آپ نے حسنؑ کا منھ چوما اور حسینؑ کا صرف گلا چوما۔ اس بات سے یہ دل گرفتہ ہیں اور رو رہے ہیں۔ رسول اللہؐ نے ایک بار بیٹی کو دیکھا اور پھر نواسوں کو۔ بے اختیار آنکھیں چھلک اٹھیں۔ وفور جذبات سے چھوٹے نواسے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بیٹی سے گو ہوئے۔ "بیٹی! اگر تو نہ پوچھتی تو اچھا تھا۔ خیر میں تجھے بتائے دیتا ہوں۔ کچھ دیر پہلے جب یہ دونوں میرے پاس آئے تو آ کر ادب سے میری گود میں بیٹھ گئے۔ اچانک ہاتفِ غیبی کی آواز آئی۔ اے محمدؐ تیرے یہ نواسے اللہ کی راہ میں قربان ہو جائیں گے۔ بڑا اپنوں کے زہر دیے جانے سے اور چھوٹا دشمنوں کی تیغِ ستم سے اعزہ و اقرباء کے ساتھ تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کر دیا جائے گا۔"

شہزادیؑ گھبرا کر بولیں "آپؐ کے، علیؑ کے اور میرے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہوگا؟"

حضورؐ نے فرمایا، جان پدر اس وقت نہ میں ہوں گا، نہ علیؑ اور نہ تم۔ یہ چونکہ علیؑ کی اولاد ہیں، انہیں تمام مصائب ورثہ میں ملیں گے۔ ان کا سب سے بڑا قصور ان کی بے قصوری اور حق کی حمایت ہوگا۔ یہ اپنے لہو سے دین کی آبیاری کریں گے۔

یہ کہہ کر حضورؐ نے حسینؑ کا منھ چوم لیا۔

مخبرِ اعظمؐ کی تمام پیشین گوئیاں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں۔ ان کا یہ لاڈلا نواسہ، علیؑ و فاطمہؑ کے دل کا یہ ٹکڑا عصرِ عاشور ۶۱ ہجری اپنے پیاروں کے ساتھ زمینِ کربلا پر اسلام پر قربان ہو گیا۔

اس مضمون میں جناب امام حسین علیہ السلام کے بچپن کے کچھ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تمام واقعات ہمارے بارہا سنے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بتانا صرف یہ مقصود

ہے کہ ان میں سے بیشتر واقعات مجمع عام کے سامنے پیش آئے تھے اور حضورؐ نے بار بار ان کا تعارف کرایا تھا پھر بعد وفات پیغمبرؐ دنیا کا رویہ ان کے ساتھ بدل کیوں گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ رسولؐ روزانہ در بتولؑ پر آ کر آیہ تطہیر کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی پاکیزگی بیان کیا کرتے تھے۔ حالت نماز جماعت میں حسینؑ کی خوشنودی کے لئے سجدے میں طول دیا جا رہا تھا۔ خطبہ کو روک کر حسینؑ کا تعارف کرایا جا رہا تھا۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ ان کو جھٹلایا جانے لگا۔ حد ہے کہ جب امام مظلومؑ نے عصر عاشور لوگوں سے پوچھا کہ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے تم میری جان لینا چاہتے ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہمارا صرف ایک مطالبہ ہے کہ آپ یزید سے بیعت کر لیں۔ ایک فاسق و فاجر کی بیعت کا مطلب دین اسلام سے صریحاً روگردانی تھی۔ حسینؑ نے جان دینی قبول کر لی مگر بیعت سے انکار کر دیا۔ حسینؑ کا یہ اقدام رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے ایک پیغام بن گیا کہ حق کبھی باطل کے آگے سر نہیں جھکا سکتا چاہے مادی طور پر وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ حق کی اپنی ایک طاقت ہے۔ یہی اسلام کا پیغام ہے اور یہی حق ہے۔ آج بھی باطل دلیل سے نہیں، طاقت سے اپنی برتری منوانا چاہتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو ان سچے لوگوں کے ذکر کو ہی پسند نہیں کرتا، ان کے پیغام کی ترویج میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ جس میں اسے نہ کل کامیابی ہوئی تھی، نہ آج اور نہ ان شاء اللہ کبھی آئندہ ہو گی۔ جوان کے دامن سے وابستہ تھے ہمیشہ وابستہ رہیں گے۔ چاہے سختیاں کتنی ہی بڑھ جائیں، عاشور پہ ان کا سوگ اور تیسری شعبان کو ان کی ولادت کی خوشی منائی جاتی رہے گی۔

سیدالساجدین، سیدالعابدینؑ

امامت کے بارے میں قرآن کریم کے الفاظ اس طرح ہیں: سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴
ترجمہ: ''اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں امتحان لیا، اور انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو ارشاد ہوا کہ ''تمھیں تمام لوگوں کا امام بناتا ہوں''۔ انہوں نے کہا ''میری اولاد میں سے؟'' ارشاد ہوا کہ ''میرا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔'' اس کے علاوہ بھی امامت کے سلسلے میں قرآن میں احکامات موجود ہیں۔ اس آیت کی رو سے امامت کے لئے عصمت اور عدالت کی شرط لازمی ہے۔ امامت کے سلسلے میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب میں روایتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یوں ہے: ●

جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ''یہ امر بارہ خلفا تک سرفراز رہے گا، انہوں نے کہا پھر آپؐ نے کچھ فرمایا جسے میں سمجھ نہ سکا تو میں نے اپنے والد سے کہا 'کیا فرمایا؟' انہوں نے کہا، فرمایا ''وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔'' اس حدیث میں کہیں ''امیراً'' کہیں ''خلیفۃً'' کہیں ''اماماً'' اور کہیں ''رجلاً'' کے الفاظ آئے ہیں لیکن بارہ کی تعداد تمام روایات میں موجود ہے۔ جابر بن یزید جعفی سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے سنا کہ حضورؐ نے بارہ ائمہ کے نام تک انہیں بتا دیے۔ یہ بھی کہا کہ پانچویں امام حضرت محمد باقر بن علی ابن الحسینؑ ہوں گے، تم انہیں دیکھو گے، تو جب ان سے تمھاری ملاقات ہو تو میرا اسلام انہیں پہنچا دینا۔

یہی حضرت امام علی ابن الحسینؑ امامت کی چوتھی کڑی ہیں۔ آپؑ کی کنیت ابومحمد،

ابوالقاسم ، ابو عبداللہ، ابوالحسن، ابوالائمہ اور ابن الحسین ہے جب کہ زین العابدین، سید الساجدین، سید العابدین، آدم آل عبا، سجاد، عابد، زاہد، زکی، امین ، الصابر، اور ذوثفنات آپ کے القابات ہیں۔

انتہائی معتبر سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ملتی ہے کہ "میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضرت حسینؑ بن علیؑ داخل ہوئے۔ آپ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا، پیار کیا اور پنے پہلو میں بٹھایا، پھر فرمایا" میرے اس بیٹے کے یہاں ایک بیٹا ہوگا جس کا نام علی رکھا جائے گا۔ روز قیامت ایک آواز دینے والا عرش کی بلندیوں سے آواز دے گا کہ" سید العابدین" کھڑے ہوجائیں تو وہی اٹھے گا"

آپ کو ابن الخیرتین (دو برگزیدہ اور چنے ہوؤں کے فرزند) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد حضورؐ کی وہ حدیث ہے" اللہ کے نزدیک اس کے بندوں میں سے دو گھرانے برگزیدہ ہیں۔ عرب سے قریش اور عجم سے فارس۔ جناب علی ابن الحسینؑ کے پدر بزرگوار قریشی جب کہ والدہ محترمہ شاہ زناں فارسی الاصل تھیں، اس لئے یہ کنیت رکھی گئی۔ جناب شاہ زناں یزد جرد بن شہریار بن شیرویہ بن پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں کی صاحبزادی تھیں۔

مورخین نے شاہ زناں کے فضائل و مراتب سے بحث کرتے ہوئے، خود جناب شاہ زناں کا ایک قول نقل کیا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں نے اسیری سے پہلے، کہ ابھی مسلمانوں کا لشکر ہمارے ملک پر حملہ آور نہیں ہوا تھا، ایک مرد بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ جو ایک نوجوان کے ہمراہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ میں خدائے تعالےٰ کا آخری رسول محمدؐ ہوں اور یہ میرے نواسے حسینؑ ہیں۔ میں تمھارا عقد اپنے اس صاحب زادے کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ دیکھنے کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ پھر صبح تک نیند نہ آئی اور برابر اسی امر کا خیال میرے دل و دماغ پر مسلط رہا۔ دوسری رات میں نے ایک

معظمہ کو خواب میں دیکھا، جو میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئیں اور نہایت شفقت کے ساتھ فرمانے لگیں، میرا نام فاطمہؑ ہے۔ میں حسینؑ کی ماں اور محمدؐ کی بیٹی ہوں اور تمھارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ میرے پدر بزرگوار نے تمھیں میرے بچے حسینؑ کی زوجیت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ قبل اس کے کہ مسلمان فوجیں تمھارے شہر پر حملہ آور ہوں اور تم اسیر ہو کر مدینہ میں پہنچو اور حسینؑ سے ملو، کلمہ طیبہ پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر بی بی نے مجھے کلمہ پڑھایا اور اسلام کی موٹی موٹی باتیں تعلیم دیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے میرے ملک کو فتح کیا اور میں اسیر ہوئی۔ تو میرے گھر کے اور قوم کے تمام لوگ ہراساں ہوئے مگر میرے دل میں مطلق خوف و ہراس پیدا نہیں ہوا۔ چنانچہ اسیری کے چند روز بعد مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی اور اب میں رحمت ایزدی سے محمد مصطفیؐ کے اہل بیت کی لڑی میں منسلک ہو کر بہت مطمئن ہوں۔

شاہ زناں نے اپنی نیک اطواری، سلیقہ مندی، پاکیزہ خیالی اور ایثار و خدمت سے خاندان رسالت کے دلوں میں بہت جلد ایک مخصوص جگہ پیدا کرلی۔ آپ کی ذات مبارکہ میں ایران کے شاہی گھرانے کی بہترین روایات اور اعلیٰ خوبیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان خوبیوں کو خاندان اہل بیت کی صحبت اور رفاقت نے کچھ اور نکھار کر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

ابن خلکان، نیز شیخ مفیدؒ لکھتے ہیں کہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو آپ کی سیرت بہت پسند آئی اور خوش ہو کر آپ کو ''بانو'' کا لقب عطا فرمایا۔ اس دن سے آپ بجائے ''شاہ زناں'' کے ''شہر بانو'' کے نام سے موسوم ہوئیں۔

علامہ مجلسیؒ رقم طراز ہیں کہ ایک دن امام زین العابدینؑ جب کہ آپ کا بچپن تھا، بیمار ہوئے۔ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا ''بیٹا! اب تمھاری طبیعت کیسی ہے اور تم کو کوئی چیز چاہئے تو بتاؤ؟ آپ نے عرض کی بابا جان اب میں اللہ کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ میری

بس یہ خواہش ہے کہ اللہ میرا شمار ان لوگوں میں کرے جو اس کی قضا وقدر کے خلاف کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ یہ سن کر امام حسینؑ خوش ہو گئے اور فرمایا بیٹا تم نے بڑا مسرت افزا اور معرفت خیز جواب دیا ہے۔ تمہارا جواب بالکل حضرت ابراہیمؑ کے جواب سے ملتا جلتا ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ کر آگ کی طرف پھینکا گیا اور آپ فضا میں ہوتے ہوئے آگ کی طرف جارہے تھے تو جناب جبرئیلؑ نے پوچھا "آپ کو کوئی حاجت ہے" اس وقت انہوں نے جواب دیا تھا" بے شک مجھے حاجت ہے لیکن تم سے نہیں، اپنے پالنے والے سے ہے۔"

آپؑ کے بچپن کا ہی ایک اور واقعہ ہے۔ آپؑ نے لڑکپن میں کئی بار حج ادا کئے۔ ابراہیم ادہمؒ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ قافلہ کے ساتھ جنگل میں چلا جارہا تھا۔ ایک ضرورت کے تحت قافلہ سے الگ ہو کر ایک جانب چلا گیا۔ کیا دیکھا، ایک لڑکا پیادہ پا چلا جا رہا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس جنگل بیابان میں یہ بچہ تنہا پیدل سفر کر رہا ہے۔ میں نے اس کے قریب جا کر سلام کیا۔ اس نے جواب سلام دیا۔ میں نے کہا صاحبزادے کہاں کا عزم ہے؟ کہا خانۂ خدا کی طرف جارہا ہوں۔ میں نے کہا بیٹا تم ابھی بچے ہو، نہ حج تم پر فرض ہے نہ سنت، کہا: اے شیخ! کبھی تم نے مجھ سے کم سن کو مرتے نہیں دیکھا؟ میں نے پوچھا تمہارا توشہ سفر اور سامان کہاں ہے؟ جواب دیا: میرا توشہ پرہیزگاری، میرے دونوں پاؤں میری سواری اور میرا مقصود میرا مالک ہے۔ میں نے کہا تم بلا زادِراہ ان بیابانوں کو کیوں کر طے کرتے ہو؟ لڑکے نے کہا میرا زادِراہ چار چیزیں ہیں: تمام دنیا و مافیہا کو اس مالک الملک کی مملوک جانتا ہوں، تمام مخلوق کو اللہ کا بندہ اور اللہ کا کنبہ سمجھتا ہوں، جملہ اسباب وارزاق کو اسی کے قبضہ قدرت میں خیال کرتا ہوں اور قضائے الٰہی کے لئے یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ تمام کائنات پر نافذ ہے۔ بس یہی چار باتیں میری زادِراہ ہیں۔ ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ ایک اور راہ گیر سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ علی ابن الحسینؑ ہیں جو اس کم سنی میں پیدل حج کو جارہے ہیں۔

جناب امام زین العابدینؑ کی ذات اقدس سے وابستہ فضائل وکرامات کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہاں ایک ایسے ہی پہلو کی نشاندہی کی سعادت مطلوب ہے۔

دوسرے مسالک کے نئے مفسرین (گزشتہ ساٹھ ستر سال کے عرصے کے) تفسیر جیسے مقدس اور اہم کام میں بہت بخل اور تعصب سے کام لیتے ہیں۔ جس آیت میں بھی آل رسولؐ کی فضیلت کا پہلو ہو اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں موجودہ دور کے چوٹی کے چند ایسے مفسرین ہیں جن کے قلم کی سیاہی آیات تطہیر، مباہلہ، مودت، کوثر، دہر اور درود کی تفسیر کے موقعہ پر خشک ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ آیات مبارکہ اہلبیت رسولؐ سے مربوط اور منسوب ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پرانی اور مستند تفاسیر میں ان کو صحیح اور واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ (البتہ جدید مترجمین ضرور ان میں ڈنڈی مار کر اپنی کوتاہ ذہنی کا ثبوت دیتے ہیں)۔ ''قرآن اور شہزادی فاطمہؑ'' کی تالیف کے دوران مجھے پرانی تفاسیر میں جناب امام زین العابدینؑ کا نام نامی نظر آیا۔ پیش خدمت ہے ان کی تفصیل:

ا۔ رئیس المفسرین حافظ عماد الدین ابو الفداء ابن کثیر ''تفسیر ابن کثیر'' (اردو ترجمہ) مطبوعہ اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ، چوک اردو بازار، لاہور، جلد ۴، صفحہ ۵۷۱ پر آیہ مودت (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۳) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ابو الدیلم کا بیان ہے کہ جب حضرت علی بن حسین کو قید کر کے لایا گیا اور دمشق کے بالا خانے میں رکھا گیا تو ایک شامی نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں قتل کرایا اور تمہارا ناس کرا دیا اور فتنہ کی ترقی کو روک دیا۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: کیا تو نے قرآن بھی پڑھا ہے۔ اس نے کہا: کیوں نہیں۔ فرمایا اس میں حمٓ والی سورتیں بھی پڑھی ہیں۔ اس نے کہا: واہ! سارا قرآن پڑھ لیا اور حمٓ والی سورتیں نہیں پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: پھر کیا ان میں اس آیت کی تلاوت تو

نے نہیں کی: (قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودة فی القربیٰ) یعنی میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا مگر محبت قرابت کی۔ اس نے کہا: پھر کیا تم وہ ہو؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔"

یہ روایت "تفسیر درّ منثور" از امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی" (مترجم) مطبوعہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔ کراچی۔ جلد ۵، صفحہ ۱۰۴۱ پر بھی موجود ہے۔

۲۔ حضرت مولینا عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی، مطبوعہ: پاک کمپنی۔ ۱۷۔ اردو بازار، لاہور، صفحہ ۱۸۸۔ ۱۸۹ پر سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۴ (ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جو فراغت اور تنگی (دونوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کے ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"محدث بیہقی نے سیدنا حضرت علی بن حسینؑ سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ آپ کو ایک جاریہ (کنیز) وضو کرا رہی تھی کہ لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ پر گرا۔ غصہ آنا امر طبعی تھا۔ جاریہ نے فوراً الفاظ قرآنی "الکاظمین الغیظ" اپنی زبان سے ادا کئے۔ آپ کا غصہ دور ہوگیا۔ پھر جاریہ نے "العافین عن الناس" پڑھا۔ آپ نے فرمایا "میں نے معاف کردیا" اب جاریہ کی زبان پر "واللہ یحب المحسنین" آیا۔ آپ نے فرمایا "جا میں نے تجھے آزاد کردیا"۔ رسول اسلام کی زندگی تو خیر سن وعن قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ہی رسول اکرمؐ سے متعلق قرب وقرابت رکھنے والے بھی کس درجہ نفوس قدسیہ کے مالک بن چکے تھے۔"

"تفسیر ماجدی" کے علاوہ یہ روایت بالکل اسی طرح "تفسیر ابن کثیر" "تفسیر درّ منثور" اور "تفسیر نور" میں موجود ہے۔

امام زین العابدینؑ کا اصل کام عصر عاشور کے بعد شروع ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ نے صبر وضبط اور استقامت کی تاریخ رقم کی ہے۔ ایک دن میں بہتر لاشے اٹھانا جن میں ان کے جگر پارے بھی تھے کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے لیکن عاشور کے بعد ایک

طویل عرصے تک جن مظالم کا امام سجادؑ نے بے جگری سے مقابلہ کیا ہے اس کی مثال بھی تاریخ میں ناپید ہے۔

تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ہم آپؑ کا وہ خطبہ نقل کرتے ہیں جو آپؑ نے یزید ملعون کے دربار میں ارشاد فرمایا۔ خیال رہے کہ یہ ایک سفاک جابر حکمراں کا دربار ہے۔ جس میں اس کے حواری اور نمک خوار جمع ہیں اور کچھ عرصہ پہلے ہی یہ لوگ آپؑ کے اہل خاندان کو تہ تیغ کر چکے ہیں۔

''لوگو! جس نے مجھے پہچان لیا، پہچان ہی لیا اور جس نے مجھے نہیں پہچانا اس کو میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میں مکہ اور منیٰ کا فرزند ہوں، میں زمزم اور صفا کا فرزند ہوں۔ میں محمد مصطفےٰ کا فرزند ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جو انتہائے شہرت سے محتاج تعارف نہیں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جو بلندی پر پہنچا تو اتنا بلند ہوا کہ سدرۃ المنتہیٰ سے گزر گیا۔ اور اپنے پروردگار سے اتنا قریب ہوا کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کمتر فاصلہ رہ گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس نے ملائکۂ سماوات کو دو دو بار نماز پڑھائی، میں اس کا بیٹا ہوں جسے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کرائی گئی، میں علی مرتضیٰ کا بیٹا ہوں۔ میں خدیجۂ کبریٰ کا بیٹا ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے ظلم سے شہید کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر پسِ گردن سے کاٹا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے مرتے مرتے پانی نہ دیا گیا۔

میں اس کا بیٹا ہوں جس کی لاش کربلا میں بے گور و کفن پڑی رہی۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا عمامہ اور کمر کا پٹکا تک (لاشے سے) اتار لیا گیا۔

میں اس کا بیٹا ہوں جسے آسمان کے فرشتے روئے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے لئے زمین پر جنوں نے اور فضا میں پرندوں نے گریہ کیا۔

میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر نوکِ نیزہ پر شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس

کے حرم عراق سے شام تک قیدی بنا کر لائے گئے۔ لوگو! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم اہل بیت کو اچھی آزمائش میں مبتلا کیا، کیوں کہ اس نے ہدایت، انصاف اور تقویٰ کا پرچم ہمیں میں بلند کیا ہے اور گمراہی اور ہلاکت کا جھنڈا ہمارے حریفوں سے مختص کیا ہے۔ اور اس نے ہم اہل بیت کو چھ خصلتوں کے باعث فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یعنی علم، بردباری، شجاعت، سخاوت اور مومنین کے دلوں میں محبت اور مقام اور ہم کو وہ (مرتبہ) دیا جو کائنات میں ہم سے پہلے کسی کو نہیں دیا۔ ہم ہی پر ملائکہ اور آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

روایتوں میں ہے کہ حضرت سجاد علیہ السلام کا یہ خطبہ مکمل نہ ہو سکا۔ حقیقتوں کے انکشاف کی بنا پر دربار میں تلاطم پیدا ہو گیا اور کفرو ستم شعار حاکم نے اذان کا سہارا لے کر امام کے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیا۔

جناب زین العابدینؑ کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ دعاؤں کے ذریعہ علوم محمدؐ و آل محمدؐ کی تبلیغ و ترویج ہے۔ ایسی دعاؤں کو جمع کر کے "صحیفہ کاملہ" کا نام دیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اتنے مظالم اور نا مساعد حالات کا سامنا کرنے کے باوجود امام سجاد نے اپنے فرائض امامت کو کس طرح ادا کیا ہوگا۔ حیات انسانی کا وہ کون سا باب ہے جس کا احاطہ آپ نے دعاؤں کی شکل میں تعلیم نہیں فرمادیا۔ روایات میں ہے کہ آپ خانہ کعبہ میں میزاب رحمت کے قریب نمازیں اور دعائیں پڑھتے۔ حالات کے تقاضہ کے تحت دعاؤں کو ہتھیار بنانا اور اس کے ذریعہ رسولؐ کے مشن کو آگے بڑھانا آپ کی اعلیٰ بصیرت کی نادر مثال ہے۔ اس کے علاوہ "رسالۃ الحقوق" کے نام سے ایک مستقل اور انتہائی اہم منشور حقوق بھی آپؑ سے روایت کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے صحیفۂ مبارکہ سجادیہ اور رسالۃ الحقوق کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

(اس مضمون کے ماخذ: "تفسیر ابن کثیر"۔ "تفسیر درِ منثور"۔ "تفسیر ماجدی"۔ "چراغ راہ" از آیت اللہ عقیل الغروی۔ "چودہ ستارے" از علامہ نجم الحسن کراروی۔ "صحیفۂ کاملہ" مترجم: شاعر اہل بیت علامہ نسیم امروہوی۔)

شاہدِ کربلا حضرت امام محمد باقرؑ

سلسلۂ امامت کی پانچویں کڑی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا اپنے بابا اور فرزند ارجمند کی طرح اشاعت علومِ اسلامی میں ایک خاص مقام ہے۔ آپ نے جس پرآشوب دور (۵۷ ہجری) میں آنکھیں کھولیں وہ اہلِ بیت اطہار کے سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ بنو امیہ کی سازشیں اور دشمنان اسلام کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ کم سنی ہی میں آپ نے عاشور اکسٹھ ہجری کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اگرچہ آپ اس وقت صرف چار سال کے تھے مگر اس ہولناک واقعہ کے نقوش تمام عمر آپؑ کے دل و دماغ پر ثبت رہے۔ دادا، چچا اور دیگر افراد خاندان کی شہادت اور اس کے بعد اہلِ خانہ کی قید و اسیری دیکھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو نسل امامت کو باقی رکھنا تھا اس لئے ان کو اور ان کے والد گرامی کو اللہ نے قتلِ عام سے محفوظ رکھا۔ اس طرح جو ذمہ داریاں ان پر اللہ کی جانب سے تھیں ان کو بھرپور انداز سے پورا کیا۔

آیت اللہ علامہ عقیل الغروی نے اپنی کتاب ''چراغِ راہ'' میں ''تذکرہ'' کا تذکرہ بہت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''اردو کے نامور مصنفین میں مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو ہندوستان کے بڑے سیاسی رہنماؤں میں بھی شمار ہوتے ہیں اور بڑے مفکرین، علماء اور ادباء میں بھی، اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''آج قرآن و علوم انبیائے کرام کے خلاف کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایسی نہیں کہی جاتی اور نہیں کہی جاسکتی، جو اصولاً پہلے نہیں کہی جاچکی ہو، بلکہ عین قرآن حکیم کے

نزول اور اس کے ۲۳ سالہ زمانے میں نہ کہی گئی ہو اور خود قرآن وسنت نے اس کا جواب نہ دے دیا ہو۔......... علی الخصوص جن ارباب نظر نے صرف حضرات ائمہ اربعہ ہی کے مناظرات مسکتہ اور ائمۂ اہل بیت کرام علی الخصوص حضرت امام باقر و امام جعفر الصادق علیہما و علی آبائہما و اجدادہما الصلوٰۃ والسلام کی احادیث مفصلہ حکیمیہ بمقابلۂ مشککین ملاحدہ و زندقہ مطالعہ کی ہیں، جن کا گھر وحی و نبوت کا گھر اور جن کا دروازہ باب مدینہ علم، اور جن کے اطفال واحداث تک علم نبوت و فیضان رسالت کی گود میں پرورش پانے والے تھے، وہ بھلا آج کل کے غلغلۂ الحاد کو کب خاطر میں لا سکتے ہیں،......"

مولانا ابوالکلام آزاد کے "تذکرہ" کے بعد علامہ سید ابن حسن رضوی جارچوی کے "تذکرۂ محمدؐ و آل محمدؑ" سے جناب امام محمد باقرؑ کے درس و تدریس کے بارے میں دیکھتے ہیں:

"حضرت امام محمد باقرؑ کا علمی فیض عام تھا۔ نماز صبح کے بعد درس شروع ہوتا اور ہر طبقہ کے لوگ اس میں شامل ہوتے۔ ساری اسلامی دنیا سے طالب علم کھنچ کھنچ کر مدینہ آتے اور آپ کے تبحر علمی سے مستفید ہوتے۔ بڑے بڑے علماء و مجتہدین جن کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں آپ ہی کے درس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ امام زہری (وفات ۱۲۳ھ) امام ابوحنیفہ (وفات ۱۵۰ھ) اوزاعی (وفات ۱۵۷ھ) کہ دنیا آج جن کو فقہ، اصول فقہ، حدیث اور شریعت و طریقت کا امام مانتی ہے آپ ہی کے خوشہ چین تھے۔

علامہ شبلی نعمانی "سیرت النعمان" میں لکھتے ہیں:

"ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے ان (امام محمد باقرؑ) کی خدمت میں رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ و سنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ ممدوح کا فیض صحبت تھا۔" (سیرت نعمان ص ۳۸)۔

حضرت امام محمد باقرؑ کے زمانے میں علم فقہ کی تدوین ہوئی اور لوگوں نے حدیثوں

سے مسائل استنباط کرنے شروع کئے اور جن مسائل کے متعلق کوئی آیت یا حدیث نہ ملتی ان پر قیاس سے حکم لگاتے۔ یہ مرض عام ہو چلا تو آپ نے سختی سے اس کی روک تھام کی کیوں کہ قیاس و تحقیق کبھی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کبھی گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ دین و ایمان پر اخروی نجات کا دارومدار ہے اس لئے اس کے معاملات قیاس، ظن اور تخمین کے سپرد نہیں کئے جا سکتے۔

قرآن آخری کتاب ہے اور رسول عربی خاتم النبیین ہیں اس لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ روزانہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب وسنت کی تفسیر کرنے والا لوگوں میں موجود رہے۔ آل محمدؑ جو رسول اکرمؐ کے صحیح جانشین تھے ان حدیثوں سے واقف تھے جو فرد اور معاشرے کی ضروریات کے لئے کافی ہو سکیں مگر عام مسلمانوں نے باب مدینۃ العلوم سے روگردانی کی اس لئے احادیث نبوی کا پورا ذخیرہ ہاتھ نہ آسکا اور قدم قدم پر قیاس و تخمین سے کام لینا پڑا۔

حضرت امام محمد باقرؑ نے اپنے عہد میں ان احادیث رسول کی اشاعت کا پورا اہتمام کیا تاکہ احکام خدا اور رسول لوگوں تک پہنچ سکیں۔ حضرتؑ سے استفادہ کرنے والوں نے بڑی زحمتیں اور مشقتیں برداشت کر کے ان احادیث کو جمع کیا اور آئندہ نسلوں کے لئے کتابی شکل میں محفوظ کر لیا۔

حضرتؑ کے ایک شاگرد محمد بن مسلم ثقفی طائفی کوفی کا بیان ہے کہ میں نے جناب امام محمد باقرؑ سے تیس ہزار حدیثیں اخذ کیں۔ چونکہ حضرت علیؑ ہمہ وقت رسول اللہؐ کے ساتھ رہے اور آنحضرتؐ نے ان کو خصوصیت کے ساتھ امت کی ہدایت کے لئے تیار کیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، سفر میں اور حضر میں ہر وقت حضرت علیؑ نے اس ہادی برحق اور رہبر عالم کو قریب سے دیکھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اتنی ساری

حدیثیں ان کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ وہ ائمہ اہلِ بیت چونکہ آپ کے جانشین تھے اس لئے فطری طور پر یہ ذخیرۂ علوم آپ ہی حضرات کے ذریعہ سے دنیا کو مل سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن کسی نے جناب عبداللہ ابن عمر سے کوئی مسئلہ پوچھا وہ اس کا جواب نہ دے سکے۔ سامنے امام محمد باقرؑ بیٹھے تھے۔ عبداللہ ابن عمر نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا: اس نوعمر صاحبزادے سے دریافت کرلو۔ وہ حاضر خدمت ہوا اور آپؑ نے اس کو جواب شافی دے دیا۔ جب لوٹ کر عبداللہ ابن عمر کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: یہ اہلِ بیت رسولؐ ہیں، علم ان ہی کے گھر سے نکلا ہے۔ (مناقب ابن شہر آشوب)۔

حضرتؑ نے اپنے اصحاب کو اس کام کے لئے متعین کیا کہ وہ اس عہد کے علماء، فضلاء، قاضی اور متقی لوگوں سے ملیں اور ان کو قیاس و ظن کی پیروی کرنے سے روکیں اور احادیث نبوی کی طرف رہنمائی کریں۔"

"تذکروں" کے بعد ہم جناب رسول جعفریان کی کتاب "ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام۔ فکری و سیاسی زندگی" میں امام محمد باقرؑ کے علمی مقام کا مطالعہ کرتے ہیں:

"یہ بات بلا شک و تردید کہی جا سکتی ہے کہ بہت سے علمائے سنت کی رائے میں امام محمد باقر علیہ السلام کو اپنے زمانۂ حیات میں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی اور آپؑ کی بزم تمام اسلامی شہروں اور سرزمینوں سے تعلق رکھنے والے آپؑ کے محبوں سے بھری رہتی تھی۔ ایک عالم اور فقیہ کی حیثیت سے اور بالخصوص علوم اہل بیت کے ایک نمائندے کی حیثیت سے آپؑ کا علمی مقام بہت سے لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ آپ کی بزم سے استفادہ کریں اور اپنی علمی اور فقہی مشکلات کا حل آپؑ سے طلب کریں۔ ان میں سے اہلِ عراق جن میں شیعوں کی بڑی تعداد موجود تھی، آپؑ کی شخصیت کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

آپؑ کے پاس آنے والوں میں آپؑ کی علمی شخصیت کے سامنے اس قدر عاجزی اور

انکساری کا اظہار نظر آتا تھا کہ عبداللہ بن عطا مکی کہتے ہیں: میں نے علما کو کسی کے سامنے اتنا منکسر نہیں دیکھا جتنا وہ ابو جعفر (امام محمد باقرؑ) کے حضور رہا کرتے تھے۔ حکم بن عینیہ لوگوں کے درمیان اپنی تمام تر علمی عظمت کے باوجود آپؑ کے سامنے استاد کے حضور زانوئے ادب تہہ کیے بیٹھے ایک بچے کی طرح نظر آتا تھا۔

آپؑ کی علمی شہرت کے بارے میں ابن عنبہ کے الفاظ ہیں کہ "آپؑ وسیع علم اور کثیر حلم کے مالک تھے۔" لہٰذا اس حوالے سے آپؑ اتنے زیادہ مشہور ہیں کہ کسی کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپؑ کی شہرت کا ڈنکا خود آپؑ کے اپنے زمانے میں نہ صرف حجاز میں بجتا تھا کہ "آپؑ فقہائے حجاز کے سید و سردار تھے" بلکہ عراق اور خراسان میں بھی اس کی صدائیں گونجتی تھیں۔ جیسا کہ راوی کہتا ہے: میں نے دیکھا کہ خراسان کے لوگ آپؑ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے آپؑ سے اپنی علمی مشکلات کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔

"ذہبی" "امام محمد باقرؑ کے بارے میں لکھتے ہیں: آپؑ ان لوگوں میں سے ایک تھے جن میں علم و عمل، سیادت و شرافت اور وثاقت و متانت یک جا تھیں اور آپؑ میں خلافت کی اہلیت پائی جاتی تھی۔

خاص و عام امام محمد باقرؑ کے علم و دانش سے فیضیاب ہونے کے لئے آپؑ کی بزم کا رخ کرتے تھے، اس بارے میں استاد ابو زہرہ لکھتے ہیں:

امام محمد باقرؑ امامت اور لوگوں کی ہدایت کے سلسلے میں امام سجادؑ کے وارث تھے۔ اسی لئے تمام اسلامی شہروں کے علما ہر طرف سے آپؑ کی بزم میں آتے تھے۔ جو کوئی بھی مدینے کی زیارت کو آتا، آپؑ کی خدمت میں ضرور شرف یاب ہوتا اور آپؑ کے بے پایاں علوم سے بہرہ مند ہوتا۔ وہی لکھتے ہیں: فقہ و حدیث کے بہت سے بزرگ علماء آپؑ کے علم سے استفادے کی غرض سے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

عیون اخبار سے منقول ہے کہ فقہا آپؑ سے حلال و حرام (کے احکام) سیکھا کرتے تھے۔

آپؑ اپنے والد امام زین العابدینؑ کی طرح، جنہیں لوگوں کے درمیان عظیم علمی شہرت حاصل تھی، خاص و عام میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ محمد بن منکدر جو خود اہل سنت کے ایک مشہور محدث ہیں، امام محمد باقرؑ کی علمی عظمت کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے علی ابن الحسینؑ کے فرزند محمد باقرؑ کی خدمت میں پہنچنے سے قبل تک ان کے بچوں میں سے کسی کو (علم و فضیلت میں) ان کا جانشین نہیں پایا تھا۔"

جناب سید محمد رفیق حسین شاہ، ایڈووکیٹ سرگودھا اپنی کتاب "امام محمد باقرؑ اور مذاہب عجم" کے باب "نشر علوم" میں رقم طراز ہیں:

"جناب رسول خداؐ کے بعد پبلک درس و تدریس جناب امیرؑ کی اولیات میں سے ہے۔ آنجنابؑ کے بعد ان کی اولاد نے یہ سلسلہ قائم رکھا۔ جناب امام محمد باقرؑ بھی مسجد تشریف لے جاتے تھے۔ لوگ جوق در جوق آپؑ کے مواعظ سے فیض حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ بادشاہان وقت اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ائمہ اہل بیت مرجع خلائق ہوں۔ حالانکہ ائمہ علیہم السلام نے سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ لیکن تعلیم و ترویج علوم و فقہ اسلام تو ان کی زندگی کا مقصد تھا، اس کو کیوں کر چھوڑ سکتے تھے۔ شہادت حضرت امام حسینؑ کے بعد حضرت امام حسن عسکریؑ تک تمام ائمہ کی زندگی اسی پر ختم ہوئی۔ واقعہ حرہ کے بعد مدینہ میں کوئی اسکول آف تھاٹ نہ رہا، اکثر و بیشتر لوگ قتل کر دیے گئے۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد حنبل اور امام شافعی نے اپنے اپنے اسکول آف تھاٹ قائم کیے۔ جب کہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے تعلیم رسول کا سلسلہ جاری و ساری رکھا۔ لوگ سوال کرتے تھے، آپؑ کافی و شافی جواب دے کر ان کی تسلی کر دیتے تھے۔

حضرت امام محمد باقرؑ کی علمی حیثیت کے بارے میں مولانا سید نجم الحسن کراروی کی کتاب "چودہ ستارے" میں لکھا ہے:

"کسی معصوم کی علمی حیثیت پر روشنی ڈالنا بہت دشوار ہے، کیوں کہ معصوم اور امام زمانہ کو علم لدنی ہوتا ہے، وہ اللہ کی بارگاہ سے علمی صلاحیتوں سے بھر پور متولد ہوتا ہے۔ حضرت امام محمد باقرؑ چونکہ امام زمانہ اور معصوم ازلی تھے، اس لئے آپ کے علمی کمالات، علمی کارنامے اور آپؑ کی علمی حیثیت کی وضاحت ناممکن ہے تاہم میں ان واقعات میں سے مشتے از خود وارے، لکھتا ہوں جن پر علماء عبور حاصل کر سکے ہیں:

علامہ شہر آشوب لکھتے ہیں کہ حضرتؑ کا خود ارشاد ہے کہ "ہمیں طائروں تک کی زبان سکھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز کا علم عطا کیا گیا ہے۔"

علامہ محمد بن طلحہ شافعی لکھتے ہیں کہ جابر جعفی کا بیان ہے کہ میں ایک دن حضرت امام محمد باقرؑ سے ملا تو آپؑ نے فرمایا: اے جابر میں دنیا سے بالکل بے فکر ہوں۔ کیوں کہ جس کے دل میں دین خالص ہو وہ دنیا کو کچھ نہیں سمجھتا، اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا چھوڑی ہوئی سواری، اُتارا ہوا کپڑا اور استعمال کی ہوئی عورت ہے۔ مومن دنیا کی بقا سے مطمئن نہیں ہوتا اور اس کی دیکھی ہوئی چیزوں کی وجہ سے نور خدا اس سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ مومن کو تقویٰ اختیار کرنا چاہیے کہ وہ ہر وقت اسے متنبہ اور بیدار رکھتا ہے۔ سنو! دنیا ایک سرائے فانی ہے۔ اس میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آج آئے اور کل گئے۔ دنیا ایک خواب ہے جو کمال کے مانند دیکھی جاتی ہے اور جب جاگ اٹھے تو کچھ بھی نہیں۔ آپؑ نے فرمایا تکبر بہت بری چیز ہے، یہ جس قدر انسان میں پیدا ہوگا، اسی قدر اس کی عقل گھٹے گی۔ کمینے شخص کا حربہ گالیاں بکنا ہے۔ ایک عالم کی موت کو ابلیس نوے عابدوں کے مرنے سے بہتر سمجھتا ہے۔ ایک ہزار عابد سے وہ ایک عالم بہتر ہے جو اپنے علم سے فائدہ پہنچا رہا ہو۔ میرے ماننے والے وہ ہیں جو

اللہ کی اطاعت کریں۔ آنسوؤں کی بڑی قیمت ہے، رونے والا بخشا جاتا ہے اور جس کے رخسار پر آنسو جاری ہوں وہ ذلیل نہیں ہوتا۔ سستی اور زیادہ تیزی برائیوں کی کنجی ہے۔ خدا کے نزدیک بہترین عبادت پاک دامنی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے پیٹ اور اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں۔ دعا سے قضا بھی ٹل جاتی ہے۔ نیکی بہترین خیرات ہے۔ بدترین عیب یہ ہے کہ انسان کو اپنی آنکھ کی شہتیر دکھائی نہ دے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آئے۔ یعنی اپنے بڑے گناہ کی پرواہ نہ ہو اور دوسروں کے چھوٹے عیوب اسے بڑے نظر آئیں۔ خود عمل نہ کرے صرف دوسروں کو تعلیم دے۔ جو خوش حالی میں ساتھ دے اور تنگ دستی میں دور رہے وہ تمھارا بھائی اور دوست نہیں ہے۔

علامہ شبلنجی لکھتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ جب کوئی نعمت ملے تو کہو الحمدللہ، جب کوئی تکلیف پہنچے تو کہو لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اور جب روزی تنگ ہو تو کہو استغفر اللہ۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، جتنی محبت تمھارے دل میں ہوگی، اتنی ہی تمھارے بھائی اور دوست کے دل میں بھی ہوگی۔ تین چیزیں خدا نے تین چیزوں میں پوشیدہ رکھی ہیں۔ (۱) اپنی رضا اپنی اطاعت میں، یعنی کسی کی فرماں برداری کو حقیر نہ سمجھو۔ شاید اسی میں خدا کی رضا ہو۔ (۲) اپنی ناراضگی اپنی معصیت میں، کسی گناہ کو معمولی نہ جانو شاید خدا اسی سے ناراض ہو جائے۔ (۳) اپنی دوستی اپنے ولی میں، مخلوقات میں کسی شخص کو حقیر نہ سمجھو، شاید وہی ولی اللہ ہو۔

احادیث ائمہ میں ہے: امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: انسان کو جتنی عقل دی گئی ہے اسی کے مطابق اس سے قیامت میں حساب و کتاب ہوگا۔ عالم کی صحبت میں تھوڑی دیر بیٹھنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ خدا ان علماء پر رحم و کرم فرمائے جو احیاء علم کرتے اور تقویٰ کو فروغ دیتے ہیں۔ علم کی زکوٰۃ یہ ہے کہ مخلوق خدا کو تعلیم دی جائے۔ قرآن مجید کے

بارے میں تم جتنا جانتے ہو اتنا ہی بیان کرو۔ بندوں پر خدا کا حق یہ ہے کہ جو جانتا ہو اسے بتائے اور جو نہ جانتا ہو اس کے جواب میں خاموش ہو جائے۔ علم حاصل کرنے کے بعد اسے پھیلاؤ۔ اس لیے کہ علم کو بند رکھنے سے شیطان کا غلبہ ہوتا ہے۔ معلم اور متعلم کا ثواب برا ہے۔ جس کی تعلیم کی غرض یہ ہو کہ وہ علماء سے بحث کرے، جہلا پر رعب جمائے اور لوگوں اپنی طرف مائل کرے وہ جہنمی ہے۔ دینی راستہ دکھلانے والا اور راستہ پانے والا دونو ثواب کے میزان کے لحاظ سے برابر ہیں۔ جو دینیات میں غلط کہتا ہو اسے صحیح بنا دو۔ ذات الٰہی وہ ہے جو عقلِ انسانی میں سما نہ سکے اور حدود میں محدود نہ ہو سکے۔ اس کی ذات فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اللہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اللہ کی ذات کے بارے میں بحث نہ کرو ورنہ حیران ہو جاؤ گے۔ اجل کی دو قسمیں ہیں ایک اجل محتوم دوسرے اجل موقوف۔ دوسری سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔ زمین حجت خدا کے بغیر باقی نہیں سکتی۔ امت بے امام کی مثال بھیڑ کے اس گلے کی ہے جس کا کوئی بھی نگران نہ ہو۔

آپ کا ایک اور ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم کسی عالم کی مجلس میں بیٹھو تو اس کے سامنے زیادہ بولنے کی بجائے زیادہ سننے کی کوشش کرو اور جس طرح تقریر و تکلم سیکھتے ہو اسی طرح "حسن سماعت" بھی سیکھو اور کبھی کسی کی بات نہ کاٹو۔"

کتابوں میں حضرت امام محمد باقرؑ کے علمی ارشادات بہت زیادہ مذکور ہیں۔ ان کی صرف ایک جھلک اوپر کی سطور میں پیش کی گئی۔

ناممکن ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ کا ذکر ہو اور حضور اکرم کی اس حدیث کا ذکر نہ جس میں آپؐ نے اپنے صحابی جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے ذریعہ آپؑ کو سلام بھیجا۔ مناقب شہر آشوب میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ جو اصحاب رسولؐ میں نہایت کبیر السن تھے اکثر مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر یا باقر العلوم کہا کرتے تھے۔ فرماتے تھے میں

نے رسول اللہؐ سے سنا ہے۔ حضورؐ فرماتے تھے "اے جابرؓ! تم ہمارے فرزندوں میں سے ایک سے ملاقات کرو گے جو نسلِ امام حسینؑ سے ہوگا۔ اس کا نام میرا نام ہوگا، اس کی سیرت میری سیرت ہوگی، وہ باقر العلوم نبیوں کا ہے وہ انبیاء کے علوم ظاہر کرنے والا ہے۔ جب تم اس سے ملاقات کرو تو تم اس کو میرا سلام کہنا۔" بس یہی بات ہے جو میں اس کو پکارتا ہوں۔ آخرش جب جناب جابرؓ کی امام باقرؑ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپؑ کے سر کا بوسہ دیا اور کہا میرے ماں باپ آپؑ پر فدا ہوں، جنابِ رسالت مآبؐ نے آپؑ کو سلام کہا ہے۔ (کتاب "امام محمد باقرؑ اور مذاہب عجم" مرتبہ سید محمد رفیق حسین شاہ، ایڈووکیٹ سرگودھا، مطبوعہ حسن پبلیکیشنز، گلشن راوی، لاہور، ص ۱۳۔۱۴)

یہاں اس حدیث تذکرہ اجمالاً کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اکثر محدثین بشمول شیخ صدوقؒ (امالی) علامہ مجلسیؒ (بحار الانوار) نے قابلِ وثوق اسناد کے ساتھ درج کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور اکرمؐ نے ائمہ اثناء عشر کی تعداد نام بنام ارشاد فرمائی ہے۔

اپنے مضمون کو ہم آیت اللہ عقیل الغروی صاحب مدظلہ العالی کی اس رباعی کے ساتھ تمام کرتے ہیں جو انہوں نے حضور اکرمؐ کی مندرجہ بالا حدیث کے حوالے سے اپنی کتاب "چراغِ راہ" میں درج فرمائی ہے:

حق نے جسے تا حدِ وصی پہنچایا
تا مسند و منبرِ علی پہنچایا
میرا بھی سلامِ شوق پہنچے جس کو
جابرؓ نے سلامِ نبویؐ پہنچایا

معمار فقہ اسلامی، حضرت امام جعفر صادقؑ

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام زنجیر امامت کی چھٹی کڑی ہیں ۔آپ کے بارے میں حضرت امام باقر علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "میرا یہ فرزند ان چند مخصوص افراد میں سے ہے جن کے وجود سے اللہ نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے اور یہی میرا جانشین ہوگا۔"

واقعہ کربلا کے بعد بنی امیہ کے مظالم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ظلم واستبداد کا یہ سلسلہ خصوصیت کے ساتھ خاندان نبوت کے ساتھ تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ چوتھے امام جناب سجادؑ کو بھی زہر ہلاہل سے شہید کر دیا گیا۔ جناب امام محمد باقرؑ کو بھی حق وصداقت کا علم بلند کرنے کی سزا دی گئی اور انہیں بھی سازش سے شہادت سے ہمکنار کر دیا گیا۔امام صادقؑ کو البتہ کچھ وقت مل گیا اور انہوں نے مختصر سے وقت میں جس قدر بھی ممکن ہوا علوم اسلامی کو نہ صرف خود مدون فرمایا بلکہ اپنے اصحاب اور تلامذہ کے ذریعہ بھی ان علوم کی ترویج فرمائی۔ خصوصیت کے ساتھ علمِ فقہ،اصول فقہ،علومِ تفسیر،علوم و آداب عرفان اسلامی یا تصوف اسلامی ،علومِ حدیث و درایت ،علم کیمیا وغیرہ کی عظیم الشان تبلیغ و ترویج ہوئی۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علم فقہ کوئی معمولی علم نہیں بلکہ یہ وہ علم ہے جو عالمِ بشریت کی عظمت وسعادتِ دائمی اور انسانیت کے معیار شرافت کا بنیادی قاعدہ، اصولی ضابطہ اور عملی دستور فراہم کرتا ہے۔

علمِ فقہ اور علم اصول فقہ دین اسلام اور ملت اسلامیہ کی علمی اور تہذیبی میراث ہیں۔

کسی مذہب میں ''قانون سازی'' پر اصولاً اور عملاً اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا اسلام نے اس کا اہتمام کیا اور اس سے بہت کچھ براہ راست اور بہت کچھ بالواسطہ تمام انسانیت کو فائدہ پہنچا اور آج بھی پہنچ رہا ہے۔ اسی لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ''فقہ'' وہ علم ہے جس میں ''ختم نبوت'' کا ایک تہائی راز پوشیدہ سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے تمام علوم اسلامی کی نسبت سے اسے ''جوہر علم'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تمام علوم قرآن وحدیث اور علوم ادب کو علم فقہ کی نسبت سے مبادی ومقدمات کی حیثیت حاصل ہے۔

فقہ جعفری کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں عقل کی اہمیت، اصالت اور ''حجّیت'' یعنی عقل کی آئین ساز حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ آج بھی دنیا میں فقہ جعفری کی ساکھ اس لئے ہے کہ اس کے بنیادی قواعد علم وعقل ومنطق کے ناقابل تزلزل ارکان پر قائم ہیں اور اس کے ''سماعی دلائل'' اہل بیت رسالت کے معصوم اماموں اور ان کے اصحاب ابرار کے سلسلوں سے نقل ہوتے آئے ہیں جو کبھی بھی کسی مصلحت، سیاست یا دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ آپؑ کو سروکار ہمیشہ صرف اور صرف کتاب اللہ اور میراث نبوت سے رہا۔ کہنے کو تو فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی بھی ہیں لیکن ان تمام مکاتب کے سربراہان، براہ راست یا ایک دو واسطوں سے حضرت امام جعفر صادقؑ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ آپؑ کا یہ امتیاز بھی منفرد ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں ان فقہا اور دوسرے اکابر نے آپؑ کے بارے میں کیا کہا:

امام ابوحنیفہ نے جناب امام محمد باقرؑ اور جناب امام جعفر صادقؑ دونوں سے کسب فیض کیا۔ وہ امام صادقؑ کے بارے میں کہا کرتے تھے:

''میں نے کسی کو بھی جعفر بن محمد سے زیادہ فقیہ نہیں پایا، وہ امت اسلامی کے عالم ترین انسان ہیں۔ (جامع المسانید۔ ج ۱ ص ۲۲۲، الامام الصادق۔ ص ۲۲۲ اور الامام ابوحنیفہ۔ ص ۷۰)۔

مالک بن انس ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ امام جعفر صادقؑ کی شاگردی اختیار کی ہے۔ وہ آپ کی شخصیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں کچھ عرصے تک جعفرؑ بن محمدؑ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ آپ شگفتہ مزاج تھے اور ہر وقت آپؑ کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ جب ان کے سامنے جناب رسالت مآب کا ذکر ہوتا تھا تو آپؑ کا رنگ متغیر اور پھر زردی مائل ہو جاتا تھا۔ جس زمانے میں میری آپؑ کے یہاں آمد ورفت تھی، میں نے کبھی آپؑ کو ان تین حالتوں کے سوا نہیں دیکھا: یا تو آپؑ نماز کی حالت میں ہوتے تھے، یا روزے کے عالم میں، یا تلاوت قرآن میں مشغول۔ آپؑ کبھی بھی بغیر وضو کے رسول اللہؐ سے حدیث روایت نہیں کیا کرتے تھے۔ کوئی فضول بات نہیں کرتے تھے۔ آپ ان زاہد علما میں سے تھے جن کے پورے وجود پر خوف خدا چھایا ہوا ہو۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا آپؑ اپنی نشست نکال کر میرے نیچے رکھ دیا کرتے۔"

عمر بن المقدام سے منقول ہے:

"میں جب بھی جعفرؑ بن محمدؑ کو دیکھتا تو جان لیتا کہ آپؑ نسلِ انبیاءؑ سے ہیں۔"

تیسری صدی ہجری کے مشہور عالم جاحظ امامؑ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"جعفرؑ بن محمدؑ وہ ہستی ہیں جنہوں نے دنیا کو اپنے علم اور فقہ سے معمور کر دیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ اور سفیان ثوری آپ کے شاگردوں میں سے تھے اور ان دو کا آپؑ کی شاگردی اختیار کرنا آپؑ کی علمی و فقہی عظمت (کی نشاندہی) کے لیے کافی ہے۔"

حسن بن علی الوشاء کہتے ہیں: میں نے مسجد کوفہ میں ایسے نو سو افراد کو دیکھا ہے جو حدثنی جعفرؑ بن محمدؑ (ہم سے جعفرؑ بن محمدؑ (امام جعفر صادقؑ) نے حدیث بیان کی) کہتے تھے۔ بعض منابع میں آپ کے شاگردوں اور آپ سے حدیث سننے والوں کی تعداد تقریباً

چار ہزار بیان کی گئی ہے۔"

ابوزہرہ لکھتے ہیں:

"اپنے تمام تر گروہی اختلافات کے باوجود علمائے اسلام کے درمیان امام صادقؑ کے علم وفضل کے بارے میں اتفاق پایا جاتا ہے۔"

"ملل ونحل" جیسی مشہور کتاب کے مصنف شہرستانی، امامؑ کی علمی اور اخلاقی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپؑ دینی مسائل ومعاملات میں بے پایاں علم ودانش، حکمت میں ادب کامل، دنیاوی معاملات اور اس کے زرق وبرق کے بارے میں انتہائی زہد کے مالک اور نفسانی شہوتوں سے مکمل طور پر دور رہنے والے تھے۔"

مشہور مورخ ابن خلکان آپ کے بارے میں کہتا ہے:

"آپؑ مذہب امامیہ کے بارہ میں سے ایک امام اور اہل بیت رسولؐ کے ایک بزرگ تھے۔ آپ اپنی صداقت سخن کی وجہ سے صادق کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کا علم وفضل اتنا مشہور ہے کہ محتاج بیان نہیں"

شیخ مفید علیہ الرحمہ آپؑ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"علمائے اسلام نے اہل بیتؑ میں سے کسی سے بھی آپؑ کے برابر حدیثیں نقل نہیں کی ہیں۔"

ایک سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات یہ ہے کہ فقہ کی تدوین کا کام وفات پیغمبرؐ کے کافی عرصہ بعد شروع ہوا۔ اس تدوین کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث پیغمبر قرار پائی۔ قرآن مجید تو بلاشبہ حضور اکرمؐ کی حیات مبارک میں مکمل اور مدون ہو چکا تھا لیکن احادیث جمع ہونے کے کام میں بہت سی دشواریاں تھیں۔ کبھی انہیں جمع ہونے سے روک دیا گیا تو کبھی جمع شدہ

احادیث کو جلانے کا حکم دے دیا گیا۔ خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت نے وہ من مانیاں کیں کہ الامان و الحفیظ۔ چنانچہ حدیث سازی کی فیکٹریاں کھل گئیں۔ اب اس ماحول میں فقہائے اکرام نے کس طرح ان احادیث سے استنباط کر کے فقہ مرتب کی ہوگی، اس کا اندازہ بہت آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس ماحول میں امام جعفر صادقؑ نے فقہ کی تدوین اور احکامات نبوی کو اصل حالت میں جمع کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ کیوں کہ اس وقت ان کے اور ان کے اجداد کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو دیانت اور امانت کے جذبہ سے قرآن کی تطبیق اور احادیث کی احسن طریقہ سے جمع آوری کر سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس عظیم ذمہ داری کو کمال دیانت کے ساتھ پورا کیا۔

امامؑ کے تعارف کے بعد آپؑ کے کام کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے۔ آل محمدؑ کا سینہ علوم الٰہیہ کا مخزن تھا۔ اولین ائمہ کو اتنے شدائد میں مبتلا رکھا گیا کہ بظاہر وہ ان علوم کی ترویج اس طرح کھل کر نہ کر سکے جیسے کہ جناب امام جعفر صادقؑ نے فرمائی۔ آپؑ نے نہ صرف دینی علوم کا احیاء کیا بلکہ دیگر علوم خصوصاً سائنسی علوم کی وہ گتھیاں سلجھائیں جو اس وقت کے بڑے بڑے نامور لوگ نہ کر سکے تھے۔ ان عنوانات پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کیسے کیسے امور پر آپؑ کی نظر تھی۔ مثلاً زمین کی گردش، تخلیق کائنات، عناصر اربعہ، ہائیڈروجن، نظریۂ اضداد، نظریۂ روشنی، انسانی ڈھانچے کی ساخت، ستاروں کی روشنی، علم طب، انسانی عمر، ماں کی گود، علوم جدید، آلودگی، قوانین فطرت، ہر شے متحرک ہے، مفید بیکٹیریا، سائنس اور فلسفہ، ادب، چشمہ کی مخالفت، طبعی موت، آواز کی رفتار، اللہ کا دن، وحدت الوجود، دین اور فلسفہ، تحویل قبلہ، خودکشی، اللہ کا دیدار، بڑھاپا، دنیا کا خاتمہ، حریص لوگ، کردار سازی، زمانہ کا تصور، علم جفر وغیرہ وغیرہ۔ ان علوم کے علاوہ علم مناظرہ، فتنۂ کیسانیا، خطابیہ، خوارج، معتزلہ، خوارج وغیرہ علیحدہ ہیں۔

ان علوم پر آپ کی بہت سی تحریریں موجود ہیں جن کا بیان کرنا اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ صرف چیدہ چیدہ عنوانات پر آپؑ کی تحریروں کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

نظریہ روشنی:

امام جعفر صادقؑ کے علمی کمالات میں سے ایک ان کا نظریہ روشنی (لائٹ تھیوری) بھی ہے۔ آپ نے فرمایا: روشنی چیز کی طرف سے انسانی آنکھوں میں آتی ہے۔ وہ روشنی جو اشیاء سے ہماری آنکھوں کی طرف آتی ہے اس کا صرف کچھ حصہ ہماری آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے، جس کی وجہ سے ہم دور کی چیز کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتے۔ اگر وہ تمام روشنی جو ایک دور کی چیز سے ہماری آنکھوں کی طرف آئے اور پتلی تک پہنچ جائے تو ہم دور کی چیز کو نزدیک دیکھ سکیں گے اور اگر کوئی ایسا آلہ بنایا جائے جو ایک چیز سے خارج ہونے والی تمام روشنی کو آنکھوں کی پتلی تک پہنچا سکے تو ہم نہایت دور کی چیزیں بھی آسانی کے ساتھ دیکھ سکیں گے۔

آپ کی یہی تھیوری مشرق و مغرب میں برسوں مروج رہی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور استاد راجر بیکن بھی یہی تھیوری پڑھاتا رہا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر دنیا کی پہلی دوربین ایجاد ہوئی اور اس دوربین کو ترقی دے کر گلیلو نے فلکی دوربین ایجاد کی جس کی مدد سے رات کو آسمان پر ستاروں کا مشاہدہ ممکن ہوا۔ عطارد، زُھرہ اور مشتری کے مشاہدات کے بعد ہی کوپرنیکس اور کیپلر کے نظریات کی تصدیق ہو سکی۔

عناصرِ اربع:

ارسطو نے کہا تھا کہ کائنات میں چار عناصر پائے جاتے ہیں، مٹی، پانی، آگ اور ہوا۔ صدیوں تک اس تصور کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ لیکن امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے عناصر موجود ہیں اور اس میں جتنی دھاتیں ہیں وہ سب

ایک علیحدہ عنصر ہیں۔اسی طرح آپ نے فرمایا کہ ہوا میں چند ایسے اجزا ہوتے ہیں جن کی موجودگی سانس کے لئے اشد ضروری ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے مزید فرمایا ہے کہ" جو کچھ خاک میں ہے وہ آدمی کے بدن میں بھی موجود ہے اس طرح سے کہ ان میں سے چار اجزا زیادہ، آٹھ ان سے کم اور دیگر آٹھ ان سے بہت کم ہیں۔(تفصیل کے لئے کتاب" امام جعفر صادقؑ اور سائنسی انکشافات" صفحہ ۱۰۹ ملاحظہ فرمائیں)۔

زمین کی گردش:

امام جعفر صادقؑ ستاروں کے میکانکی قوانین سے آگاہ تھے اور قوت جاذبہ سے آشنا تھے۔یعنی مرکز کی طرف مائل اور گریز کرنے والی قوتوں سے آشنا تھے۔مرکز کی طرف مائل کرنے والی قوت ہی کی وجہ سے سیارے اپنے محور پر گردش کرتے ہیں۔

تخلیق کائنات:

آپؑ نے فرمایا" دنیا ایک چھوٹے سے ذرے سے وجود میں آئی اور وہ بھی دو متضاد قطبین سے مل کر بنتا ہے اور اس طرح مادہ وجود میں آیا۔پھر مادہ کی مختلف اقسام بن گئیں۔یہ اقسام مادے میں ذرات کی زیادتی یا کمی کا نتیجہ ہیں۔"

بڑھاپا:

امام جعفر صادقؑ سے جابر بن حیان نے پوچھا، آدمی بوڑھا ہو جانے کے بعد منکسر المزاج کیوں ہو جاتا ہے؟

آپ نے فرمایا، یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے۔ہر بوڑھا شخص منکسر المزاج نہیں ہوتا، کچھ لوگ بڑھاپے میں چڑچڑے ہو جاتے ہیں جب کہ کچھ لوگ جوانی میں بھی منکسر المزاج نہیں ہوتے۔دراصل بڑھاپے میں لوگوں کی عقل اور تجربہ جوانی سے زیادہ ہوتا ہے۔زندگی

کی باتیں وہ کچھ بہتر انداز میں سمجھنے لگتے ہیں چنانچہ ان میں تحمل اور انکسار آ جاتا ہے۔ان کی عقل طاقتور ہو جاتی ہے اور وہ بے لوث ہو کر عدل قائم کرتے ہیں۔انہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ انہیں ہمیشہ حقیقت کا حامی ہونا چاہیے۔

جابر نے پوچھا، بڑھاپا نسیان پیدا کرتا ہے۔کیا یہ کلی قاعدہ ہے؟ امامؑ نے فرمایا: نہیں اے جابر! جو چیز نسیان پیدا کرتی ہے وہ حافظے کی طاقت کا عدم استعمال ہے۔حافظے کی قوت کو دوسری انسانی قوتوں کی مانند کام میں لاتے رہنا چاہیے تاکہ زائل نہ ہو۔اگر ایک جوان آدمی بھی اپنی قوت حافظہ کو کام میں لانا چھوڑ دے تو وہ بھی نسیان کا شکار ہو جائے گا لیکن بعض عمر رسیدہ اشخاص اس لئے فراموشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جسمانی طاقت کی کمزوری کے نتیجہ میں ان کی توجہ ان کے ماحول کی نسبت جس میں وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں کم ہو جاتی ہے۔زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی ان کی شمولیت کم ہو جاتی ہے۔وہ جمود کے شکار ہو جاتے ہیں۔ان کا حافظہ مزید استعمال نہیں ہوتا۔چنانچہ وہ بھی جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور ان کے حافظے کے ذخائر کا تمام یا کچھ حصہ فراموشی کے سپرد ہو جاتا ہے۔ بوڑھے جمود کا شکار نہیں ہوتے وہ نسیان کا شکار بھی نہیں ہوتے۔

سورج کے بارے میں:

امامؑ نے فرمایا: ”آفتاب کے طلوع و غروب کی حکمت پر غور کرو، جس سے شب و روز کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔اگر سورج طلوع نہ ہو تو یہ سارا عالم ویرانہ بن جائے۔پھر لوگ اپنے معاش کی تگ و دو کے لئے مصروف عمل نہ ہو سکیں۔نہ اپنے معاملات پر کسی طرح کا تصرف رکھ سکیں۔یہ دنیا یکسر ان کے لئے خانہ تاریک بن جائے۔لذت نور سے محروم ہو جانے کے بعد ان کی زندگی وبال جان بن جائے۔

اور ذرا غروب آفتاب کی منفعت پر غور کرو۔اگر آفتاب غروب نہ ہو تو لوگ سکھ کی نیند

کس طرح سوئیں؟ انہیں سکون و اطمینان کی نعمت کیونکر حاصل ہو؟ حالانکہ وہ سکون و اطمینان کے بہت زیادہ حاجت مند ہیں۔ وہ رات ہی ہے، جس سے ان کا بدن سکون حاصل کرتا اور ان کے تمام حواس آرام پاتے ہیں۔ جب لوگ غروب آفتاب کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر اپنے بدن کو سکون اور آرام پہنچا لیتے ہیں تو صبح کو تازہ دم ہو کر کام کاج کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اگر سورج غروب نہ ہو ہمیشہ جگمگاتا ہی رہے تو یہ زمین حرارت آفتاب کے تسلسل و دوام کے باعث کرہ نار بن جائے۔ پس اللہ نے اپنی حکمت و تدبیر سے طلوع و غروب کے اوقات مقرر کر دیئے ہیں۔ وقت مقررہ پر وہ طلوع ہوتا ہے اور وقت مقررہ پر غروب ہو جاتا ہے۔ جیسے تم دیکھتے ہو کہ جب گھر والوں کو ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ چراغ جلا لیتے ہیں اور جب ضرورت نہیں دیکھتے تو بجھا دیتے ہیں۔ پس نور و ظلمت اپنے ظاہری تضاد کے باوجود دنیا کی صلاح و فلاح اور استحکام نظام کا سب سے بڑا اور واضح مظہر ہے۔

اور پھر ذرا سورج کے ارتفاع و انحطاط پر غور کرو۔ اسی ارتفاع و انحطاط پر سال کے چاروں موسم بنتے ہیں۔ یہ ارتفاع و انحطاط اپنے اندر تدبیر و مصلحت کی ایک دنیا پوشیدہ رکھتے ہیں۔

موسم سرما میں شجر و نباتات میں حرارت پیدا ہوتی ہے جس سے ان میں مواد ثمر پیدا ہوتا ہے۔ ہوا کثیف ہو جاتی ہے اس سے بادل اٹھتے ہیں اور بارش ہوتی ہے۔ جانداروں کے بدن میں قوت آتی ہے اور ان میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔

موسم ربیع میں تحریک ہوتی ہے اور موسم سرما میں مواد پیدا ہوتا ہے۔ وہ اب نمایاں ہو جاتا ہے۔ نباتات سر اٹھاتی ہیں۔ درختوں پر رونق آجاتی ہے۔ جانداروں میں جذبات کا

ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ خریف کے موسم میں ہوا صاف ہو جاتی ہے۔ امراض دور ہو جاتے ہیں بدن حسین ہو جاتا ہے۔ ہوا خوش گوار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے فوائد ہیں جن سے دنیا بہرہ ور ہوتی ہے۔

اسی طرح ذرا اس پر غور کرو کہ سورج بارہ برجوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے تا کہ سال کا دورہ پورا ہو جائے۔ اس دورے سے زمانہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

یہ تو تھے سائنسی علوم۔ اب ذرا امام کے عرفانی علم کا ایک مختصر سا بیان:

نماز کی باریکیوں اور اس کے باطنی اسرار پر سے آپؑ اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں۔

آپؑ نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگو تو کہو: اے اللہ میں اپنی حاجتوں کی سفارش کے لئے حضور اکرمؐ کو تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں اور ان ہی کے وسیلے سے تیرے روبرو آیا ہوں۔ لہٰذا ان ہی کا واسطہ تو مجھے دنیا اور آخرت میں آبرومند بنا دے اور مجھے مقربین میں شمار کر، میری نماز کو قبول فرما، میرے گناہوں کو بخش دے، میری دعا کو مستجاب کر، بے شک تو غفور و رحیم ہے۔

اور جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو پورے سکون و وقار کے ساتھ کھڑے ہو، جلد بازی نہ کرو۔ تمھارے اندر شکم سیری، کسل مندی و سستی نہ ہو، اونگھ نہ آتی ہو اور جب تم نماز شروع کرو تو تم پر خشوع و خضوع اور نماز پر پوری توجہ لازم ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الذین هم فی صلاتهم خاشعون (وہ لوگ جو اپنی نماز میں خدا کے سامنے گڑگڑاتے ہیں) (مومنون۔ آیت ۲) نیز ارشاد ہوتا ہے: وانها لكبيرة" الا على الخشعين (البتہ نماز دوبھر تو ہے مگر خشوع کرنے والوں پر نہیں) (سورہ بقرہ۔ آیت ۴۵)۔

اور اپنا چہرہ قبلہ کی طرف رکھو۔ قبلہ سے نہ پھیرو ورنہ نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور بالکل سیدھے کھڑے ہو، اس لئے کہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ جو نماز میں سیدھا کھڑا نہ ہوگا اس

کی نماز ہی نہ ہوگی اور نگاہ نیچی رکھو، آسمان کی طرف نہ اٹھاؤ۔ تمھاری نگاہ سجدہ گاہ پر ہونی چاہیے۔ اپنے دل کو نماز میں مشغول رکھو، اس لئے کہ تمھاری نماز میں سے صرف اتنا ہی حصہ قبول ہوگا جو تم نے رجوع قلب کے ساتھ پڑھا۔ یہاں تک کہ بندے کی نماز میں سے کبھی ایک چوتھائی، کبھی ایک تہائی اور کبھی نصف نماز قبول ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مومنین کے لئے اس کو نوافل سے پورا کر دیتا ہے اور تم نماز میں اس طرح کھڑے ہو جیسے کوئی عبد ذلیل کسی صاحب جلال بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور یہ سمجھو کہ تم اس کے سامنے کھڑے ہو جو تمھیں دیکھ رہا ہے اور تم اس کو نہیں دیکھتے اور اس طرح نماز نہ پڑھ سکو گے اور اپنی داڑھی اور اپنے سر اپنے ہاتھوں سے عبث شغل نہ کرو۔ اپنی انگلیوں کو نہ چٹخاؤ۔ اپنے پاؤں کو آگے پیچھے نہ کرو، ان کو برابر رکھو اور ان کے درمیان تین انگلی سے لے کر ایک بالشت تک کا فاصلہ رکھو، نہ انگڑائی لو نہ جماہی لو اور نہ ہنسو، اس لئے کہ قہقہے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ سرین (کولھوں) کے بل نہ بیٹھو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے سرین کے بل بیٹھنے والی ایک قوم پر عذاب نازل کیا تھا کہ جن میں سے ایک نے نماز کی تھکن کی وجہ سے اپنے دونوں سرینوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لئے تھے اور حالت قیام میں اپنے سینے پر ہاتھ نہ باندھو، ایسا مجوسی کیا کرتے ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھ چھوڑ کر انہیں اپنی رانوں پر اپنے گھٹنوں کے سامنے رکھو۔ بہتر یہ ہے۔ چنانچہ اپنی نماز میں یہ اہتمام کرو اس سے غافل نہ رہو، اس لئے کہ اگر تم نے ہاتھ کو حرکت دی تو وہ تم کو کھیل میں مصروف کر دیں گے۔۔۔۔۔۔

نماز کی اتنی جزیات، اس کی باریکیاں اور اصل سنت کی نشان دہی جیسی امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمائی، کوئی نہیں فرما سکتا۔

قصہ مختصر حضرت امام جعفر صادقؑ نے علم و عرفان کے وہ دریا بہائے ہیں جن کا ادراک ایک عام ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔

مآخذ

(۱) ''امام علم وعرفان سیدنا جعفر صادقؑ'' تالیف آغا امیر حسین۔

(۲) ''امام جعفر صادقؑ اور سائنسی انکشافات'' (۲۵ عالمی دانشوروں کی تحقیقات کا مجموعہ ترجمہ مولانا سید محمد باقر جوراسی، تصحیح وترتیب سید محمد علی اجہدی)۔

(۳) ''چراغ راہ'' از علامہ سید عقیل الغروی۔

(۴) ''ائمہ اہل بیت علیہم السلام۔ فکری وسیاسی زندگی'' از رسول جعفریان۔

(۵) ''من لا یحضرہ الفقیہ'' از شیخ صدوق علیہ الرحمہ۔

اسیر بے جرم

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ

بس اتنی ہی مری تقدیر بدلی
کبھی زنداں کبھی زنجیر بدلی

امامِ ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۷/صفر ۱۲۸ھ ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں چونکہ ایام عزا یکم محرم الحرام سے ۸/ربیع الاول تک منائے جاتے ہیں اور امامِ ہفتم کی تاریخ ولادت اس دوران آجاتی ہے اس لئے آپ کی ولادت پر محافل آراستہ نہیں کی جاتیں۔ آپ کا نامِ نامی موسیٰ اور لقب کاظم ہے۔ ابوالحسن، ابوابراہیم، العبد الصالح اور العالم آپ کی مشہور کنیات ہیں۔ آپؑ نے علم و عرفان و فقہ اسلامی کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ المیہ یہ ہے کہ آپ کی عمر عزیز کے چودہ سال ہارون رشید عباسی کے زندان ستم میں گزر گئے۔ حضرت مرزا دبیرؒ فرماتے ہیں:

مولا پہ انتہائے اسیری گزر گئی
زندان میں جوانی و پیری گزر گئی

طبریؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ کے لوگ آپ کو عبادت الٰہی کے سلسلے میں کوشاں لوگوں کی زینت کہا کرتے تھے۔ شیخ مفیدؒ فرماتے ہیں کہ ابوالحسن موسیٰ کاظمؑ اپنے زمانے کے عابد ترین، فقیہ ترین، سخی ترین اور معزز ترین انسان تھے۔ ابن ابی الحدید نے آپؑ کے بارے میں لکھا کہ آپؑ فقاہت، دیانت، عبادت اور حلم و صبر کا مجموعہ تھے۔ یعقوبی لکھتے ہیں کہ موسیٰ

بن جعفرؑ اپنے زمانے کے عابد ترین انسان تھے۔ شذرات الذہب میں ہے کہ آپ صالح، عابد، سخی، حلیم اور عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے۔ اسی میں ابو حاتم کا یہ قول بھی ہے، کہ آپ ثقہ اور مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ یافعی کا بیان ہے کہ آپ صالح، عابد، سخی اور حلیم تھے۔ ابن الجوزی نے ایک روایت نقل کی ہے جسے ابن حجر ہیثمی نے بھی نقل کیا ہے۔ روایت میں بیان ہوا ہے کہ سن ۱۴۹ ہجری میں سفرِ حج کے دوران شقیق بلخی کی امامؑ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کئی بار امامؑ سے ایک بات پوچھنے کی کوشش کی اور امامؑ نے ہر مرتبہ ایک آیت کی تلاوت فرما کے اس کے دل میں چھپی بات کو آشکارا کر دیا۔ آپؑ کی سخاوت اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ یہ آپؑ کی پہچان اور ضرب المثل بن گئی تھی۔ آپؑ اپنے ساتھ پیسوں سے بھری تھیلیاں رکھا کرتے تھے اور انہیں دوست و دشمن سب کو بلا تخصیص تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے اس بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کو موسیٰؑ سے کتنی محبت ہے تو آپ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ موسیٰ کے سوا میرا کوئی اور بیٹا نہ ہوتا، تاکہ کوئی اس سے میری محبت میں شریک نہ ہوتا۔

ہارون الرشید نے ربیع سے آپؑ کے بارے میں کہا کہ یہ شخص بنی ہاشم کے راہبوں میں سے ہے۔ ربیع نے کہا پھر اس کو قید کیوں کیا ہوا ہے؟ ہارون نے کہا "افسوس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" حقیقت بھی یہی ہے کہ ہارون آپؑ کے علم و عرفان کے آگے بے بس تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ علم و عرفان کی برتری کی بنیاد پر آپؑ کا اثر و رسوخ عوام میں قائم ہو جائے۔ ایک روایت جسے عیاشی اور شیخ مفیدؒ نے نقل کیا ہے میں ہارون اور امامؑ کے مابین یہ مکالمات درج ہیں:

ہارون نے پوچھا: یہ دنیا کیا ہے؟ اور کن لوگوں کے لئے ہے؟ آپؑ نے فرمایا: یہ ہمارے شیعوں کے لیے سکونِ قلبی کا باعث اور دوسروں کے لیے سبب امتحان ہے۔

ہارون نے پوچھا: تو کیوں اس کا مالک اسے اپنے اختیار میں نہیں لے لیتا؟ آپؑ

نے ارشاد فرمایا: جب یہ آباد تھی تو اس سے چھین لی گئی اب جب یہ آباد ہو جائے گی تو اس کا مالک اسے اپنے اختیار میں لے لے گا۔

اس نے کہا: آپؑ کے شیعہ کہاں ہیں؟ آپؑ نے جواب میں سورۂ بیّنہ کی آیت تلاوت فرمائی: ”کافروں میں سے اہلِ کتاب اور مشرک (اپنے کفر سے) دستبردار ہونے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس خدا کے پاس سے ایک روشن دلیل آ گئی۔“

ہارون بولا: اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم کافر ہیں؟ فرمایا نہیں، لیکن ایسے ہی ہو جیسے خدا نے فرمایا ہے کہ ”کیا آپ ان کو نہیں دیکھتے جنہوں نے خدا کی نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال دیا۔“ (سورۂ ابراہیم آیت ۲۸)

اس پر ہارون کو طیش آ گیا اور آپؑ کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظمؑ سے سوال کیا کہ آپ کس طرح کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کی ذریّت میں سے ہیں، حالانکہ نبیؐ کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اور آپ لوگ ان کی بیٹی کی اولاد ہیں؟ امامؑ نے اس کے سامنے دو دلیلیں پیش کیں۔ پہلی سورۂ انعام کی آیت ۸۵، جو حضرت عیسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ کا بیٹا قرار دیتی ہے اور دوسری آیۂ مباہلہ (آلِ عمران آیت ۶۱) کہ جس میں حضراتِ حسنینؑ کو ”اَبنَاءَنا“ کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات عباسیوں پر بہت گراں گزرتی تھی جو خود رسول اللہؐ کے چچا (حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی اولاد) تھے۔ یہ لوگ اس رشتے کی بنیاد پر اپنی خلافت جتاتے تھے۔

امامؑ سے منقول ایک روایت میں ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ”فقہا انبیا علیہم السلام کے امین ہیں، جب تک وہ دنیا میں داخل نہ ہو جائیں۔“ سوال کیا گیا کہ وہ کیسے دنیا میں داخل ہوں گے؟“ حضرتؑ نے فرمایا: ”حکمرانوں کی پیروی کے ذریعے۔ جب ایسا ہو تو اپنے دین کے معاملے میں ان سے ڈرو۔“

وہ علما اسی قسم کے تھے جنہیں ہارون رشید نے امامؑ کی شہادت کے موقع پر بلایا، اور ان سے کہا کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ امامؑ کی موت طبعی طور پر واقع ہوئی ہے۔ اس طرح اس نے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ان کی ساکھ سے فائدہ اٹھایا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے شیعوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ اپنا ظاہر سجا سنوار کر رکھا کریں اور اپنی سماجی حیثیت کی حفاظت کیا کریں۔ صفوان بن مہران جمّال کے ساتھ امامؑ کی ملاقات کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ ایک شیعہ کی حیثیت سے امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں شرف یاب ہوا تو امامؑ نے اس سے فرمایا:

''اے صفوان! تمہارے سارے کام اچھے ہیں سوائے ایک کام کے۔''

صفوان نے پوچھا ''فرزند رسولؐ وہ کون سا کام ہے؟''

امامؑ نے فرمایا: ''یہی کہ تم اپنے اونٹ اس شخص (یعنی ہارون) کو کرائے پر دیتے ہو۔''

صفوان نے کہا: ''میں اسے اپنے اونٹ تفریح یا شکار وغیرہ کے لئے کرائے پر نہیں دیتا، بلکہ اسے صرف حج کے سفر کے لئے دیتا ہوں۔ اس کام میں بھی وہ خود براہِ راست سامنے نہیں آتا بلکہ اس مقصد کے لئے دوسروں کو اپنا اجیر بناتا ہے۔''

امامؑ نے کہا: ''کیا تمہارے خیال میں اسے اپنے اونٹ کرائے پر دینا درست ہے؟''

صفوان نے کہا: ''ہاں!''

امامؑ نے کہا: ''کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ وہ تمہارا کرایہ ادا کرنے تک زندہ رہے؟''

صفوان نے کہا: ''ہاں''

امامؑ نے فرمایا: ''جو کوئی ان کے زندہ رہنے کو پسند کرے وہ انہی میں شمار ہوگا اور جو ان میں شمار ہوگا وہ جہنم میں جائے گا۔''

اس کے بعد صفوان نے اپنے تمام اونٹ فروخت کر دیئے اور جب ہارون نے اس کا

سبب دریافت کیا تو اسے جواب دیا کہ: ''اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرے غلام خاطر خواہ طور پر یہ کام نہیں کر پاتے ہیں۔''

ہارون نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ تم نے کس کے اشارے پر اپنے اونٹ فروخت کیے ہیں۔ موسیٰ ابن جعفرؑ نے تمہیں ایسا کرنے کو کہا ہے۔'' صفوان نے کہا: ''مجھے موسیٰ ابن جعفرؑ سے کیا واسطہ''! ہارون بولا: ''یہ باتیں چھوڑو! خدا کی قسم اگر تمہارا حسنِ مصاحبت میرے پیشِ نظر نہ ہوتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔''

ان ہی جناب ابراہیم جمال اور جناب علی بن یقطینؒ جو ہارون رشید کے وزیر تھے کا ایک واقعہ مفاتیح الجنان میں اس طرح درج ہے، جو حقوق العباد کے سلسلے میں ہے:

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں ایک روایت عیون المعجزات سے نقل کی ہے کہ ابراہیم جمال جو شیعانِ علیؑ میں سے تھے نے چاہا کہ علی بن یقطینؒ جو ہارون رشید کے وزیر تھے سے ملاقات کریں۔ چونکہ ابراہیم ساربان تھے اور وہ وزیر تھے اور ان کی ظاہری شان اتنی نہ تھی کہ وہ وزیر کے دربار میں حاضر ہوتے تو انہیں کسی نے علی بن یقطینؒ کے پاس جانے نہ دیا۔ اسی سال علی بن یقطینؒ حج کرنے کے لئے گئے اور بعد میں مدینہ منورہ بھی آئے تو چاہا کہ اپنے امام جناب امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں۔ اجازت طلب کی تو امامؑ نے انہیں اجازت نہ دی۔ دوسرے دن ان کی ملاقات حضرتؑ سے دروازے پر ہو گئی تو عرض کرنے لگے کہ اے میرے آقا مجھ سے کون سا قصور ہو گیا کہ مجھے آپؑ نے اپنے پاس آنے کی اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ آپؑ نے فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ تم نے اپنے ایک بھائی ابراہیم جمال کو اپنے پاس نہیں آنے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ تمہاری سعی اور کوشش کو قبول کرنے سے انکار فرماتا ہے، جب تک کہ تمہیں ابراہیم معاف نہ کرے۔ علی بن یقطین عرض کرنے لگے' اے میرے آقا میں ابراہیم سے اس وقت کہاں مل سکتا ہوں۔ میں اب

مدینہ میں ہوں اور وہ کوفہ میں۔ آپؑ نے فرمایا کہ جب رات ہو جائے تو تم اکیلے بقیع چلے جانا۔ تمھارے جانے کا تمھارے غلام اور رفقاء کو پتہ نہ چلے۔ وہاں تمھیں ایک اونٹ مع پالان نظر آئے گا۔ اس پر سوار ہو جانا اور کوفہ چلے جانا۔ علی بن یقطین رات کو تنہا بقیع گئے اور وہاں اسی طرح کا اونٹ دیکھا اس پر سوار ہوئے اور ذرا سی دیر میں کوفہ ابراہیم جمال کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اونٹ کو بٹھلایا اور ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابراہیم نے کہا کون ہے ،انہوں نے جواب دیا کہ میں علی بن یقطین ہوں وہ کہنے لگے کہ علی بن یقطین کو میرے دروازے پر کیا کام ہے۔ آپ نے کہا، آپ باہر تو آیئے کہ میرا معاملہ بہت بڑا ہے اور قسم دینے لگے کہ آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں۔ جب اندر گئے تو کہنے لگے اے ابراہیم میرے مولیٰ اور آقا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تیرا عمل قبول نہیں ہوگا جب تک کہ تجھ سے ابراہیم راضی نہیں ہوگا۔ وہ کہنے لگے کہ اللہ آپ کو معاف فرمائے یعنی میں نے آپ کو معاف کیا۔ لیکن علی ابن یقطین نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے چہرے کو خاک پر رکھ دیا اور ابراہیم کو قسم دی کہ اپنے پاؤں کو ان کے چہرے پر رکھ کر خوب ملیں اور دبائیں (تا کہ اپنے تکبر کا نتیجہ معلوم ہو)۔ پہلے تو ابراہیم نے اس کام کو کرنے سے انکار کیا مگر جب علی بن یقطین نے انہیں قسم دی کہ وہ ایسے ہی کریں تو ابراہیم نے اپنے پاؤں کو علی بن یقطین کے چہرے پر رکھ کر اسے ملا۔ علی بن یقطین اس وقت کہہ رہے تھے کہ اے میرے اللہ تو گواہ رہنا۔ اس کے بعد وہاں سے آئے اور اونٹ پر سوار ہو کر اسی رات مدینہ واپس پہنچے اور اونٹ کو امام موسیٰ کاظمؑ کے دروازے پر بٹھایا تو اس وقت آپؑ نے انہیں اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے بعد حضرتؑ نے ان چیزوں کو قبول کیا جو وہ آپ کو دینا چاہتے تھے۔ (اس واقعہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن بھائیوں کے کتنے حقوق ہیں۔ ہم اپنے مومن بھائیوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے ،نتیجتاً نہ ہمارے امامؑ ہم سے راضی ہوتے ہیں اور نہ ہی

اللہ ہمارے اعمال کو قبول فرماتا ہے۔)

اخلاق واوصاف:

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس مقدس سلسلہ کے ایک فرد تھے جس کو پروردگار عالم نے بنی نوع انسان کے لئے معیار کمال قرار دیا ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں بہترین اخلاق واوصاف کا مرقع تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض افراد میں بعض اوصاف اتنے ممتاز نظر آتے ہیں کہ سب سے پہلے انسان کی نظر ان پر پڑتی ہے۔ چنانچہ ساتویں امام میں تحمل وبرداشت اور غصہ ضبط کرنے کی صفت اتنی نمایاں تھی کہ آپ کا لقب کاظم قرار پایا جس کے معنی ہی غصہ کو پینے والا ہے۔ کسی نے آپ کو کبھی ترش روئی یا سختی سے بات کرتے نہیں دیکھا اور انتہائی ناسازگار وناگوار حالات میں بھی مسکراتے ہوئے نظر آئے۔

علمی اور دینی خدمات:

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آپ کو انتہائی پرآشوب زمانہ ملا تھا۔ نہ اس وقت وہ علمی دربار قائم رہ سکتا تھا جو امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں قائم رہ چکا تھا نہ کسی ذریعہ سے دین کی تبلیغ واشاعت ممکن تھی۔ تاہم مدینہ میں قیام کے دوران علماء، فقہاء اور محدثین کی ایک کثیر تعداد (جو آپ کے والد بزرگوار کے شاگردوں پر مشتمل تھی) آپ کے گرد جمع ہوگئی۔ لہٰذا آپ نے زبردست حوصلے اور ولولے کے ساتھ ان لوگوں کو اسلامی فقہ اور تعلیمات سے مالا مال کیا۔ احکام شریعت کے بہت سے مجموعے آپ ہی سے منسوب ہیں جو فقہ وحدیث کی بڑی بڑی کتابوں کی صورت میں مدون ہو چکے ہیں۔ علماء اور راویان احادیث ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے اور آپ کی حدیثوں، علمی بحثوں اور نظریات کو لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ سید ابن طاؤس نے روایت کی ہے کہ آپ کے اصحاب وخواص آپ کی مجالس میں اس طرح حاضر ہوتے تھے کہ ان کی آستینوں میں آبنوس یا آملے کی تختیاں ہوتی تھیں۔ جب بھی کوئی

جملہ امامؑ کی زبان سے نکلتا تھا یا کسی معاملے میں آپ فتویٰ صادر فرماتے تو لوگ اسے لکھ لیتے تھے۔ ان علماء نے آپ سے ہر قسم کے علوم نقل کئے ہیں اگرچہ وہ علوم ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر ان کا دامن نہایت وسیع ہے۔

موت کے معنی:

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا کہ ان کے والد ماجد حضرت امام جعفر صادقؑ سے کسی نے پوچھا کہ ہمارے لئے موت کی صفت بیان فرمایئے۔ جواب میں آپؑ نے فرمایا: ''مومن کے لئے موت خوشبو کی مانند ہے کہ جب اسے سونگھتا ہے تو اس خوشبو کی وجہ سے اونگھنے لگتا ہے اور سارا رنج و الم اس سے منقطع ہو جاتا ہے اور کافر کے لئے سانپ کے ڈسنے، بچھو کے کاٹنے کی طرح ہے یا اس سے بھی شدید تر۔'' کہا گیا: ایک قوم کہتی ہے کہ موت آریوں سے چیرنے، قینچیوں سے کاٹنے، پتھروں سے توڑنے اور آنکھوں کی سیاہی میں چکی کے پاٹوں کے گھومنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ آپؑ نے فرمایا: ''بات اسی طرح سے ہے۔ بعض کافروں اور فاجروں پر ایسا ہی ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جو (دنیا میں) ان سختیوں کا سامنا کرتے ہیں اور یہ اس (موت کی سختی) سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے سوائے آخرت کے عذاب سے۔ تو یہ (عذاب آخرت) دنیا کے عذاب سے زیادہ سخت ہے۔'' کہا گیا: تو ہم کیوں یہ دیکھتے ہیں کہ کافر پر نزع آسان ہوتا ہے اور وہ دنیا سے اس طرح رخصت ہوتا ہے کہ خبر دے رہا ہوتا ہے، ہنس رہا ہوتا ہے اور کلام کر رہا ہوتا ہے اور مومنین میں سے بھی بعض اسی طرح ہوتے ہیں اور مومنین اور کافروں میں سے ایسے بھی ہیں جو سکرات کے وقت یہ تکلیفیں برداشت کرتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: ''مومن کے لئے جو راحت وہاں ہے وہ اس کے ثواب کا جلدی آنا ہے اور جو کچھ سختی ہوتی ہے تو یہ اس کو گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتی ہے کہ آخرت میں پاک اور صاف

وارد ہوتا کہ ابدی ثواب کا مستحق قرار پائے، اس کے لئے اس کے علاوہ کوئی رکاوٹ نہ ہو جب کہ کافر کے لئے جو کچھ اس موقع پر سہولت اور آسانی ہے تو اس لئے کہ وہ اپنی نیکیوں کا اجر لے لیتا کہ جب آخرت میں وارد ہو تو اس کے پاس ان چیزوں کے علاوہ کچھ نہ ہو کہ جو عتاب و سزا کا سبب بنتے ہیں اور کافر کے لئے جو کچھ سختی موت کے وقت ہے تو وہ اس کی نیکیوں کا پورا حق مل جانے کے بعد اس کے لئے اللہ کے عتاب کی ابتداء ہوتی ہے اور یہ (اس لئے کہ) یقیناً اللہ عادل ہے نا انصافی نہیں کرتا۔"

شہادت:

آپ کی شہادت کے سلسلے میں جناب رسول جعفریان کی کتاب "ائمہ اہل بیت علیہم السلام۔ فکری و سیاسی زندگی" میں لکھا ہے:

اکثر مورخین کی گواہی کے مطابق امام کے شہید کئے جانے کے بارے میں تو کوئی شک نہیں پایا جاتا، لیکن کیونکہ امام کو خفیہ طور پر شہید کیا گیا تھا اور عباسی حکمرانوں نے دھوکا دہی کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ امام اپنی طبعی موت دنیا سے رخصت ہوئے ہیں لہٰذا بعض مورخین نے ان کی باتوں میں آکر اپنی کتابوں میں آپ کی موت کو طبعی تحریر کر دیا۔ ان میں سے بعض نے آپ کی شہادت کی خبر کو "کہا گیا ہے" کی عبارت کے ساتھ نقل کیا ہے۔

امام کی شہادت کی کیفیت کے بارے میں تین مختلف روایتیں نقل ہوئی ہیں

۱۔ امام کی شہادت زہر دیئے جانے سے واقع ہوئی ہے۔ یہ بات امام رضاؑ سے منقول روایت میں آئی ہے۔ اسی طرح وہ روایات جن میں امام کے قتل کا الزام یحییٰ بن خالد پر لگایا گیا ہے، ان میں بھی یہ نکتہ مذکور ہے۔

۲۔ ایک روایت میں ہے کہ امام کو ایک قالین میں لپیٹ کر اس قدر دبایا گیا کہ آپ شہید ہو گئے۔

۳۔ایک اور روایت ہے جسے مستوفی نے نقل کیا ہے۔شیعہ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید کے حکم پر پگھلا ہوا سیسہ آپؑ کے حلق میں ڈالا گیا۔

ان میں سے سب سے زیادہ مشہور روایت زہر دیے جانے والی روایت ہے۔

زہر کے ذریعہ آپؑ کو شہید کیئے جانے کی تفصیل علامہ فروغ کاظمی کی کتاب "تفسیر اسلام" میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

مورخین کا بیان ہے کہ ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بصرہ میں ایک سال تک قید رکھنے کے بعد والی بصرہ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے تحریر کیا کہ "موسیٰ ابن جعفرؑ" کو قتل کر کے ان کا قصہ تمام کر دے۔حاکم بصرہ نے اپنے مشیروں سے مشورہ کر کے جواب میں ہارون کو لکھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے اندر ایک سال کی مدت میں میں نے کوئی برائی نہیں دیکھی۔وہ دن رات نماز روزہ میں مشغول رہتے ہیں، حکومت اور عوام کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور ملک کی فلاح و بہبود کے خواہشمند ہیں۔میں ان کے قتل میں اپنے انجام کی بربادی اور اپنی عاقبت کی تباہی دیکھ رہا ہوں۔لہٰذا اس گناہ عظیم کے ارتکاب سے مجھے معاف رکھا جائے۔اس خط کی وصولیابی کے بعد ہارون رشید نے آخر میں یہ کام سندی بن شاہک کے سپرد کیا اور اسی ملعون سے زہر دلوا کر آپؑ کو شہید کرا دیا۔زہر خورانی کے بعد آپ تین دن تک جاں کنی کے عالم میں تڑپتے رہے۔اور آخر کار ۲۵ رجب ۱۸۳ھ یوم جمعہ کو درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔وقت شہادت آپ کی عمر ۵۵ سال تھی۔

شہادت کے بعد آپ کا جسد اطہر ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سمیت قید خانہ سے نکال کر بغداد کے پل پر ڈال دیا گیا۔بادشاہ ہارون کے خوف سے لوگ اس پل کی طرف جانے کی ہمت نہ کرتے تھے۔تاہم سلیمان بن جعفر کی قیادت میں شیعوں کی ایک جماعت نے آپؑ کی نعش مبارک کو دشمنوں سے مزاحمت کے بعد چھین کر غسل و کفن کا انتظام کیا اور نہایت

تزک واحتشام سے جنازہ لے کر چلے۔ان لوگوں کے گریبان غمِ امامؑ میں چاک تھے۔یہ لوگ انتہائی غم والم کے ساتھ جنازے کو لئے ہوئے جب مقبرۂ قریش میں پہنچے تو دیکھا کہ امام رضاؑ باعجاز امامت وہاں تشریف فرما ہیں۔انھوں نے نماز پڑھائی اور اپنے والد بزرگوار کو سپردخاک کیا۔تدفین کے بعد جب امام رضاؑ مدینہ واپس تشریف لائے اور شہادت کی خبر عام ہوئی تو ایک کہرام برپا ہو گیا اور تعزیت کا سلسلہ مدتوں تک جاری رہا۔

کیسا المیہ ہے۔خاندان رسالتؐ کے یہ قیمتی موتی جن کی نظیر دنیا نہ اس وقت پیش کر سکی تھی نہ اب تک کر سکی ہے، کس بری طرح امت کے مظالم کا شکار ہوئے۔انہیں تمام زندگی پریشان کیا گیا۔کبھی زندانوں میں رکھا گیا کبھی دوسرے طریقوں سے ہراساں کیا گیا۔آفرین ہے ان شخصیات پر کہ ہر طرح کی تکالیف کے باوجود کبھی حق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔امام ہفتم حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کا روضۂ اقدس بغداد کے نواحی شہر کاظمین میں ہے جہاں ان کے بعد ان کو پوتے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کو بھی شہید کرنے کے بعد دفن کیا گیا۔آج بھی کاظمین میں ۲۵ رجب کو مخصوص ہوتی ہے۔آپ کے ہزاروں چاہنے والے سارے سال اور رجب کی مخصوصی میں خاص طور سے شریک زیارت ہوتے ہیں۔آپ کے مزار اقدس کے پاس ہی اس زندان کی باقیات تھیں جن میں آپ کو طویل عرصہ قید رکھا گیا لیکن اب ان نشانیوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔کچھ ہی عرصہ پہلے، غالباً ۲۰۰۶ء میں مخصوصی کے موقع پر افواہ سازی کی سازش کے ذریعہ بھگدڑ کرائی گئی۔اس کے کچھ سال بعد ان ہی ایام میں بڑے جلوس میں بم دھماکوں سے سینکڑوں زائرین کو شہید کر دیا گیا۔لیکن یہ معصوم شہداء وہ ہیں جو تمام زندگی لوگوں کی ہدایت کا سامان کرتے رہے۔اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے رہے اور انسانیت کے چراغ روشن کرتے رہے۔

مآخذ

(۱) مفاتیح الجنان اردو (پرانا ایڈیشن) مطبوعہ امامیہ کتب خانہ، لاہور۔

(۲) تفسیرِ اسلام مولفہ علامہ فروغ کاظمی، مطبوعہ عباس بک ایجنسی، رستم نگر، درگاہ حضرت عباسؑ، لکھنو

(۳) ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام۔ فکری و سیاسی زندگی از رسول جعفریان، مطبوعہ دارالثقلین، کراچی۔

(۴) "معانی الاخبار" تالیف شیخ صدوق ابن بابویہ ابی جعفر محمد بن علی بن حسین قمی، مترجم دلاور حسین نجفی، ناشر الکساء پبلشرز کراچی)

شاہِ خراساں حضرت امام علی رضاؑ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی آلِ رسولؐ کا بظاہر تو احترام ہوتا رہا مگر بہ باطن ان کی حق تلفی اور ان پر مظالم کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کا نشانہ شہزادی فاطمہؑ سمیت تمام معصومین بنے۔ لیکن یہ ہستیاں کوئی معمولی ہستیاں نہیں تھیں، انہیں اللہ نے دین اسلام کی حفاظت اور ترویج کے لئے بطور خاص خلق فرمایا تھا۔ سو ان سب نے اپنے اپنے وقت میں حضورؐ کے لائے ہوئے دین کی اپنے اپنے طریقہ سے بھرپور حفاظت کی۔ اپنی جان، مال، اولاد کے نذرانے پیش کئے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کربلا میں تو امام حسینؑ نے وہ کارنامہ انجام دیا جسے رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا۔

امام علی رضاؑ کے بارے میں علامہ سید عقیل الغروی فرماتے ہیں:

"آپؑ کی شہادت عظمیٰ کے بعد بھی آپ کے اہلِ بیت کرام کے ساتھ حکومتِ وقت نے کیا کیا ظلم و ستم روا نہیں رکھے۔ حضرت امام زین العابدینؑ کی حیات طیبہ سے لے کر امام جعفر صادقؑ تک ہر امام کے ساتھ سیاست کارانِ وقت کی براہ راست نگرانی، نظر بندی، تفتیش و تجسس، ظالمین کے دارالخلافہ میں بار بار طلبی، توہین اور سخت گیری غرض اسائتِ ادب کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تا کہ عوام الناس ان رہنمایان معصوم سے آزادانہ طور پر استفادہ نہ کر سکیں، یہ ائمہ دین امور سیاست میں داخل نہ ہوں اور اقتدار سے دور رہیں۔ اسی سلسلہ میں امام موسیٰ کاظمؑ کی زندگی کے ۱۴ برس قید و بند میں گزرے۔ لیکن یہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے معصومانہ کردار، عوام الناس خصوصاً محروم و مقہور طبقوں کے ساتھ ان کی سچی ہمدردی اور حسن سلوک، ان کے علم اور ان کی خداداد وراثتِ نبوت، ولایت و

عصمت کا کرشمہ اور دوسری طرف سیاہ کارانِ سیاست کے مسلسل ظلم و ستم سرمایہ پرستی عیش کوشی، صاحبانِ حقوق کی حق تلفیوں اور فرائضِ حکومت سے چشم پوشیوں کا قہری نتیجہ تھا کہ ائمہ اہلِ بیت کے لیے ساری مملکت اسلامی میں عزت و احترام اور محبت و میلان بڑھتا جا رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام رضاؑ کے عہدِ حیات و دورِ امامت میں حکومتِ وقت مجبور ہوئی کہ آپؑ کے حق کو تسلیم کرے اور آپؑ کو "ولی عہدِ حکومت" نامزد کر کے عوام الناس کی خوشنودی حاصل کرے اور پھر زہر دلوا کر اپنے راستے سے ہٹائے۔ چنانچہ سیاست کارانِ وقت نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ ان کی سیاست کا اہلِ بیت پیغمبرؐ کو حکومت سے علیحدہ رکھنے کا بنیادی وقار سوا بھی محفوظ رہا اور بظاہر امامؑ کی ولی عہدی کا اعلان کر کے حکومت نے اپنی پیشانی پر محبت و مودت آلِ محمدؐ کا سہرا بھی سجا لیا۔"

امام رضاؑ کے بعض علمی ترشحات جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے انہیں علامہ صدوقؒ نے "عیون اخبار الرضا" کے نام سے ایک مجموعے میں جمع فرمایا ہے۔ جس میں آپؑ کے مختلف مناظرات، مواعظ، ملفوظات اور آپؑ کی زبان مبارک سے مروی آپؑ کے جدِ بزرگوار حضرت ختمی مرتبتؐ کے احادیث و ارشادات شامل ہیں۔

امام رضاؑ سے منسوب ایک رسالہ بعض مسائل طب و صحت کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے جو "الرسالۃ الذھبیہ" (نامۂ زریں) کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور بعض اہلِ فن حضرات نے اس کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔"

("چراغِ راہ" (شرح دعائے افتتاح) جلد اول از علامہ سید عقیل الغروی، مکتبۂ کائنات، دہلی)

حضرت امام رضاؑ ایران میں:

نیشاپور ظہورِ اسلام سے پہلے بھی علم و فضل کا مرکز تھا اور عباسیوں کے عہد میں بھی اس کے مدرسوں اور کتب خانوں کی سارے ایشیا میں دھوم تھی۔ یہاں کے علماء ساری دنیا میں

مستند مانے جاتے تھے اور طالبان علم کی ایک بڑی جماعت یہاں تحصیل علوم میں مصروف رہتی تھی۔ فاطمی گھرانے کے آٹھویں امام اور معزز شاہی مہمان کی آمد کی اطلاع پاتے ہی علماء فضلاء اور طلبا کا بڑا ہجوم استقبال کے لئے نکلا۔ امام محمل میں سوار تھے اور دونوں طرف علماء اور شرفاء ساتھ ساتھ چل رہے تھے جب یہ جلوس چوک پہنچا تو زائرین اور شائقین کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جہاں جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ ابوزرعہ رازی اور محمد بن اسلم طوسی جو اس عہد کے مشہور عالم اور محدث تھے آگے بڑھے اور خواہش کی کہ حضور والا اپنے جمالِ جہاں آرا سے لوگوں کو مشرف فرمایئے اور اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے پہنچی ہوئی کوئی حدیث سنایئے۔

محمد ابن رافع، احمد بن حارث، یحییٰ ابن یحییٰ، اور اسحاق بن راہویہ نے آپ کے مرکب کی باگ ہاتھ میں لی، امام عالی مقام نے پردے اٹھانے کا حکم دیا۔ آلِ محمد کے ایرانی جاں نثاروں اور خاندان رسالت کے فدائیوں نے جب جگر گوشۂ رسول کا نورانی چہرہ دیکھا تو فرطِ شوق و مسرت سے چیخ چیخ کر رونے لگے۔ کوئی سواری کے گرد مصروف طواف ہوگیا کوئی زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ سینکڑوں آدمی عماری کو بوسہ دے رہے تھے۔ ہزاروں سواری کے قدم چوم رہے تھے۔ عورتیں لب بام کھڑی تھیں۔ بچے اپنے بزرگوں کے کاندھے پر سوار ہو کر مہمانِ عزیز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صبح سے لے کر دوپہر تک وہی محویت کا عالم رہا۔ نہ سواری آگے بڑھ سکی نہ لوگوں کا ہجوم ہی کم ہوا۔ اہلِ ایران کی آنکھیں مدت سے امام کے نظاروں کی مشتاق تھیں۔ آج اللہ اللہ کر کے یہ دن نصیب ہوا تھا۔ مخلص و خوش اعتقاد مسلمان اپنے رسولؐ کے نواسے کی زیارت کے لئے بڑھ رہے تھے اور انقلاب پسند وطن پرست ایران کی شہزادی شہربانو کے پوتے کا استقبال کر رہے تھے۔ صوفی منش لوگ مرشد اوّل حضرت علیؑ کے سجادہ نشین کے چہرے پر نظر ڈالنے کے لئے بے چین تھے۔ علماء و فضلاء محفل

علم و فضل کے صدر نشین سے اکتساب علم کرنے کے شوق میں گھر سے چل کر آئے تھے۔ آفتاب بلند ہونے لگا اور بھیڑ بھاڑ کم نہ ہوئی تو علماء آگے بڑھے اور انہوں نے عامۃ الناس کو خاموش رہنے کی ہدایت کی تاکہ فرزند رسولؐ کے ارشادات کانوں تک پہنچ سکیں۔ جب شور و غل کم ہوا تو حضرتؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے حسب ذیل حدیث بیان فرمائی اور اس کو چوبیس ہزار اہل قلم نے لفظ بلفظ قلم بند کیا۔

''مجھ سے میرے والد ماجد امام موسیٰ کاظمؑ بن امام جعفر صادقؑ نے حدیث بیان کی ہے ان سے ان کے پدر بزرگوار امام جعفر صادقؑ نے اور ان سے ان کے والد ماجد امام محمد باقرؑ نے اور ان سے ان کے والد محترم امام زین العابدینؑ نے، ان سے ان کے والد ماجد امام حسینؑ شہید کربلا نے اور ان سے ان کے والد محترم حضرت علیؑ نے بیان کی کہ میں نے اپنے ابن عم حضرت رسول مقبولؐ سے یہ حدیث سنی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ جبرئیل امین نے رب العزت سے سن کر مجھ سے بیان کیا۔ وہ فرماتا ہے:

''میں اللہ ہوں، سوائے میرے کوئی قابل پرستش نہیں۔ اے میرے بندو میری عبادت کرو تم میں سے جو شخص میری وحدانیت کی شہادت پر اخلاص کے ساتھ باقی رہا وہ میرے حصن (قلعہ) میں داخل ہو گیا اور جو میرے حصن میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے امان پا گیا۔''

حاضرین نے پوچھا اخلاص شہادت کیوں کر حاصل ہوتا ہے، فرمایا: ''اللہ اور رسول کی اطاعت اور ائمہ اہل بیت کی محبت سے۔'' دوسری روایت میں ہے کہ جب امامؑ کی سواری آگے بڑھ گئی تو آپؑ نے فرمایا: بِشُروطِھَا وَاَنَامِنْ شُرُوطِھَا۔ (البتہ کچھ شرائط کے ساتھ اور میں ان شرطوں میں سے ایک ہوں)۔

مرو شاہجاں:

مرو شاہجاں صوبہ خراسان کا پرانا شہر ہے۔ ابو مسلم خراسانی نے اپنے عہد میں اس کو اور

زیادہ رونق دی۔ مامون الرشید کا ابتدائی دار الخلافہ یہی تھا۔ جب امام رضاؑ یہاں وارد ہوئے تو مامون نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کیا اور نہایت احترام واعزاز کے ساتھ آپ کے قیام وطعام کا انتظام کیا۔ جب کسلِ سفر دور ہو چکا تو ایک دن خلوت میں بلا کر کہنے لگا "جب امین سے لڑائی ہو رہی تھی اور ساری دنیا مجھے اپنے خلاف نظر آتی تھی تو میں نے اللہ سے دعا مانگی کہ قادر مطلق مجھے فتحیاب کر دے گا تو میں خلافت کو اس کے اصلی مرکز پر واپس کر دوں گا اور بنی فاطمہؑ میں سے جو اس عہد جلیلہ کا سب سے زیادہ اہل ہوگا اس کو تخت وتاج سپرد کر کے خود اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ میں نے بہت غور وفکر کیا اور بنی عباس وبنی فاطمہؑ کے ایک ایک نمایاں فرد پر کئی مرتبہ نظر انتخاب ڈالی، مگر آپ سے بہتر اس عہدہ جلیلہ کا اہل کوئی نظر نہیں آتا۔"

حضرتؑ نے نہایت متانت سے جواب دیا (جو سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے):

"اگر یہ خلافت تمہاری ہے اور اللہ نے اسے تمہارے لئے قرار دیا ہے، تو اس صورت میں تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم اس لباس کو جسے تمہیں اللہ نے پہنایا ہے اتار کر دوسرے کے حوالے کر دو۔ اور اگر خلافت تمہاری نہیں ہے، تو اس صورت میں تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو چیز تمہاری ہے ہی نہیں تم اسے دوسروں کے حوالے کر دو۔"

("تذکرہ محمدؐ وآل محمدؑ" مولفہ علامہ سید ابن حسن رضوی جارچوی مرحوم اور "ائمہؑ اہل بیتؑ فکری وسیاسی زندگی" تالیف حجت الاسلام رسول جعفریان ترجمہ جناب سجاد حسین مہدوی)

حضرت امام رضا علیہ السلام اور حروف تہجی:

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حروف تہجی یعنی (ا ب ج د) وغیرہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن جب اس کی حقیقت ارباب عصمت سے دریافت کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ

حروف جن سے قرآن مجید جیسی اعجازی کتاب مرتب کی گئی ہے اور جس پر کائنات کے افہام و تفہیم کا دارومدار ہے، اپنے دامن میں بے شمار صفات رکھتے ہیں اور خداوند عالم نے انہیں حروف کو اپنی معرفت کا ذریعہ بنایا ہے اور ہر حرف میں خاص چیز پنہاں رکھی ہے۔ حضرت امام رضاؑ سے ان حروف تہجی کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے بحوالہ باب مدینۃ العلم حضرت علیؑ ارشاد فرمایا کہ "ا" سے آلآ۔ اللہ، خدا کی نعمتیں۔ "ب" سے بھاء اللہ، خدا کی خوبیاں بہجۃ اللہ خدا کا مومنین سے خوش ہونا۔ "ت" سے تمام الامر بقائم آل محمدؐ، دنیا کا خاتمہ امام مہدیؑ کے عہد میں ہوگا۔ "ث" سے ثواب المومنین علی اعمالہم الصالحۃ۔ مومنین کو اچھے اعمال کا بھرپور ثواب ملے گا۔ "ج" سے جمال اللہ، اللہ کا جمال وجلال اللہ، اللہ کا جلال۔ "ح" سے حلم اللہ عن المذنبین۔ گناہگار سے اللہ کا حلم۔ "خ" سے خمول ذکر اہل المعاصی عنداللہ۔ خدا کا گناہگاروں کے گناہوں سے بلوا دینا۔ "د" سے دین اللہ۔ اللہ کا دین اسلام ہے۔ "ذ" ذوالجلال، اللہ کا صاحب جلال ہونا۔ "ر" سے الرؤف الرحیم۔ اللہ کا رؤف ورحیم ہونا۔ "ز" سے زلازل القیامۃ، قیامت کے دن کے عظیم زلزلے۔ "س" سے سناء اللہ۔ اللہ کی اچھائیاں اور بیان۔ "ش" سے شاء اللہ، ماشاء اللہ۔ جو خدا چاہے وہی ہوگا۔ "ص" سے صادق الوعد، اللہ کا وعدہ سچا اور لوگوں کو سچ بولنا چاہیے۔ "ض" سے ضل من خالف محمدؐ وآل محمدؐ۔ وہ شخص گمراہ ہے جو محمدؐ وآل محمدؐ کا مخالف ہے۔ "ط" سے طوبیٰ للمومنین، مومنین کے لئے جنت کی مبارک باد۔ "ظ" سے ظن المومنین باللہ خیرا، مومنین کو اللہ کے ساتھ اچھا ظن رکھنا چاہیے۔ "ع" سے علم یعنی اللہ عالم مطلق ہے۔ اور علم انسان کے لئے بہترین زیور ہے۔ "غ" سے الغنی، اللہ سب سے مستغنی ہے اور غنی کو غریبوں پر خرچ کرنا چاہیے۔ "ف" سے فوج من افواج النار۔ لوگ اگر گناہ کریں گے تو فوج در فوج جہنم میں جائیں گے۔ "ق" سے قرآن، یہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے جو ہدایت سے پُر ہے۔ "ک" سے الکافی، اللہ

بندوں کے لئے کافی ہے۔ ''ل'' سے لغوالکافرین فی افترائہم علی اللہ الکذب۔ اللہ پر جھوٹ کا الزام دینا۔ یہ کافروں کا کام نہایت لغو ہے۔ ''م'' سے ملک اللہ لیوم لا مالک غیرہٗ۔ ایک دن صرف اللہ کی حکومت ہوگی اور کوئی بھی زندہ نہ ہوگا اور نہ اس کے سوا کوئی مالک ہوگا، اس دن اللہ فرمائے گا۔ لمن الملک الیوم؟ آج کے دن کس کی حکومت ہے تو ارواحِ ائمہ جواب دیں گی۔ ''اللہ الواحد القہار'' آج صرف اللہ، واحد قہار کی حکومت ہے۔ ''ن'' سے نوال اللہ للمومنین ونکالہ بالکافرین، مومنین پر اللہ کا کرم اور کافروں پر اس کا عذاب محیط ہوگا۔ ''وٗ'' سے ویل لمن عصی اللہ۔ ویل اور تباہی ہے اس کے لئے جو اللہ کی نافرمانی کرے۔ ''ہٗ'' سے ہان علی اللہ من عصاہ۔ جو اللہ کا گناہ کرتا ہے وہ اس کی توہین کرتا ہے۔ ''لا'' سے لا الٰہ الا اللہ، یہ وہ کلمۂ اخلاص ہے کہ جو اسے خلوص واعتقاد اور شرائط کے ساتھ زبان پر جاری کرے، وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ ''ی'' سے ید اللہ، اللہ کا ہاتھ جو مخلوقات کو روزی پہنچاتا ہے، مراد ہے۔

پھر آپؑ نے فرمایا کہ انھیں حروف پر مشتمل قرآن مجید نازل ہوا ہے اور نزول چونکہ اللہ کی طرف سے تھا، اس لئے دعویٰ کردیا گیا کہ جو کتاب ہم نے حروف والفاظ میں بھیجی ہے۔ اس کا جواب جن وانس سب مل کر بھی نہیں دے سکتے (دمعۂ ساکبہ۔ جلد۳ ص ۶۱)۔

(''چودہ ستارے'' مولانا سید نجم الحسن کراروی۔)

کثرت سے اس امر کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ امامؑ کی ذات باصفات اور پاک و پاکیزہ شخصیت عوام الناس میں بے حد مقبول اور ہردلعزیز تھی۔ چنانچہ مامون کے وزیراعظم فضل بن سہل نے جب ایک وفد کو کوفہ بھیجا کہ وہ وہاں کے عوام سے امام کی ولی عہدی پر بیعت حاصل کرے تو اہل کوفہ نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہم امام کی ولی عہدی نہیں بلکہ ان کی خلافت پر بیعت کرنا چاہتے ہیں۔

مامون خود بھی اکثر و بیشتر حکومت میں پیش آنے والی اہم مشکلات کا حل تلاش کرنے کی غرض سے امام کی طرف رجوع کرتا تھا۔اس نے ایک مرتبہ امامؑ کو بلا کر یہ گزارش بھی کی کہ آپ اپنے شیعوں کو حکومت کے معاملات میں خاموش رہنے کے لیے خطوط لکھیں کیوں کہ شیعہ ہر جگہ اس کی حکومت پر تنقید کیا کرتے تھے۔

فضل بن سہل کے قتل کے موقع پر بھی عوام کے درمیان امامؑ کی مقبولیت و منزلت واضح ہوئی کیوں کہ اس کے قتل کے بعد یہ افواہیں پھیل گئیں تھیں کہ اس قتل میں مامون کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ عوام مشتعل ہو کر باہر نکل پڑے اور انھوں نے دارالخلافہ کا محاصرہ کر لیا تا کہ اپنے غیض و غضب اور جذبۂ انتقام کا اظہار کریں۔اس وقت مامون مجبور ہوا کہ وہ اپنے محل کے عقبی دروازے سے نکل کر قریب ہی واقع امام رضاؑ کے گھر میں داخل ہو اور ان سے اس مشکل وقت میں مدد طلب کرے۔اس نے امامؑ سے منت سماجت کی کہ وہ لوگوں کے جذبات کو کسی طرح ٹھنڈا کریں۔ امامؑ عوام کے سامنے ظاہر ہوئے اور ان کے ایک ہی اشارے پر بپھرا مجمع اپنی جگہ رک گیا اور لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ یہ تمام باتیں اس بات کی محکم دلیل ہیں کہ امام رضاؑ کو عوام اور معاشرے کے درمیان بے پناہ مقبولیت اور ایک عظیم مقام حاصل تھا۔

امام رضاؑ کے منقولات وارشادات:

امام رضاؑ کے منقولات و ارشادات بے شمار ہیں جنہیں ہم مختصراً نقل کرتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

(۱) جمعہ کے دن روزہ رکھنا دس روزوں کے برابر ہے۔(۲) جو شخص کسی عورت کا مہر نا ادا کرے یا مزدور کی مزدوری روکے، وہ بخشا نہ جائے گا(۳) کھانے کی ابتدا نمک سے کرنی چاہیے کیونکہ اس سے ستر بیماریاں دور ہوتی ہیں(۴) مسور ستر انبیاء کی

پسندیدہ خوراک ہے اس سے انسان کا دل نرم ہوتا ہے اور آنسو بہتے ہیں (۵) جو شخص دنیا میں زیادہ کھاتا ہے وہ قیامت کے دن بھوکا رہے گا۔ (۶) جہنم میں پیٹوؤں اور زنا کاروں کی کثرت ہوگی (۷) بچوں کے لیے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں ہے۔ (۸) جس گھر میں سرکہ ہوگا وہ کبھی محتاج نہ ہوگا۔ (۹) منقیٰ صفرا کو درست کرتا ہے بلغم کو دور کرتا ہے اور پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ (۱۰) شہد میں شفا ہے۔ (۱۱) پڑوسیوں کے ساتھ صلہ رحم اور اچھا سلوک کرنے سے مال میں زیادتی ہوتی ہے۔ (۱۲) امام حسینؑ کے قاتل بخشے نہ جائیں گے۔ (۱۳) حسن و حسین علیہما السلام جوانانِ جنت کے سردار ہیں اور ان کے پدر بزرگوارؑ ان دونوں سے بہتر ہیں۔ (۱۴) اہلِ بیتؑ کی مثال سفینۂ نوحؑ جیسی ہے۔ جو اس پر سوار ہوگا نجات پائے گا۔ (۱۵) حضرت فاطمہ زہراؑ قیامت کے دن ساقِ عرش پکڑ کر خونِ حسینؑ کا فیصلہ چاہیں گی۔ اس دن ان کے ہاتھ میں امام حسینؑ کا خون بھرا پیراہن ہوگا۔ (''تفسیر اسلام'' مولفہ علامہ فروغ کاظمی)

اپنے زائرین کے لئے امام رضاؑ کا ارشاد ہے کہ میری زیارت کے لئے مشہد آنے والے کے لئے افضل ہے کہ پہلے قم میری بہن سیدہ فاطمہ معصومۂ قم کی زیارت کرے پھر مشہد آئے۔ آپؑ کا یہ ارشاد اپنی چہیتی اور عالمہ بہن کے لئے کتنے خلوص اور والہانہ پن کا اظہار ہے۔ اس مقام پر ایک اور بہن یاد آجاتی ہے جو مدینہ سے کربلا بھائی کے ساتھ آئی۔ اپنے بچے بھائی پر قربان کردیئے اور اسیر ہوکر کوفہ و شام میں بازاروں اور درباروں میں عظیم خطبے ارشاد کئے۔ اس طرح بھائی، باپ اور نانا کے پیغام اور مشن کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ قیامت تک کے لئے اسے امر بنا دیا۔

زینبؑ سے جیسا انس شہِ کربلاؑ کا ہے ویسا ہی حال مشہد و قم کی فضا کا ہے

تقویٰ مجسم
حضرت امام محمد تقیؑ

بزمِ امامت کی نویں شمع، خانۂ امام علی رضاؑ، مدینہ منورہ میں ۱۰؍رجب المرجب ۱۹۵ ہجری کو روشن ہوئی۔ امام موسیٰ کاظمؑ کی ایک صاحبزادی جن کا نام حکیمہ تھا، بیان کرتی ہیں کہ جب جناب سبیکہ خاتون (خیزران۔ مادرِ امام محمد تقیؑ) کے ہاں بچہ کی ولادت کا وقت نزدیک آیا تو میرے بھائی حضرت امام علی رضاؑ نے مجھے بلایا اور فرمایا، اے میری بہن حکیمہ! آج کی شب خیزران کے یہاں فرزند کی آمد ہے، آپ اس وقت ان کے پاس ہی رہئے گا۔ چنانچہ میں وہیں ٹھہر گئی۔ رات کے وقت میری بھابھی خیزران اور زچگی کی خدمات انجام دینے والی خواتین، حکم امامؑ کے مطابق ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ امامؑ نے کمرہ میں چراغ روشن کرادیئے اور کمرہ بند کر کے خود باہر چلے گئے۔ جب ولادت کے آثار جناب خیزران کے ہاں نمودار ہوئے تو کمرے میں جو چراغ جل رہا تھا خود بخود بجھ گیا۔ اندھیرا ہوجانے سے ہم لوگوں کو فکر ہوئی۔ لیکن چند لمحے ہی گذرے تھے کہ آفتاب امامت طلوع ہوا۔ حضرت محمد تقیؑ ماں کی آغوش میں تھے۔ جناب شیخ عباس قمی نے لکھا ہے کہ حضرت امام علی رضاؑ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے وہ فرزند عطا فرمایا ہے جو حضرت موسیٰؑ (پیغمبر) سے بھی مشابہ ہے، جو عصا مار کر دریا کو شگافتہ کردیتے تھے اور حضرت عیسیٰؑ سے بھی مشابہ ہے، جن کی مادرِ گرامی کو پروردگار نے باعظمت قرار دیا تھا۔

آپ کا اسمِ مبارک اپنے جدِّ بزرگوار کے نام کے مطابق محمدؐ، کنیت (امام محمد باقرؑ کی کنیت کی طرح): ابوجعفر اور مشہور القاب یہ ہیں:

تقی: آپؑ کا یہ لقب سب سے زیادہ مشہور ہے گویا آپؑ کے نام کا جزو ہے۔(لغت کی رو سے اس کے معنی ہیں: پرہیزگار)۔

جواد: یعنی سخی۔ عربی بولنے والے زیادہ تر مومنین آپؑ کو اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔(اس طرح اردو داں حضرات محمد تقیؑ اور عربی داں حضرات امام محمد جوادؑ کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔

مختار: یعنی وہ ذات جسے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے خداوندِ عالم نے اختیار کیا۔

منتجب: اسی سے لفظ "نجیب" بھی ہے جو ذاتی شرافت کے معنی میں ہے۔

مرتضیٰ: (پسندیدہ) آپ کی ذات والا صفات تمام بنی نوع انسان کے نزدیک نہایت پسندیدہ تھی۔

قانع: قناعت کی صفت سے مالا مال۔ یہاں تک کے وقت کے حکمراں نے آپ کو اپنا داماد بنایا، مگر آپؑ کو اپنے جدِ بزرگوار کے جوار میں سوکھی روٹی کھانا زیادہ مرغوب تھا۔

عالم: وہ عظیم المرتبت صاحب علم، جس نے نو سال کی عمر میں تیس ہزار مشکل سوالات کے مدلل ترین اور تسلی بخش جواب دیئے۔

امام محمد تقیؑ کو انتہائی کمسنی میں منصب امامت کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔ اس سلسلہ میں جناب امام علی رضاؑ سے منقول ہے کہ "اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو صاحب شریعت نبی و رسول بنا کر اس وقت مبعوث کیا جب وہ میرے فرزند محمد تقیؑ سے بھی کمسن تھے۔ اسی طرح کے ایک اور سوال کے جواب میں امام علی رضاؑ نے ان ارشاداتِ الٰہی کا حوالہ دیا جس میں اللہ فرماتا ہے:

"جناب مریمؑ بچہ کو اپنی گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں تو لوگوں نے

کہا: اے مریم، یہ تم نے انوکھا کام کیا۔ ہارون کی بہن! نہ تمہارے باپ برے آدمی تھے، نہ تمہاری ماں بدکردار تھیں! (جناب مریمؑ نے) بچے کی طرف اشارہ کردیا (کہ اسی سے پوچھو)۔ لوگوں نے کہا ہم اس سے کیسے بات کریں، جو گہوارے میں بچہ ہے؟ (بچہ نے) آواز دی: "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ میں جہاں بھی رہوں، اس نے مجھے بابرکت قرار دیا ہے۔ میں جب تک زندہ رہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ (اس نے مجھے) اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنایا ہے)۔ ظالم اور بدنصیب نہیں قرار دیا ہے۔ سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا۔ جس دن میں دنیا سے رخصت ہوں گا اور جس دن دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جاؤں گا۔" یہ ہیں مریمؑ کے فرزند عیسیٰؑ۔ فرمان برحق! جس میں یہ لوگ شک کرتے ہیں۔" (۱۶واں پارہ، ۱۹واں سورۂ مریمؑ، آیت ۲۷ تا ۳۴)۔

کتاب "محرمات اسلام" از حجت الاسلام محمد حسینی بہارانچی سے ایک اقتباس:

چند اسباب حرمت بزبان امام محمد تقیؑ:

مامون نے اپنے کچھ سیاسی اہداف کے لئے اپنی بیٹی ام الفضل کا نکاح امام محمد تقیؑ سے کرنے کا ارادہ کیا۔ بنی عباس کے بزرگوں نے اس نکاح کی مخالفت کی اور کہا کہ (حضرت) محمد بن علی (علیہ السلام) ابھی نوخیز نوجوان ہیں اور ان کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اس رشتے سے ہمارے خاندان سے لباس افتخار چھن جائے گا۔ مامون نے کہا کہ آپ حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس خاندان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ انھیں دنیا میں کسی سے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا کی طرف سے تعلیم یافتہ ہیں اور اگر آپ لوگوں کو میری بات کا یقین نہ آئے تو انھیں آزما کر دیکھ لیں۔ بنی عباس کے بزرگوں نے کہا کہ ہم ان کا امتحان لیں گے۔ پھر انھوں نے اس وقت کے سب سے بڑے قاضی یحییٰ

بن اکثم سے کہا کہ اگر تم محمد تقیؑ کو علم کے میدان میں مات دے دو تو ہم تمھیں منہ مانگا انعام دیں گے۔ القصہ مامون نے اپنے دربار میں ایک جلسہ تشکیل دیا اور امام محمد تقیؑ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اعیان سلطنت اور اس عہد کے نامور علماء اس جلسے میں شریک ہوئے۔ مامون کی اجازت سے گفتگو کا آغاز ہوا اور قاضی یحییٰ بن اکثم نے امام محمد تقیؑ سے کہا: بتایئے اگر حالت احرام میں کوئی شخص شکار کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ تمہارا سوال مجمل ہے۔ تم نے وضاحت ہی نہیں کی کہ شکاری نے کہاں شکار کیا۔ حدود حرم میں یا حدود حرم سے باہر؟ شکاری بالغ تھا یا نابالغ؟ اس نے پہلی بار شکار کیا تھا یا اس سے پہلے بھی کر چکا تھا؟ اس نے پرندہ مارا تھا یا جانور؟ پرندہ اور جانور بڑا تھا یا چھوٹا؟ شکاری اپنے فعل پر نادم ہے یا نہیں؟ شکار دن میں کیا یا رات کی تاریکی میں؟ شکاری نے عمرہ کا احرام باندھ رکھا تھا یا حج کا؟ تم ایک ایک شق جدا کرتے جاؤ میں ہر شق کا جواب دیتا جاؤں گا۔ جب قاضی نے یہ تفصیل سنی تو پریشان ہو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پھر مامون نے امام سے کہا کہ آپ ہی اس مسئلے کی تفصیل بیان فرمائیں۔ چنانچہ امام نے اس مسئلے کا شق وار کفارہ بیان کیا۔ (وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۱۴)۔ مامون نے امامؑ سے کہا فرزند رسولؐ! اب آپ قاضی سے سوال کیجئے۔ امامؑ نے قاضی سے کہا: ایک آدمی نے ایک عورت پر دن کے اول حصے میں نگاہ ڈالی تو اس کے لئے عورت کو دیکھنا حرام تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس عورت کو دیکھنا اس کے لئے حلال ہو گیا۔ ظہر کے وقت وہ عورت اس پر حرام ہو گئی اور عصر کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ غروب آفتاب کے وقت وہ اس پر حرام ہو گئی اور نماز عشاء کے وقت حلال ہو گئی۔ نصف شب کو وہ عورت اس آدمی پر پھر حرام ہو گئی اور طلوع فجر کے وقت حلال ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد پھر حرام ہو گئی اور ظہر کے وقت پھر حلال ہو گئی۔ آپ یہ بتائیں کہ ایک عورت ایک آدمی پر اتنی بار حلال اور حرام کیسے ہوئی؟ قاضی یحییٰ نے یہ سنا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے کہا:

فرزند رسولؐ آپ خود ہی اس کا جواب دیں۔ امامؑ نے فرمایا کہ سنو! ایک آدمی نے دن کے پہلے حصے میں کسی شخص کی کنیز کو دیکھا تو وہ اس پر حرام تھی۔ پھر اس نے کنیز کو خرید لیا تو وہ اس کے لئے حلال ہوگئی۔ پھر اسے کنیزی سے آزاد کر دیا تو وہ اس پر حرام ہوگئی۔ پھر اس نے اس سے نکاح کر لیا تو وہ حلال ہوگئی۔ پھر اس آدمی نے اس سے ظہار کیا تو وہ حرام ہوگئی۔ اس نے ظہار کا کفارہ دیا تو وہ پھر حلال ہوگئی۔ اس نے اسے طلاق دیدی تو وہ حرام ہوگئی۔ پھر اس نے طلاق سے رجوع کر لیا تو حلال ہوگئی۔ پھر آدمی مرتد ہوگیا تو وہ اس پر حرام ہوگئی۔ پھر اس نے توبہ کی وہی عورت اس کے لئے حلال ہوگئی۔ یہ وجہ ہے کہ ایک عورت ایک مرد کے لئے اتنی بار حلال بھی ہوئی اور حرام بھی۔ (تحف العقول ص ۴۵۱)۔

امام محمد تقیؑ کے کچھ حکیمانہ ارشادات:

۱۔ ایسے نہ ہونا کہ ظاہر میں تو اللہ کے دوست (نظر آؤ) اور باطن میں اس کے دشمن۔

شیخ عباس فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مولائے کائنات امیر المومنینؑ کے اس ارشاد سے بہت مشابہ ہے۔ جس میں آپؑ نے فرمایا: ظاہر میں شیطان کو گالی نہ دو، جب کہ باطن میں تم اس کے دوست ہو۔

۲۔ اللہ پر بھروسہ رکھنا، ہر مہنگی چیز کی قیمت اور ہر بلندی (تک پہنچنے) کے لئے سیڑھی (کی حیثیت رکھتا) ہے۔

۳۔ جسے خدا کی راہ میں ایک (مخلص) بھائی مل جائے، اسے در حقیقت جنت میں گھر مل گیا۔

۴۔ وہ شخص کیسے ضائع (یا نامراد) ہو سکتا ہے۔ جس کی کفالت خود اللہ کر رہا ہو۔ اور وہ شخص (گرفت میں آنے سے) کیسے بچ سکتا ہے۔ جس کا طلبگار خدا ہو۔

۵۔ جو خدا کے سوا کسی اور کا ہو کر رہ جائے، اسے خدا بھی اسی کے سپرد کر دے گا اور جو شخص علم کے بغیر عمل کرے وہ جتنا (کام) اچھا کرے گا اس سے زیادہ خراب کرے گا۔

۶۔ خبردار کسی شر پسند کے ساتھی نہ بننا، کیونکہ (اس کی حیثیت) ایک ایسی تلوار کے مانند ہے جو نیام سے باہر ہو، دیکھنے میں اچھی لگتی ہے، مگر اس کے اثرات خراب ہیں۔

۷۔ کسی شخص کے خیانت کار ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ خیانت کرنے والوں کا امانت دار ہو۔

۸۔ مومن کو تین باتوں کی ضرورت ہوتی ہے: (الف) اللہ کی طرف سے توفیق۔ (ب) اس کا ضمیر اسے نصیحت کرنے والا ہو۔ (ج) اگر کوئی (اخلاص کے ساتھ) نصیحت کرے، تو اسے قبول کرے۔

۹۔ دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف راغب رہنا زیادہ بہتر ہے، بہ نسبت اس بات کے کہ اعضا و جوارح کو کام کر کے تھکایا جائے۔

۱۰۔ جو اپنی خواہش نفس کی اطاعت کرتا ہے وہ اپنے دشمن کو تمنا پوری کرنے کا موقع دیتا ہے۔

آپؑ کے کچھ اور ارشادات:

☆۔ مسلمان کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ "حسن خُلق" ہے۔

☆۔ جو اللہ سے ڈرے گا، لوگ اسے دوست رکھیں گے۔

☆۔ جو اللہ کے بھروسے پر لوگوں سے بے نیاز ہو جائے گا، لوگ اس کے محتاج ہوں گے۔

☆۔ دین عزت ہے، علم خزانہ ہے اور خاموشی نور ہے۔

☆۔ دین کو تباہ کرنے والی چیز بدعت ہے۔

☆۔ انسان کو برباد کرنے والی چیز لالچ ہے۔

☆۔ جو صبر و ضبط کے میدان میں آ جائے، کامیاب ہو گا۔

☆۔ جو دنیا میں تقویٰ کے بیج بوئے گا، آخرت میں دلی مرادوں کا پھل پائے گا۔

☆۔ اگر جاہل زبان بند رکھے تو اختلافات نہ ہوں۔

☆۔ جو کسی برائی کو اچھی نگاہ سے دیکھے وہ اس میں شریک سمجھا جائے گا۔

☆۔ کفران نعمت کرنے والا خدا کی ناراضگی کو دعوت دیتا ہے۔

☆۔ زہد کی انتہا ورع (پرہیزگاری) وتقویٰ ہے۔

☆۔ انسان کی خوبیوں کا مرکز اس کی زبان ہے۔

☆۔ انسان کے کمالات کا دارومدار اس کی عقل (ودانش) پر ہے۔

☆۔ جو اپنے بھائی کو پوشیدہ طور سے نصیحت کرے، وہ اس کا محسن ہے اور جو اعلانیہ نصیحت کرے گویا اس نے اس کے ساتھ برائی کی۔

☆۔ دعا کے ذریعہ ہر بلا ٹل سکتی ہے۔

☆۔ اپنے ضعیفوں پر رحم کرو اور ان کے ترحم کے ذریعہ سے اپنے لئے اللہ سے رحم کی درخواست کرو۔

☆۔ عام موت سے بری موت وہ ہے جو گناہ کے ذریعہ سے ہو اور عام زندگی سے خیر و برکت والی زندگی بہتر ہے۔

☆۔ جو شخص جلد بازی کرنے سے پرہیز کرے گا، لوگوں سے مشورہ لے گا، اور اللہ پر بھروسہ رکھے گا، وہ کبھی شرمندہ نہ ہوگا۔

☆۔ جو شخص اللہ پر اعتماد رکھے، اس پر توکل و بھروسہ کرے، اللہ اسے ہر برائی سے بچاتا ہے، ہر قسم کے دشمن سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔

☆۔ ظلم کرنے والا، ظالم کی مدد کرنے والا، اور ظالم کے فعل کو سراہنے والا، ایک ہی زمرے میں ہیں۔

☆۔ ہر نعمت الٰہی میں مخلوقات کا حصہ ہے۔ جب اللہ کسی کو عظیم نعمتیں دیتا ہے تو (بہت سے) لوگوں کی زیادہ حاجتیں بھی اس سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اس موقع پر اگر وہ

صاحب نعمت عہدہ برآ ہو سکا تو خیر ورنہ نعمت میں زوال آجائے گا۔

☆۔انسان کے لئے فقر کی زینت شکر ہے۔

☆۔حسب کی زینت: تواضع اور فروتنی ہے۔

☆۔کلام کی زینت: فصاحت ہے۔

☆۔روایت کی زینت: حافظہ ہے۔

☆۔علم کی زینت: انکسار ہے۔

☆۔ورع (پرہیزگاری) وتقویٰ کی زینت: حسن ادب ہے۔

☆۔قناعت کی زینت: مہملات سے کنارہ کشی ہے۔

☆۔تین باتوں سے دل موہ لئے جاتے ہیں: (الف) معاشرے میں انصاف۔ (ب) مصیبت میں ہمدردی۔ (ج) پریشان خاطری میں تسلی۔

☆۔جو زندہ رہنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ برداشت کرنے کے لئے اپنے دل کو صبر آزما بنالے۔

☆۔اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے تین چیزیں ہونی چاہئیں: (الف) استغفار (ب) نرمی وفروتنی۔ (ج) کثرت سے صدقہ دینا۔

☆۔جب کسی بندے پر نعمت کا نزول ہو اور وہ اس نعمت سے متاثر ہو کر یہ سمجھے کہ یہ اللہ ہی کی عنایت ومہربانی ہے تو اس کا شکر ادا کرنے سے پہلے ہی اللہ اس کا نام شاکرین میں لکھ لیتا ہے۔

☆۔اپنی خواہشات کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ دل تنگ ہو جائے۔

ماخذ:۔ "سوانح حیات امام محمد تقی علیہ السلام" از علامہ سید رضی جعفر نقوی۔ "محرمات اسلام" از حجت الاسلام محمد حسینی بہارانچی)

ہادیِ بے مثل حضرت امام علی نقیؑ

دسویں شمع امامت مدینہ میں پانچ رجب کو روشن ہوئی۔ یعنی امام علی نقی علیہ السلام پیدا ہوئے۔ علم و حکمت، جود و سخا، طہارت نفس، بلندیٔ کردار اور دیگر جملہ صفات حسنہ میں آپؑ اپنے والد امام محمد تقی علیہ السلام کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ آپؑ کی والدہ جناب سمانہ خاتون حضرت عمار یاسر کے خاندان سے ایک پاک باز و بلند مرتبہ خاتون تھیں۔

آپ کی حیات اقدس کا ایک واقعہ:

اس واقعہ کا تعلق عبید اللہ جنیدی سے ہے۔ یہ ایک مسلمہ اور نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام خداوند عالم کی طرف سے علم و حکمت کے خزانوں کی کنجیاں لے کر دنیا میں وارد ہوئے۔ اس لئے انہوں نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور نہ انہیں دنیا میں کسی سے علم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ذاتی علم و حکمت کے علاوہ مزید شرف کمال کی تحصیل یہ اپنے آباء و اجداد سے کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی کم سنی کی حالت میں بھی یہ دنیا کے بڑے بڑے عالموں کو بھی علمی شکست دینے میں کامیاب رہے اور جب کسی نے اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھنے کی کوشش کی تو وہ ذلیل ہو گیا۔

علامہ مسعودی کا بیان ہے کہ امام علی نقیؑ کو چھ سات سال کی عمر میں پوری طرح مرجعیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر دشمنان آل محمدؐ کو فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس مرجعیت و مرکزیت کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ کچھ حاسدین و مخالفین اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عمر بن فرح رخجی کے ذریعہ حکومت وقت سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت معتصم باللہ عباسی فرمانروا تھا۔ اس نے طے کیا کہ علی بن محمدؑ کو کسی ایسے عالم کی سرپرستی میں دے دیا جائے جو انہیں

اپنے نظریات وعقائد کے مطابق تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کے شیعوں اور عقیدت مندوں پر بھی نظر رکھے تا کہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ غرض کہ حکومت کی طرف سے عراق کا سب سے بڑا عالم اور ادیب عبیداللہ جنیدی، جو آل محمد کی دشمنی میں مشہور تھا، اس کام کے لئے معقول مشاہرہ پر مقرر کیا گیا اور اسے ہدایت کردی گئی کہ کوئی شیعہ امام علی نقی سے ملنے نہ پائے۔ اس کے ساتھ ہی معتصم نے گورنر مدینہ کو بھی لکھا کہ امام علی نقی کو عبیداللہ جنیدی کے حوالے کردے اور انہیں اس کے ساتھ رہنے پر مجبور کردے۔

جنیدی نے امام علیہ السلام کو قصر "صربا" میں رکھا جہاں شام ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا جاتا تھا اور مسلح پہرے دار کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس طرح آپ کے ماننے والوں کا سلسلہ آپ سے منقطع ہو گیا اور لوگ آپ کی زیارت نیز دینی استفادہ سے محروم ہو گئے۔

راوی کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن جنیدی سے کہا، تمہارے "ہاشمی غلام" کا کیا حال ہے؟ اس نے منھ بنا کر جواب دیا "انھیں غلام ہاشمی نہ کہو، وہ رئیس ہاشمی ہیں"۔ خدا کی قسم! وہ اس کم سنی میں مجھ سے کہیں زیادہ علم رکھتے ہیں۔ سنو! میں اپنی پوری کوشش کے بعد جب علم کا کوئی باب ان کے سامنے پیش کرتا ہوں تو وہ اس میں ایسے مختلف ابواب کھول دیتے ہیں کہ میں حیران رہ جاتا ہوں۔ تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں انہیں تعلیم دے رہا ہوں لیکن خدا کی قسم حقیقت یہ ہے کہ میں خود ان سے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ خدا کی قسم! وہ حافظ قرآن ہی نہیں بلکہ اس کی تاویل وتنزیل سے بھی واقف ہیں اور مختصر یہ ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر بسنے والے علماء میں سب سے افضل وبرتر ہیں۔ میرے بس میں نہیں کہ میں انہیں پڑھا سکوں۔

اس کے بعد جنیدی نے معتصم کو لکھا کہ امام علی نقی کو تعلیم دینا میرے خیال میں آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے لہٰذا میں خدمت سے سبکدوشی چاہتا ہوں۔

علم الباطن وعلم:

امام علی نقی اپنے بزرگوں کی طرح علم باطن وعلم غیب سے بھی واقف وآگاہ تھے جس کی

بنا پر آپ اپنے حامیوں کو مستقبل کے حالات و واقعات سے باخبر کر دیا کرتے تھے۔ نیز آپ کی یہ کوشش بھی رہتی تھی کہ حتی الامکان انھیں کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ محمد بن فرح رجی کا بیان ہے کہ امام علی نقیؑ نے ایک مرتبہ مجھے تحریر فرمایا کہ "تم اپنے تمام معاملات اور خانگی نظام کو درست کر کے اپنے اسلحوں کو سنبھال لو۔" میں نے حکم امام کی تعمیل کی لیکن سمجھ نہ سکا کہ یہ حکم مجھے کیوں دیا گیا ہے؟ چند دنوں بعد مصر کی پولیس نے میرے گھر پر چھاپا مارا اور مجھے گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے بعد قید خانے میں ڈال دیا گیا اور آٹھ سال تک اسی میں پڑا رہا۔ ایک دن امامؑ کا خط پھر پہنچا جس میں تحریر تھا کہ "اے محمد بن فرح! تم مغرب کی طرف مت جانا۔" میں حیران ہوا کہ قید کی حالت میں جب میرا کسی طرف جانا ممکن ہی نہیں تو امامؑ نے یہ کیوں تحریر فرمایا ہے؟ میرے اس استعجاب میں ابھی تخفیف بھی نہیں ہوئی تھی کہ تیسرے دن میری رہائی کا حکم آیا اور میں قید سے چھٹنے کے بعد امامؑ کے حکم کے مطابق مغرب کی طرف نہیں گیا۔ چند دن بعد امامؑ کی طرف سے مجھے ایک تیسرا خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ عنقریب تمھارا مال تمھیں واپس مل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ایک دن امام علی نقیؑ علی بن حصیب نامی شخص کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں علی بن حصیب چند قدم آپ سے آگے بڑھ کر بولے، حضور! آپ قدم بڑھائیے۔ امامؑ نے فرمایا، اے ابن حصیب! تمھیں پہلے جانا ہے تو جاؤ۔ اس واقعہ کے چوتھے دن ابن حصیب دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابوایوب نامی ایک شخص نے امامؑ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا جس میں اس نے خواہش ظاہر کی کہ میری بیوی حاملہ ہے، آپ دعا فرمائیں کہ لڑکا پیدا ہو۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ بعض لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ہوا کرتی ہیں، تمھیں سجدۂ شکر ادا کرنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد ابوایوب کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔

ابو ہاشم سے روایت ہے کہ میں سن ۲۲۷ھ میں امامؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ کسی نے آ کر کہا، حضور! ترکوں کی فوج گزر رہی ہے۔ امام علی نقیؑ نے مجھ سے فرمایا، چلو ان لوگوں سے ملاقات کریں۔ ہم لوگ لشکریوں کے پاس گئے۔ امامؑ نے ایک ترکی کو مخاطب کر کے اس

سے دیر تک گفتگو کی۔ اس کے بعد اس ترکی نے آپ کے قدموں کا بوسہ لیا۔ میں نے اس ترکی سے سوال کیا کہ وہ کون سی چیز تھی جس نے تجھے امام کا گرویدہ بنادیا۔ اس نے کہا، امام نے مجھ کو اس نام سے مخاطب کیا تھا جس کا جاننے والا میرے باپ کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

ہندی زبان:

ابو ہاشم سے مروی ہے کہ میں ایک دن امام علی نقیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ہندی زبان میں مجھ سے گفتگو فرمائی جس کا جواب میں نہ دے سکا۔ مجھ پر شرمندگی اور شرمساری کے آثار مرتب ہوئے، جنہیں محسوس کرتے ہوئے امامؑ نے فرمایا، کیا تم ہندی زبان سیکھنا چاہتے ہو؟ میں نے رضامندی ظاہر کی تو آپ نے ایک سنگریزہ اٹھا کر اپنے منہ میں رکھا، پھر مجھے دیتے ہوئے فرمایا، اسے چوسو۔ میں نے اس سنگریزے کو چوسا تو میں بہتر (۷۳) زبانوں کا عالم بن گیا، جن میں ہندی زبان بھی شامل تھی۔ (کشف الغمہ ص ۱۲۲)

اسم اعظم:

علامہ کلینی اصول کافی میں رقم طراز ہیں کہ امام علی نقیؑ نے فرمایا کہ اسم اعظم کے تہتر (۷۳) حروف میں صرف ایک حرف حضرت سلیمانؑ کے وصی جناب آصف برخیا کو ودیعت کیا گیا تھا جس کے ذریعہ انہوں نے تخت بلقیس چشم زدن میں ملک سبا سے منگوالیا تھا اور زمین سمٹ کر اس تخت کو قریب لے آئی تھی۔ خداوند عالم نے ہمیں اسم اعظم کے بہتر (۷۲) حروف ودیعت کئے ہیں اور ایک حرف جو کلیۂ علم غیب سے متعلق ہے، اپنے پاس رکھا ہے۔ غرض کہ خدا نے ہمیں اپنے خزانۂ غیب سے وہ چیزیں عطا کی ہیں جو اہل دنیا کے لئے حیرت انگیز و تعجب خیز ہیں۔ (اصول کافی، مناقب ج ۵ ص ۱۱۸، دمعۃ الساکبہ ص ۱۲۶)۔

آپؑ کی سیرت:

امام علی نقیؑ کی سیرت اور اخلاق و کمالات وہی تھے جو سلسلۂ عصمت کی ہر فرد کا خاصہ تھے۔ قید خانہ ہو یا نظر بندی کا عالم، اسیری کا عہد ہو یا آزادی کا زمانہ، ہر وقت ہر حال میں یاد الٰہی، عبادت خدا، ثبات قدم، صبر و استقلال، مصائب کے ہجوم میں بھی ماتھے پر شکن کا نہ

ہونا، دشمنوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا، غریبوں، محتاجوں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا، یہی وہ اوصاف ہیں جو امام علی نقیؑ کی سیرت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

قید و نظر بندی کے زمانہ میں جہاں بھی آپؑ کے مصلےٰ کے سامنے ایک قبر کھدی ہوئی تیار رہتی تھی۔ دیکھنے والوں نے جب اس پر حیرت کا اظہار کیا تو آپؑ نے فرمایا کہ میں موت کی طرف سے غافل نہ ہونے کے لئے یہ قبر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہوں۔

امام کا یہ جواب درحقیقت ایک ظالم طاقت کو اس کے باطل مطالبۂ اطاعت اور اسلام کی حقیقی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے ترک کردینے کی خواہش کا ایک عملی جواب تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ظالم فرمانروا میری جان تو لے سکتا ہے مگر اپنی حکومت کی غلط پالیسیوں کے آگے مجھے جھکنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔

اس کے علاوہ دنیاوی سازشوں میں شرکت یا حکومت کے خلاف کسی بے محل و ناروا اقدام کے دھبوں سے آپؑ کا دامن کردار اس طرح صاف و شفاف تھا کہ دارالحکومت میں مستقل قیام اور حکومت کی طرف سے سخت ترین جاسوسی کے باوجود آپؑ کے خلاف کبھی کوئی الزام درست ثابت نہیں ہوسکا اور کبھی وقت کے فرمانرواؤں کو کوئی دلیل آپؑ کے خلاف تشدد کے جواز کی نہ مل سکی۔ حالانکہ حکومت عباسیہ کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں اور روزانہ ایک نیا فتنہ کھڑا ہونے لگا تھا۔ اگر آپؑ چاہتے تو اپنے حامیوں کو ابھار کر اس موقع پر اپنے لئے آزادی کا سامان فراہم کرلیتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ متوکل سے خود اس کے بیٹے کی مخالفت، اس کے ایک انتہائی معتمد غلام "باغر رومی" کی دشمنی، پھر مستنصر کے بعد امرائے حکومت کا انتشار، متوکل کے بیٹوں کو خلافت سے محروم رکھنے کا فیصلہ، اس کے بعد مستعین کے دور حکومت میں یحییٰ بن عمر وعلوی کا کوفہ میں خروج اور حسن بن زید کا علاقۂ طبرستان پر قابض ہو جانا، دارالسلطنت میں ترکی غلاموں کی بغاوت، مستعین کا سامرہ چھوڑ کر بغداد کی طرف بھاگنا اور قلعہ بند ہو جانا اور

پھر کچھ دنوں کے بعد معتز کے ہاتھ سے اس کا قتل ہو جانا، موید کی زندگی کا خاتمہ اور موفق کا بصرہ میں قید کیا جانا غرض کہ ان تمام ہنگامی حالات، شورشوں اور جھگڑوں کے درمیان امام علیہ السلام بڑی آسانی سے قید کی زنجیریں توڑ سکتے تھے۔ لیکن امام علیہ السلام کا اپنے موقف پر ثابت قدم رہنا اور تمام مذکورہ حالات سے خود کو علیحدہ رکھنا، یہاں تک کہ اراکین حکومت کو آپؑ کے بارے میں شبہ تک نہ پیدا ہو، قوت ارادی کی معراج نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ امامؑ عباسیوں کی حکومت کو ناجائز سمجھتے ہوئے بھی اس طرح کے اتفاقی مواقع سے فائدہ اٹھانا اپنی حقانیت وصداقت کی توہین اور اپنے معیار عمل کی تذلیل سمجھتے تھے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ آپؑ تمام معاملات میں خاموش اور کنارہ کش رہے۔ یہاں تک کہ متوکل کے بعد شاہی کے مختلف ادوار آپؑ کی نظروں سے گزرے اور حکومت کی باگ ڈور مستنصر اور مستعین کے ہاتھوں سے گزرتی ہوئی سن ۲۵۲ھ میں معتز باللہ کے ظالم ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

آپؑ کی شہادت:

آپؑ کی شہادت بھی اپنے اجداد کی طرح ظالم و جابر حاکم وقت معتز باللہ کے ہاتھوں ہوئی۔ اس نے آپؑ کو زہر دے دیا اور اس طرح یہ شمع امامت تیسری رجب المرجب سن ۲۵۴ھ کو گل ہوگئی۔ بوقت شہادت آپؑ کے پاس کوئی نہ تھا۔ غسل وکفن کے بعد حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے آپؑ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آپؑ کو سامرہ میں دفن کریا۔ (دمعۃ الساکبہ ج ۳ ص ۱۴۹، انوار حسینیہ ج ۲ ص ۵۵، صواعق محرقہ ص ۱۲۴، جلال العیون ص ۲۹۲)۔

ازواج واولادیں:

امام علی نقی علیہ السلام کی مختلف بیویوں سے ایک بیٹی اور چار بیٹے متولد ہوئے۔ لیکن آپؑ کی نسل آپؑ کے دو فرزندوں جناب جعفر بن علی اور جناب امام حسن عسکری علیہ السلام سے باقی وجاری ہے۔

ماخذ:۔ ''تفسیر اسلام'' مولفہ علامہ فروغ کاظمی۔

مدبّرِ غیبت، امام حسن عسکریؑ

ابو محمد حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سلسلہ امامت کی گیارہویں اور سلسلۂ عصمت کی تیرہویں کڑی ہیں۔ آپ کی فضیلت کے باب میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ حضرت امام آخرالزمان آپ ہی کے اکلوتے فرزند ہیں۔

اس مضمون میں ہم آپؑ کے حالات زندگی کی بجائے آپؑ کے ارشادات اور فضائل کو مختصراً بیان کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے اپنے وقت میں حالات کے مطابق اپنے فرائض بدرجۂ اولیٰ انجام دیے۔ جناب امام حسن عسکریؑ کی عملی سیرت میں محروم اور ستم رسیدہ عوام الناس کے لئے رفاہی امور کی تدبیر و تنظیم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپ نے محروم طبقوں کے لئے فلاحی کاموں کے طریق کار کو اپنے آبائے کرام خصوصاً اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مزید استحکام بخشا۔ مختلف شہروں میں اپنے نمائندے مقرر فرمائے۔ انہیں آمدنی اور خرچ کرنے کی ہدایتیں دیں اور آئندہ کا لائحہ عمل بھی عطا فرمایا۔

آپ نے اپنے فرزند اور اپنے بعد ہونے والے امام، حضرت مہدی منتظر علیہ السلام کے کوائف، ان کی غیبت اور زمانۂ غیبت میں امور دین کے نظم و نسق سے متعلق بھی اپنے اصحاب کو باخبر فرمایا۔ اس سلسلے کی ایک معتبر روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ امام حسن عسکریؑ سے ان کے آبائے معصومین علیہم السلام کی اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ زمین

حجت خدا سے کبھی خالی نہیں رہ سکتی اور یہ کہ جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کیے بغیر مر جائے وہ جاہلیت یا کفر کی موت مرتا ہے۔تو آپؑ نے فرمایا: یہ حدیث روز روشن کی طرح برحق ہے! آپؑ سے پوچھا گیا کہ پھر آپؑ کے بعد حجت و امام کون ہے؟ آپؑ نے فرمایا میرا بیٹا محمدؑ وہی میرے بعد امام اور حجت ہے۔ جو اس کی معرفت حاصل کیے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ ہاں اس کے لیے غیبت ہے! جس میں جاہل مبتلائے حیرت رہیں گے، باطل پرست ہلاک ہوں گے، اس کے ظہور کا وقت معین کرنے والے جھوٹے ہوں گے۔ پھر وہ ظاہر ہوگا۔ جیسے میں نجف کوفہ میں اس کے سر پر سفید پرچموں کو دیکھ رہا ہوں۔

اپنے بعد ہونے والے امام، اس دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی آخری حجت اور حضرت خاتم النبیینؐ کے آخری وصی وخلیفہ حضرت امام مہدی منتظرؑ کی غیبت کے زمانے میں امت مسلمہ کا عملی وظیفہ بیان کرتے ہوئے امام حسن عسکریؑ نے فرمایا:

"اور فقہا میں سے جو اپنے نفس کو بچانے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، اپنی ہوا و ہوس کی مخالفت کرنے والا اور اپنے رب کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام کے لئے اس کی تقلید جائز ہے"۔

یہیں سے نظام اجتہاد وتفقہ کی بنیاد استوار ہوئی اور عام افراد امت کے لیے جہالت کی تاریکیوں میں اپنی قوت عمل کو برباد کرنے کی بجائے "علمائے دین" یا فقہائے مجتہدین کی تقلید کا سلسلہ شروع ہوا۔

آپؑ کی علمی صلاحیتیں:

شیخ مفید علیہ الرحمہ کا بیان ہے کہ آپؑ علم وحکمت، عقل وفہم، عصمت وطہارت، سخاوت وشجاعت اور عبادت وریاضت میں تمام اہل دنیا سے افضل واکمل تھے۔ علامہ کلینی نے تحریر

فرمایا ہے کہ آپ تمام زبانوں سے واقف تھے اور ہر زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ علم رجال، علم انساب اور علم حوادث میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ آپؑ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہم وہ ہیں جنہیں خدا نے صاحب قلم قرار دیا ہے۔ علماء کا بیان ہے کہ آپ لکھتے لکھتے جب نماز کے لیے چلے جاتے تو آپ کا مدعا بحکم الٰہی صفحہ قرطاس پر مرقوم ہوتا رہتا تھا۔ آپ کے علمی کارناموں میں ایک اہم کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو "تفسیر امام حسن عسکریؑ" کے نام سے موسوم ومشہور ہے۔ یہ تفسیر علوم قرآنی اور احکام نبوی کا ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔

آپؑ کے اقوال زریں:

۱۔ نیک بندوں کو دوست رکھنے میں ثواب عظیم ہے۔

۲۔ بے سبب ہنسنا جہالت کی دلیل ہے۔

۳۔ جب کسی کے پاس سے گزرو تو اسے سلام کرو۔

۴۔ محض نماز و روزہ ہی عبادت نہیں بلکہ یہ بھی عبادت ہے کہ خدا کے بارے میں غور و فکر اور سوچ بچار کیا جائے۔

۵۔ حسد اور غیبت بدترین شے ہے۔

۶۔ غصہ ہر برائی کی کنجی ہے۔

۷۔ حاسد اور کینہ پرور کو کبھی دلی سکون نہیں ملتا۔

۸۔ بہترین متقی اور پرہیزگار وہ ہے جو گناہوں سے مطلقاً دوری اختیار کرے۔

۹۔ بہترین عبادت گزار وہ ہے جو فرائض ادا کرتا ہے۔

۱۰۔ جو دنیا میں بوؤ گے وہی آخرت میں کاٹو گے۔

۱۱۔ موت تمہاری زندگی کے ساتھ ہے۔

۱۲۔ایک مومن دوسرے مومن کے لیے برکت ہے۔

۱۳۔بیوقوف کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے۔

۱۴۔دنیا کی تلاش میں کوئی فریضہ نہ گنوا دینا۔

۱۵۔شک کی بنا پر طہارت میں زیادتی قابل تعریف نہیں۔

۱۶۔کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو جب وہ حق کا دامن چھوڑ دے گا تو ذلیل وخوار ہو جائے گا۔

۱۷۔جس کے ساتھ حق ہے وہی دنیا کا بڑا انسان ہے۔

۱۸۔جاہل کی دوستی مصیبت ہے۔

۱۹۔رنجیدہ و غمگین کے سامنے ہنسنا بے ادبی ہے۔

۲۰۔وہ چیز موت سے بدتر ہے جو تمہیں موت سے بہتر نظر آئے۔

۲۱۔تواضع ایسی نعمت ہے جس پر حسد نہیں کیا جا سکتا۔

۲۲۔ہر مصیبت کے پس منظر میں راحت و نعمت ہے۔

۲۳۔دل کا اندھا ہونا ہماری موودت سے غافل ہونا ہے۔

۲۴۔دین کے بارے میں پرہیزگاری کو شعار بناؤ۔

۲۵۔موت اور خدا کے ذکر سے کبھی غافل نہ رہو۔

۲۶۔جو شخص دنیا سے دل کا اندھا اٹھے گا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔

۲۷۔لوگوں کے دلوں میں شرک کا نفوذ اس سے بھی زیادہ پنہاں اور مخفی طریقے سے ہوتا ہے جس طرح تاریک رات میں ایک سیاہ چیونٹی کسی سیاہ پتھر پر چل رہی ہو۔

آپؑ کا عراق کے ایک نام نہاد فلسفی کو شکست دینا:

عراق کے ایک ایک فلسفی اسحاق کندی نے ارادہ کیا کہ قرآن مجید میں نقص ثابت

کرے اور یہ بتائے کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے اور ایک مضمون دوسرے مضمون سے ٹکراتا ہے۔ اس مقصد سے اس نے کتاب ''تناقص القرآن'' لکھنا شروع کی۔ جب امام حسن عسکریؑ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کے اصلاح کی تدبیر کی۔ اتفاقاً ایک روز اس کا ایک شاگرد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ کیا کوئی ایسا نہیں جو اسحاق کندی کو ''تناقص القرآن'' لکھنے سے باز رکھ سکے؟۔ اس نے عرض کی مولا، میں اس کا شاگرد ہوں بھلا اس کے سامنے لب کشائی کیسے کرسکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا یہ تو کر سکتے ہو کہ جو میں کہوں وہ اس تک پہنچا دو۔ اس نے کہا کہ ہاں یہ کرسکتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ پہلے تو تم اس سے موانست پیدا کرو اور اس کا اعتبار حاصل کرو' جب وہ تم سے مانوس ہو جائے اور تمھاری بات توجہ سے سننے لگے تو اس سے کہنا مجھے ایک شبہ پیدا ہو گیا ہے' آپ اس کو دور فرمادیں۔ پھر اس سے کہنا کہ اگر اس کتاب یعنی قرآن کا مالک تمھارے پاس اسے لائے تو کیا ہوسکتا ہے کہ اس کلام سے جو مطلب اس کا ہو وہ تمھارے سمجھے ہوئے معانی ومطالب کے خلاف ہو' جب وہ تمھارا یہ اعتراض سنے گا تو چونکہ ذہین آدمی ہے' فوراً کہے گا بے شک ایسا ہوسکتا ہے۔ جب وہ یہ کہے تو تم اس سے کہنا کہ پھر کتاب ''تناقص القرآن'' لکھنے سے کیا فائدہ؟ کیوں کہ تم اس کے جو معنی سمجھ کر اس پر اعتراض کر رہے ہو' ہوسکتا ہے کہ وہ الٰہی مقصود کے خلاف ہو۔ ایسی صورت میں تمھاری محنت ضائع ہو جائے گی کیوں کہ تناقص تو جب ہوسکتا ہے کہ تمھارا سمجھا ہوا مطلب صحیح اور مقصود الٰہی کے مطابق ہو اور ایسا یقینی طور پر نہیں تو تناقص کہاں رہا؟ الغرض وہ شاگرد اسحاق کندی کے پاس گیا اور اس نے امامؑ کے بتائے ہوئے اصول پر اس سے مذکورہ سوال کیا تو اسحاق کندی حیران رہ گیا اور کہنے لگا پھر سوال دہراؤ، اس نے اعادہ کیا۔

اسحاق کندی تھوڑی دیر کے لئے محو تفکر ہو گیا اور سوچا کہ بے شک اس قسم کا احتمال باعتبار لغت اور بہ لحاظ فکر و تدبر ممکن ہے۔ پھر اپنے شاگرد سے بولا! میں تمھیں قسم دیتا ہوں، تم مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تمھیں یہ اعتراض کس نے بتایا ہے۔ اس نے کہا میرے شفیق استاد یہ میرے ہی ذہن کی پیداوار ہے۔ اسحاق نے کہا ہرگز نہیں یہ تمھارے جیسے علم والے کے بس کی چیز نہیں، تم سچ سچ کہو کہ تمھیں کس نے بتایا اور اس اعتراض کی طرف کس نے رہبری کی ہے۔ شاگرد نے کہا سچ تو یہ ہے کہ مجھے حضرت امام حسن عسکریؑ نے فرمایا تھا اور میں نے انہیں کے بتائے ہوئے اصول پر آپ سے سوال کیا ہے۔ اسحاق کندی بولا ''اب تم نے سچ کہا ہے ایسے اعتراضات اور اہم باتیں خاندان رسالتؐ ہی سے برآمد ہو سکتی ہیں''۔

پھر اس نے آگ منگائی اور کتاب ''تناقض القرآن'' کا سارا مسودہ نذر آتش کر دیا۔

آپؑ کی ذمہ داریاں:

امام مہدیؑ کی ولادت کے بعد امام حسن عسکری پر ان کے بارے میں دو طرح کی ذمہ داریاں تھیں۔ اول یہ کہ امت مسلمہ اور اپنے حامیوں کے درمیان اپنے بیٹے کے وجود کو ثابت کرنا۔ چنانچہ آپ نے حکومت وقت کی طرف سے خطارہ کر مسلمانوں، خاص کر اپنے معتقدین کے درمیان ''وجود مہدی'' کو ثابت کیا تا کہ آئندہ اس قسم کے مہمل خیالات کی نفی کی جا سکے کہ امام مہدیؑ کا کوئی وجود ہی نہ تھا یا امام حسن عسکریؑ کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ اپنے بیٹے کے بارے میں حفاظتی اقدامات، کیوں کہ حکومت آپ کو قتل کرنے کے لیے بہت تگ و دو کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے حکام، افسران اور جاسوسوں کو پوری طرح چوکنا کر دیا تھا کیوں کہ امام مہدیؑ کا وجود ان کی نظر میں موت کا پروانہ تھا۔

ان دونوں مقاصد کے حصول اور اپنے فرزند سے متعلق ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے امام حسن عسکریؑ کے اختیار کردہ مذکورہ بالا موقف میں مزید مشکلات اور پیچیدگیاں حکومت کی طرف سے آپ کی مسلسل نگرانی کے سبب سے تھیں کیوں کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے قائد اور حکومت مخالف محاذ کی نمایاں شخصیت ہونے کی حیثیت سے آپ کے اوپر حکومت کی کڑی نظر تھی۔

ان حالات کے پیش نظر امام حسن عسکریؑ نے اس مشکل مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لئے یہ منصوبہ بنایا کہ امام مہدیؑ کی ولادت کا اعلان نہ کیا جائے اور ایسا ظاہر کیا جائے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اپنے بیٹے کی ولادت کو پوشیدہ رکھنے میں امام حسن عسکریؑ کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ نے اپنے اصحاب سے بالمشافہ ملنا ترک کردیا تھا اور فقط خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ کے حامی آپ کے نمائندوں کے ذریعہ آپ سے روابط رکھنے کے طریقوں کے عادی ہو گئے تھے۔ مختصر یہ کہ آپ اپنے نور چشم کو حکام وقت کے شر سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ امامؑ ہر اس شخص کو جو آپ کے فرزند کی ولادت سے آگاہ ہو، اس امر کو مخفی رکھنے کا حکم دیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے احمد بن اسحاق کو ایک خط میں لکھا، میرے فرزند امام مہدیؑ کی ولادت ہو چکی ہے لیکن یہ خبر عام لوگوں سے مخفی اور تیرے دل میں پوشیدہ رہے۔

اپنے وفادار ساتھیوں کے درمیان امام مہدیؑ کی ولادت کے بارے میں امام حسن عسکریؑ کی طرف سے سب سے بڑا اعلان وہ تھا جو آپ نے اپنی شہادت سے چند دن قبل کیا تھا اور اس اعلان کے وقت آپ کی محفل میں چالیس مخلص افراد موجود تھے۔ ان میں محمد بن عثمان، معاویہ بن حکیم اور محمد بن ایوب وغیرہ بھی شامل تھے۔ آپ نے اس محفل میں اپنے

فرزند کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

''یہ میرے بعد تمہارے امام اور میرے جانشین ہیں، یہ وہی قائم ہیں جن کے انتظار میں لوگ بے چین ہیں۔ جب زمین ظلم و جور سے بھر جائے گی تو یہ خروج کریں گے اور اسے عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔''

مآخذ

(۱) ''چراغ راہ'' شرح دعائے افتتاح۔ آیت اللہ سید عقیل الغروی۔

(۲) ''تفسیر اسلام'' علامہ فروغ کاظمی۔

(۳) ''چودہ ستارے'' مولانا سید نجم الحسن کراروی۔

قرآن اور امام زمانہؑ

اسلام کے پانچ بنیادی اصولوں (توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد) میں "امامت" ایک اہم اور امتیازی اصول ہے۔ امامت وہ منصب الٰہی ہے جو نبوت کی طرح پروردگارِ عالم کی جانب سے ہدایتِ خلق کے لئے عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اکرم کو حکم دیا کی وہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو اپنا جانشین بنائیں تاکہ ختمِ نبوت کے بعد کارِ تبلیغ جاری رہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ میں ارشاد ہوا "اے رسولؐ! تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس کا فوراً اعلان کردو اور اگر اس کام کی انجام دہی میں ذرا بھی تساہل برتا تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم نے کارِ رسالت انجام ہی نہیں دیا۔" تعمیلِ حکم میں حضورؐ نے حجۃ الوداع کے بعد غدیرِ خم میں ایک جم غفیر کے سامنے دن کی روشنی میں واضح اعلان فرمایا: "جس جس کا میں مولا ہوں یہ علیؑ بھی ان کا ولیِ امر (مولا) ہے۔" آپؐ نے لوگوں کو اس اعلان کو آگے پھیلانے کی بھی تاکید کی۔ عقیدۂ امامت کے تحت اللہ تعالیٰ دنیا کو کبھی کسی نبی یا وصی کے وجود سے خالی نہیں رکھتا۔ خواہ یہ "حجت" ظاہر ہو یا غائب۔ جنابِ رسالت مآبؐ نے حضرت علی مرتضیٰؑ کو اپنا وصی بنایا، علیؑ نے حسنِ مجتبیٰؑ کو جانشین کیا اور حضرت امام حسنؑ نے اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ کو یہ امانت سپرد کی۔ اس طرح یہ سلسلہ گیارھویں امام حضرت امام حسن عسکریؑ تک پہنچا۔ انہوں نے اپنے صاحب زادے بارھویں امام حضرت مہدی منتظر سلام اللہ علیہ کو صاحب الامر قرار دیا جو حکمِ الٰہی سے پہلے غیبتِ صغریٰ اور پھر غیبت کبریٰ میں چلے گئے۔ یہاں یہ ذکر

بھی ضروری ہے کہ وفات پیغمبرؐ کے بعد سے مسلمانوں کے دو گروہ وجود میں آ گئے۔ ایک وہ جس نے حضرت علیؑ کی وصایت کو تسلیم کیا اور دوسرا وہ جس نے اللہ اور رسولؐ کے حکم کے برعکس خود جانشین پیغمبر منتخب کرنے کے سلسلے کی بنیاد رکھی۔ یہ سلسلہ چونکہ حکم الٰہی کے برعکس تھا اس لئے چار خلفاء کے بعد تقریباً انتیس سال کے عرصے میں بند ہو گیا۔ پہلے گروہ کا تسلیم کردہ سلسلۂ امامت آج بھی باقی ہے اور بحمد اللہ بارہویں امام حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ حالتِ غیبت میں موجود ہیں اور زمانہ ان کے انتظار میں ہے۔ ان کے ظہور کے سلسلے میں مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر میں احادیث موجود ہیں اور قیامت سے پہلے ان کے آنے، دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دینے اور حضرت عیسیٰؑ کی امامت کرنے کے سب قائل ہیں۔ ان کی حیات طولانی پر انگلیاں اٹھانے والے جناب عیسیٰؑ، جناب خضرؑ، جناب ادریسؑ اور جناب الیاسؑ کے پردہ فرمانے پر نہ جانے کیوں غور نہیں کرتے۔ واضح بات یہ ہے کہ خلقتِ آدمؑ سے شیطان کے ورغلانے کا عمل جاری ہے تو پھر اس کے ساتھ ہی ہدایت کا سلسلہ جاری رکھنا اللہ تعالیٰ کے عین عدل کے مطابق ہے۔

ہے ہدایت کی ضرورت حشر تک انسان کو   اور تقاضہ عدل کا ہونا امامِ عصر کا

امامت کے بارے میں قرآنی احکامات:

صرف ہے بارہ جگہ قرآن میں لفظِ امام
کیا ملا ہے نقطۂ بارہ دری قرآن میں۔

محشر لکھنوی

ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "امام" بارہ جگہ آیا ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

بقرہ (۲) آیت ۱۲۴، توبہ (۹) آیت ۱۲، ھود (۱۱) آیت ۱۷، حجر (۱۵) آیت ۷۹، بنی اسرائیل (۱۷) آیت ۷۱، انبیاء (۲۱) آیت ۷۳، فرقان (۲۵) آیت ۷۴، القصص (۲۸) آیت ۵، القصص (۲۸) آیت ۴۱، سجدہ (۳۲) آیت ۲۴، یٰسین (۳۶) آیت ۱۲ اور الاحقاف (۴۶) آیت ۱۲۔ ان آیات میں لفظ "امام" صراحت سے آیا ہے۔ مفسرین نے لفظ امام کے معنی کہیں "کتاب اللہ"، کہیں "نامہ اعمال"، کہیں "امرائے سرایا"، کہیں "علماء و فقہاء" اور کہیں کچھ اور بنالئے ہیں۔ جیسے لفظ مولا کے بہتر معنی بنالئے گئے۔ قرآن ہی میں لا تعداد جگہ ائمہ اکرام کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً ھادی، راسخون فی العلم، صالح المومنین، مومنین، صادقین، اھل الذکر، محسنین، متقین، مطہرین، مصطفین، شہداء، صدیقین، صالحین، اولی الامر، سبع مثانی وغیرہ وغیرہ۔

اب پیش خدمت ہے ایک آیت قرانی جس کی رو سے نبی یا امام یا کوئی بھی الٰہی منصب دار اللہ کے علاوہ اور کوئی منتخب نہیں کرسکتا۔ سورۂ القصص (۲۸) آیت ۶۸ ترجمہ: "اور تمھارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور یہ انتخاب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے۔" اس سے بالکل واضح طور پر ثابت ہوا کہ الٰہی عہدے صرف اللہ ہی کے انتخاب سے حاصل ہوئے ہیں۔ بندوں کے ہاتھ میں نبوت یا امامت کا انتخاب نہیں کیوں کہ اللہ کے سوا یہ کون جانتا ہے کہ کل فلاں شخص کیسا رہے گا اور اس کے افعال و حرکات کیا ہوں گے۔

ایک آیت ایسی بھی ہے قرآن میں جس میں امام کی مطلق اطاعت کا حکم ہے۔ سورۂ نساء (۴) آیت ۵۹۔ ترجمہ: "اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور جو تم میں صاحبان امر (حکم) ہوں ان کی۔ اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اگر تم اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو یہی

تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔'' اس آیت کی تفسیر کے لئے ہم ''تفسیر القرآن'' از ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اولی الامر سے مراد کون ہیں۔ کوئی کہتا ہے بادشاہانِ وقت مراد ہیں کوئی کہتا ہے امرائے سرایا مراد ہیں، کوئی کہتا ہے علمائے وقت مراد ہیں، کوئی کہتا ہے اس سے وہ معصوم ہستیاں مراد ہیں جو اہلِ بیت رسول کہلاتی ہیں۔ لہٰذا ہم اس پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں:

۱:۔ اس آیت میں لفظ اطیعوا دو جگہ آیا ہے۔ پہلے سے مراد اللہ کی اطاعت ہے دوسرے اطیعوا کے تحت میں دو اطاعتیں ہیں۔ ایک رسولؐ کی دوسرے 'اولی الامر' کی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسولؐ کی اطاعت، اطاعتِ مطلقہ ہے یعنی ہر امر میں ان کی اطاعت واجب ہے، خواہ وہ دنیوی معاملات ہوں یا دینی۔ اسی طرح اولی الامر کی اطاعت واجب ہے۔

۲۔ اولی الامر کی اطاعت اس وقت تک اطاعتِ مطلقہ نہیں ہو سکتی جب تک وہ رسولؐ کی طرح معصوم نہ ہوں۔ کیوں کہ غیر معصوم کی اطاعت باعثِ فتنہ و فساد ہوگی۔

۳۔ اصحابِ رسولؐ میں سے سوائے اہلِ بیت رسولؐ نہ کسی نے خود معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہے نہ کسی کو امت نے بنایا ہے۔

۴۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اطاعت وقتی نہیں، کسی ایک جماعت سے مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک باقی رہے گی۔ آپس میں جھگڑے ہمیشہ ہوتے رہیں گے لہٰذا اگر رسولؐ موجود نہ ہوں تو اولی الامر میں سے کم از کم ایک شخص ہر زمانہ میں ضرور موجود رہنا چاہیئے تا کہ بے غرض ہو کر عدل و انصاف سے ہر نزاع کا فیصلہ کرے۔

۵۔ دینی مسائل میں اگر اختلافی صورت پیدا ہو تو اس کا فیصلہ یا تو رسولؐ کر سکتے تھے یا پھر اولی الامر۔ یہ کام علماء کے بوتے کا نہیں کیوں کہ ان کے درمیان تو ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور رہے گا۔

۶۔ اگر اولی الامر سے مراد بادشاہانِ وقت ہوں تو اسلام کا بیڑا غرق ہو جائے گا کیوں کہ کہیں عیسائی بادشاہ ہے کہیں بودھ کہیں ہندو کہیں مسلمان۔ ایسی صورت میں کس کی اطاعتِ مطلقہ کی جائے گی اور اگر سب کی اطاعت کی جائے تو یہ ناممکن ہے۔

۷۔ اگر کہا جائے کہ صرف مسلمان بادشاہوں کی اطاعت کی جائے تو مسلمان بادشاہ ظالم، فاسق، فاجر ہر قسم کے ہوئے ہیں ایسی صورت میں ان کی اطاعتِ مطلقہ کیسے ہو سکتی ہے۔

۸۔ رہے امرائے سرایا تو وہ بھی معصوم نہ تھے۔ ان سے بار بار غلطیاں ہوئی تھیں۔ فوجیوں کو ان سے شکایات رہتی تھیں۔۔۔۔۔۔اس صورت میں ان کی اطاعتِ مطلقہ کا حکم کیسے دیا جا سکتا تھا۔ (پھر سرایا تو ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جو رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ میں ہوئیں۔ امرائے سرایا تو حضورؐ کی حیات کے بعد ہونے ہی نہیں تھے۔ کیا اس آیت کا اطلاق صرف ایک محدود زمانے کے لئے ہونا تھا؟)

۹۔ رہے علماء تو ان حضرات کی مہربانی سے ایک دین تہتر فرقوں میں تقسیم ہوا اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجی ہوگا، بہتر دوزخ میں جائیں گے۔ اس صورت میں کس فرقہ کے علماء کی اطاعت تمام مسلمان کریں گے۔ اس مصیبت سے بچانے کے لئے رسول اللہؐ نے صاف لفظوں میں اپنی امت کو بتا دیا کہ میرے اہلِ بیت کی مثال سفینۂ نوحؑ کی سی ہے، جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جس نے روگردانی کی ڈوب گیا اور ہلاک ہو گیا۔

۱۰۔ رسولؐ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس نے اپنے امامِ زمانہ کو نہ پہچانا وہ کفر کی موت مرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے اور اس کی معرفت اس زمانہ کے لوگوں پر واجب ہے۔ نیز یہی ولی امر کہلاتا ہے۔ ہر شب قدر ملائکہ احکامِ الٰہی اس کے پاس لے کر آتے ہیں جو نہیں مانتے وہ بتائیں کہ شب قدر جو ہر سال آتی ہے اس میں ملائکہ کس پر نازل ہوتے ہیں۔ رسولؐ کے بعد سے اب تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ غیر معصوم کے پاس ملائکہ آتے ہی نہیں اور نہ وہ اس کا اہل ہے کہ احکامِ الٰہی اس پر نازل ہوں۔

۱۱۔ آیت بتاتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں نزاعی شکل پیدا ہو تو اس میں اللہ کی طرف رجوع کرو یا رسول کی طرف یعنی کتاب وسنت کی طرف۔ لیکن کتاب وسنت یعنی احادیث خاموش ہیں۔ ان سے ہر شخص اپنے مقصد کے مطابق دلیل لاتا ہے۔ جب دونوں فریق قرآن وحدیث سے اپنی اپنی دلیلیں پیش کر رہے ہوں تو اس کا فیصلہ کون کرے کہ حق کس طرف ہے۔ عقلی فیصلہ یہی ہوگا کہ ان کے درمیان حق فیصلہ کرنے والا وہی ہوگا جو معصوم ہو اور قرآن وحدیث کا سب سے بڑا عالم ہو۔ اور رسولؐ نے جس کو اپنے بعد ایسے مسائل حل کرنے کا ذمہ دار بنایا ہو۔ جس کا فیصلہ ہر امر میں ناطق ہو۔ یعنی فیصلہ میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ پس ایسا شخص اہلِ بیت رسولؐ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ان کا علم وہبی تھا، اکتسابی نہ تھا۔ وہبی علم میں غلطی واقع نہیں ہوتی۔ سامنے کی مثال ہے کہ حضرت علیؑ نے ہزار ہا فیصلے عہدِ رسالت سے لے کر اپنی سلطنت کے آخر تک کیے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت نہیں کیا جاسکا، حالانکہ ان کے دشمن اس ٹوہ میں رہتے

تھے کہ کوئی غلط فیصلہ ان سے صادر ہو۔

۱۲۔ ظاہر ہے کہ کسی بادشاہ کی اطاعت نہ کرنے سے کوئی کافر نہیں ہو سکتا لیکن امام زمانہؑ کی اطاعت نہ کرنے والا کفر کی موت مرتا ہے جیسا کہ حدیث مَن مَات سے ظاہر ہے۔

۱۳۔ اللہ فرماتا ہے انما انت منذر ولکل قوم ھاد۔ (اے رسول تم ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے)۔ لہٰذا اس ہادی کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہونی چاہئے۔

۱۴۔ اہلِ بیت رسولؐ کا معصوم ہونا آیت تطہیر سے ظاہر ہے۔ بس جب وہ طہارت میں شریکِ رسولؐ ہیں تو رسولؐ کی طرح معصوم ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اطاعت رسولؐ کی سی اطاعت ہے۔

۱۵۔ اولی الامر کا اطلاق بارہ اماموں پر ہوتا ہے جن کے نام ایک ایک کرکے آنحضرتؐ نے جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ کو بتا دیئے تھے۔

۱۶۔ کوئی یہ نہ کہے کہ جب ان کی اطاعت مثل اطاعتِ رسولؐ امت پر واجب تھی تو ان کے نام کیوں نہ ذکر کئے تو جواب یہ ہے کہ جہاں ذکر کیا تھا وہ کب رہ گئے جو یہ رہ جاتے۔ دوسرے قرآن میں تو بہت سی چیزیں ذکر نہیں کی گئیں، جیسے رکعات نماز، زکوٰۃ کا نصاب، مناسکِ حج۔ پس جیسے ان باتوں کو رسولؐ سے پوچھا گیا اسی طرح اولی الامر کو بھی معلوم کرنا امت کا فرض تھا۔

سورۂ نساء کی اس آیت کے سلسلے میں شیخ صدوقؒ کی کتاب ''کمال الدین وتمام النعمہ'' میں لکھا ہے کہ جناب جابر ابن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ پر یہ آیت (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم) نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم

نے اللہ اور اس کے رسول کو پہچان لیا ہے، یہ اولو الامر کون ہیں جن کی اطاعت آپ کی اطاعت قرار پائی ہے؟ حضور اکرمؐ نے فرمایا: اے جابرؓ وہ میرے خلفاء اور میرے بعد مسلمانوں کے امام ہیں۔ ان میں پہلا فرد علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں۔ پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علیؑ بن حسینؑ پھر محمدؑ بن علیؑ جن کا نام توریت میں باقر ہے اور جن کے زمانے کو تم پاؤ گے۔ پس جب ان سے ملنا تو میرا اسلام ان سے کہنا۔ پھر جعفرؑ بن محمد صادقؑ، پھر موسیٰؑ بن جعفرؑ پھر علیؑ بن موسیٰؑ پھر محمدؑ بن علیؑ پھر علیؑ بن محمدؑ پھر حسنؑ بن علیؑ پھر وہ فرد ہوگا جس کی کنیت اور نام میرا ہوگا اور وہ زمین پر اللہ کی حجت ہوگا۔ اس کے ہاتھوں پر اللہ مشرق و مغرب کی فتح عطا کرے گا۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے شیعوں اور اپنے چاہنے والوں سے غائب رہے گا اور اس کی امامت پر صرف وہی ٹھہرا رہے گا جس کے قلب کا اللہ نے امتحان لیا ہوگا۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ان کی غیبت سے شیعوں کے لئے کیا فائدہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے نبوت سے سرفراز کیا، اس کے نور سے مومن منور ہوں گے اور اس کی غیبت میں اس کی ولایت سے اسی طرح فائدہ اٹھائیں گے جس طرح لوگ آفتاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں جب کہ وہ بادلوں میں چھپ جاتا ہے۔ اے جابرؓ یہ اللہ کے پوشیدہ راز اور اس کے علم کے خزانے ہیں بس اس علم کو صرف اس کے اہل کے سامنے ظاہر کرنا۔

جیسے بخشے فیض سورج بادلوں کی اوٹ سے غیب سے ہے رہبری کرتا امام عصر کا

امام زمانہؑ کے بارے میں سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۲۸ میں ارشاد ہوا: ترجمہ: اور انہوں نے اس پیغام کو اپنی نسل میں کلمۂ باقیہ قرار دیا۔ جب ابو عبد اللہ امام جعفر صادقؑ سے اللہ کے اس قول کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "یہ امامت ہے کہ اللہ عز و جل نے اس کو نسلِ حسینؑ میں قیامت کے دن تک باقی قرار دیا۔" ("معانی الاخبار" تالیف شیخ

صدوق ابن بابویہ ابی جعفر محمد بن علی بن حسین قمی۔ مترجم دلاور حسین نجفی۔ ناشر الکساء پبلشرز، کراچی)۔

امام مہدیؑ کا ذکر قرآن مجید میں مندرجہ بالا آیت کے علاوہ اور کئی جگہ ہے۔ ۱۱ویں سورہ ہودؑ کی آیت ۸۶ میں ارشاد ہوا: ''بقیت اللہ خیر لکم ان کنتم مومنین'' (ترجمہ) ''اللہ نے تمہارے لئے جو سرمایہ باقی رکھا ہے، وہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔'' اس آیت کی تفسیر میں مولانا حافظ سید فرمان علی، اعلی اللہ مقامہٗ فرماتے ہیں: ''صباغی نے جو اہلِ سنت کے ایک زبردست عالم ہیں، ''فصول مہمہ'' میں ایک طولانی حدیث امام آخر الزمانؑ کے ظہور کے علامات میں امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے۔ اس کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت ہمارا قائم ظہور کرے گا اور خانہ کعبہ کی دیوار پر سہارا دے کر کھڑا ہوگا اور خالص مومنین سے تین سو تیرہ آدمی اس کے پاس جمع ہوں گے تو سب سے پہلے وہ اس آیت (بقیت اللہ خیر لکم ان کنتم مومنین و انا علیکم بحفیظ) کی تلاوت کرے گا اور کہے گا ''میں بقیہ خدا اور اس کا خلیفہ اور تم پر اس کی حجت ہوں۔'' اس وقت سے تمام لوگ یا بقیۃ اللہ کہہ کر ان کی طرف خطاب کریں گے۔ تفسیر القرآن از ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن امروہوی میں ان عالم کا نام ''صباغی'' اور کتاب کا نام ''فصول المہمہ'' لکھا ہے۔

اسی آیت (سورۂ ہود، آیت ۸۶) کی تفسیر، ''تفسیر نمونہ'' میں اس طرح ہے۔ ''متعدد روایات میں ہے کہ بقیت اللہ سے صرف حضرت مہدی علیہ السلام یا بعض دوسرے ائمہ کے وجود کی طرف اشارہ ہے۔ ان روایات میں سے ایک کتاب اکمال الدین میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''پہلی بات جو حضرت مہدیؑ اپنے قیام کے بعد کریں گے وہ یہ آیت ہوگی۔ ''بقیت اللہ خیر لکم ان کنتم مومنین۔'' اس کے بعد کہیں گے: ''میں بقیۃ اللہ ہوں اور تم میں اس کی حجت اور خلیفہ ہوں۔'' لہٰذا اس کے بعد کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اس

طرح سے آپؑ پر سلام نہ کرے گا: ''السلام علیک یا بقیۃ اللہ فی ارضہ'' یعنی اے اللہ کی زمین میں بقیۃ اللہ! آپؑ پر سلام ہو۔ آیات قرآن اگرچہ خاص مواقع کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا مفہوم جامع ہے اور یہ ممکن ہے کہ بعد کے زمانوں میں وہ زیادہ اور وسیع مصداق پر منطبق ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ زیرِ بحث آیت میں قومِ شعیب مخاطب ہے اور ''بقیۃ اللہ'' سے مراد حلال سرمایہ ومنافع اور جزائے الٰہی ہے لیکن ہر نفع بخش موجود کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بشر کے لئے باقی ہے اور خیر وسعادت کا باعث ہے اسے ''بقیۃ اللہ'' شمار کیا جاسکتا ہے۔

تمام انبیائے الٰہی اور بزرگ ہادی ''بقیۃ اللہ'' ہیں۔ تمام سچے رہبر کہ جو ایک سخت ترین دشمن سے مقابلے کے بعد ایک قوم وملت کے لئے باقی رہ جاتے ہیں اس لحاظ سے ''بقیۃ اللہ'' ہیں۔ اسی طرح جو مجاہد سپاہی کامیابی کے بعد میدانِ جنگ سے پلٹ آتے ہیں وہ بھی ''بقیۃ اللہ'' ہیں۔ حضرت مہدی موعود علیہ السلام چونکہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد آخری پیشوا اور عظیم ترین انقلابی قائد ہیں ''بقیۃ اللہ'' کے مصادیق میں سے ایک روشن ترین مصداق ہیں اور ہر کسی سے بڑھ کر اس لقب کے اہل ہیں، خصوصاً جب کہ آپؑ انبیاء اور ائمہ کے واحد باقی ماندہ ہیں۔''

امام زمانہؑ کے وجود اور ان کی امامت پر اللہ تعالیٰ کی نص:

جناب ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب میں معراج پر گیا تو مجھے آواز آئی: ''اے محمدؐ'' میں نے کہا: لبیک رب العزت لبیک۔ پس اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کی: ''اے محمدؐ ملاء الاعلیٰ میں کس بات پر نزاع ہے؟'' میں نے عرض کیا۔ الٰہی مجھے علم نہیں۔ ارشاد ہوا کیا تم نے آدمیوں میں اپنے بعد اپنا وزیر، بھائی اور وصی مقرر نہیں کیا ہے؟ عرض کیا: مالک میں کس کو اپنا وزیر مقرر کروں اس کو میرے لئے منتخب

کر دے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کی: ''اے محمد علیؑ تمہارے بعد تمہارے علم کا وارث ہے۔ وہ قیامت کے روز تمہارے لواء الحمد کو اٹھانے والا ہے، وہ ساقی کوثر ہے اور تمہاری امت کے مومنین کو سیراب کرے گا۔ پھر ارشاد ہوا۔ اے محمدؐ میں نے اپنے حق کی قسم کھائی ہے کہ اس حوض سے تمہارے اور تمہارے اہلِ بیت اور تمہاری ذریت طیبین و طاہرین کے دشمنوں کو ہرگز سیراب نہ کروں گا۔ اے محمدؐ میں تمہاری ساری امت کو جنت میں داخل کروں گا سوائے ان لوگوں کے جو جنت میں جانے سے انکار کریں گے۔ میں نے عرض کیا: مالک کیا کوئی ایسا بھی شخص ہوگا جو جنت میں جانے سے انکار کرے گا؟ فرمایا: ہاں! میں نے پوچھا: وہ کیوں کر انکار کرے گا؟ ارشاد ہوا: اے محمدؐ میں نے اپنی مخلوق میں تم کو چن لیا ہے اور تمہارے بعد تمہارے وصی کو چن لیا ہے اور اس کی تمہارے ساتھ وہ منزلت قرار دی ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ تمہارے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اور اس کی محبت تمہارے دل میں قرار دی اور اس کو تمہاری ذریت کا باپ قرار دیا ہے۔ پس اس کا حق تمہاری امت پر تمہارے بعد اسی طرح ہے جس طرح تمہارا حق امت پر تمہاری حیات میں ہے۔ پس جس نے اس کے حق کا انکار کیا اس نے تمہارے حق کا انکار کیا اور جس نے اس کی ولایت سے انکار کیا اس نے تمہاری ولایت سے انکار کیا اور جس نے تمہاری ولایت سے انکار کیا اس نے گویا جنت میں جانے سے انکار کیا۔ پس میں اللہ عزوجل کے لئے سجدہ میں گر گیا اور ان نعمتوں کا شکر بجا لایا جو اللہ نے مجھ پر کیں۔ پس آواز آئی: اے محمدؐ سر کو اٹھاؤ اور مجھ سے سوال کرو تاکہ میں تمہیں عطا کروں۔ میں نے عرض کیا: پروردگار! میری تمام امت کو میرے بعد علیؑ ابن ابی طالب کی ولایت پر جمع کر تاکہ وہ مجھ سے روز قیامت میرے حوض پر ملیں۔ وحی ہوئی: اے محمدؐ میں نے اپنے بندوں کے بارے میں ان کو خلق کرنے سے پہلے فیصلہ کر لیا اور میرا فیصلہ ان میں نافذ ہو

چکا۔ پس میں جسے چاہوں گا ہلاک کروں گا اور جسے چاہوں گا ہدایت کروں گا۔ پس میں نے تمہارے بعد تمہارا علم اسے دیا اور تمہارے بعد اسے تمہارے اہل بیت اور امت پر تمہارا وزیر اور خلیفہ بنایا اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ (جو اس سے محبت کرے گا اسے ضرور جنت میں داخل کروں گا اور) جو اس سے بغض رکھے گا اس سے دشمنی کرے گا، اس کی ولایت سے انکار کرے گا اس کو جنت میں داخل نہ کروں گا۔ پس جو علیؑ سے بغض رکھے اس نے تم سے بغض رکھا اور جس نے تم سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ جس نے اس سے دشمنی کی اس نے تم سے دشمنی کی اور جس نے تم سے دشمنی کی اس نے مجھ سے دشمنی کی۔ جس نے اس سے محبت رکھی اس نے تم سے محبت رکھی اور جس نے تم سے محبت رکھی اس نے مجھ سے محبت رکھی۔ میں نے اس کے لئے یہ فضیلت قرار دی اور میں اس کے صلب سے تم کو گیارہ ہادی دوں گا۔ جو سب بتولؑ سے ہوں گے۔ ان میں آخری فرد کے پیچھے عیسیٰؑ ابن مریمؑ نماز ادا کریں گے اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔ اس کے ذریعہ ہلاکت سے نجات اور گمراہی سے ہدایت ملے گی۔ اس کے ذریعہ اندھے کو بینائی اور مریض کو شفا ملے گی۔ میں نے عرض کیا مالک اس کا ظہور کب ہوگا؟ ارشاد ہوا: جب علم اٹھ چکا ہوگا اور جہالت پھیل چکی ہوگی۔ قرآن کی قراءت زیادہ ہوگی اور اس پر عمل کم ہوگا۔ قتل کثرت سے ہوں گے۔ فقہاء حق کم ہوں گے رفقہاء باطل زیادہ ہوں گے۔ شعراء کثرت سے ہوں گے اور تمہاری امت قبروں کو سجدہ گاہ بنا لے گی۔

امام قائمؑ کی امامت پر رسول اللہ کی نص:

عبدالرحمٰن بن سمرہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے نجات کے راستے کی ہدایت فرمائیں۔ حضورؐ نے فرمایا: اے ابن سمرہ جب تم دیکھو کہ

لوگوں کے درمیان کئی آراء ہیں اور ان میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں تو تمہیں چاہیے کہ علیؑ کا دامن تھام لو، وہ میری امت کا امام ہے اور میرے بعد ان پر خلیفہ ہے۔ وہ فاروق ہے جس کے ذریعہ حق و باطل کے درمیان تمیز ہوتی ہے۔ پس جس نے اس سے سوال کیا اس نے جواب پایا۔ جس نے اس سے راہ نجات چاہی اسے راستہ ملا۔ جس نے راہ حق چاہی اس کو راہ حق ملی، جس نے اس سے ہدایت چاہی وہ ہدایت یافتہ ہوا۔ جو اس تک پہنچا وہ امان میں آیا۔ جس نے اس سے تمسک کیا وہ نجات یافتہ ہوا۔ جس نے اس کی اقتداء کی وہ کامیاب ہوا۔ اے ابن سمرہ تم میں سے اس کے لئے سلامتی ہے جس نے اس کے حق کو تسلیم کیا اور اس سے تولا کیا۔ اور وہ ہلاک ہوا جس نے اس کے حق کو رد کیا اور اس سے بغض رکھا۔ اے ابن سمرہ علیؑ مجھ سے ہے۔ اس کی روح میری روح سے ہے۔ اس کی طینت میری طینت سے ہے۔ وہ میرا اور میں اس کا بھائی ہوں۔ وہ میری بیٹی فاطمہؑ کا شوہر ہے جو اول و آخر تمام جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے اس سے میری امت کے امامین اور جوانان جنت کے سردار حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ اور حسینؑ کی اولاد سے نو ائمہ ہوں گے جن میں کا نواں میری امت کا قائم ہوگا جو زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔

امام زمانہؑ کی امامت پر اللہ اور رسولؐ کے علاوہ امیر المومنینؑ اور تمام ائمہؑ کرام کی نصوص سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے اپنے زمانے کے امام کو نہ صرف پہچانا بلکہ ان سے وابستگی بھی رکھتے ہیں۔ ہم ان کی خدمت میں عریضے پیش کرتے ہیں، استغاثہ کرتے ہیں اور وہ ہماری دادرسی کرتے ہیں۔ ہمارے ماں باپ اور ہماری جانیں اس قائم پر قربان جو پیغمبر اسلام کا ہم نام ہے اور جس کی کنیت بھی پیغمبر کی کنیت ہے۔ جس کے مشہور

القاب "مہدی"، "قائم"، "حجت"، "منتظر" اور "بقیۃ اللہ" ہیں۔ یہ گلِ یگانہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اور جناب نرجس خاتون سلام اللہ علیہا کے چمن سامرہ میں جمعہ ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کو جلوہ افروز ہوا اور مشیت الٰہی سے پہلے غیبت صغریٰ اور پھر غیبت کبریٰ کے لطیف حجابوں میں آرام فرما ہے۔ جب تک اللہ چاہے گا آپؑ زندہ رہیں گے اور جس دن اللہ حکم دے گا ظہور فرمائیں گے اور دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ ان شاء اللہ۔

محسنینِ اسلام

شیبۃ الحمد جناب عبدالمطلبؑ

قرآن مجید فرقان حمید کے سورۂ آل عمران کی آیت ۳۳ اور ۳۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) بے شک اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو سارے جہاں سے برگزیدہ کیا ہے، بعض کی اولاد کو بعض سے اور اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ معمولی سی فہم رکھنے والا انسان اس آیت کے صرف ظاہری ترجمہ سے اندازہ کر سکتا ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ دو برگزیدہ نبیوں کا اور دو برگزیدہ خاندانوں کی بزرگی کا اعلان فرما رہا ہے۔ یہ دو نبی جناب آدمؑ اور جناب نوحؑ ہیں جب کہ دو خاندان آل ابراہیم اور آل عمرانؑ ہیں۔ عمران جناب مریمؑ کے والد بزرگوار کا نام ہے۔ جناب مریمؑ کی بزرگی جناب عیسیٰؑ کو جنم دینے کے باعث ہے۔ ایک عبادت گزار اور عزت دار خاندان کی کنواری لڑکی کا ایسا مشکل کام اور وہ بھی صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر، اللہ اور اس کے ایستادہ فرشتہ پر ایمان کے باعث۔ یہی بات اللہ کو ایسی پسند آئی کہ آپ کو خواتین عالم کی چار بزرگ ترین خواتین میں شامل فرمایا۔ جناب عیسیٰؑ کی شادی نہیں ہوئی۔ اس طرح آل عمران صرف تین شخصیات ہیں، جناب عمران، جناب مریمؑ اور جناب عیسیٰؑ ۔ دوسرے خاندان یعنی آل ابراہیمؑ میں نسل جناب اسحاقؑ اور جناب اسماعیلؑ سے چلی۔ جناب اسحٰقؑ کی نسل کے آخری فرد جناب عیسیٰؑ تھے جب کہ جناب اسماعیلؑ کی نسل سے ہمارے نبی اکرمؐ محمد مصطفیٰ صلی اللہ و علیہ و آلہ وسلم تھے۔ اس طرح ثابت ہو گیا کہ جناب عمرانؑ (والد جناب مریمؑ) اور جناب عیسیٰؑ بھی آل ابراہیمؑ ہیں۔ آیت میں ترتیب الفاظ اور انبیاء کی آمد کی ترتیب زمانی سے بھی

ظاہر ہو رہا ہے کہ انبیاء اسی ترتیب سے آئے ہیں، یعنی جناب آدمؑ، جناب نوحؑ اور جناب ابراہیمؑ۔ آلِ ابراہیمؑ کے بعد آلِ عمران (اگر آلِ عمران سے مراد جناب مریمؑ اور جناب عیسیٰؑ) لئے جائیں تو نامناسب ہے کیوں کہ حضور اکرمؐ جناب عیسیٰؑ کے بعد تشریف لائے۔ اور آیت میں لفظ آلِ عمران، آلِ ابراہیمؑ کے بعد ہے۔ یہاں آلِ عمران سے مراد آلِ ابوطالب ہے کیوں کہ جناب ابوطالب کا اصل نام عمران تھا اور ان کی آل کا سلسلہ بہت وسیع ہے بلکہ ان کی آل کا ایک فرد معصومؑ آج بھی (پردۂ غیبت میں) موجود ہے۔

اللہ نے آلِ ابراہیمؑ کی بزرگی کا اعلان جناب رسالت مآبؐ کی وجہ سے کیا۔ اور جب آلِ ابراہیمؑ کا سلسلہ بزرگ ٹھہرا تو اس سلسلے کو نجیب و طاہر رکھنے کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ یہ نورِ رسالت نسل در نسل پاک و صاف اصلاب شامخہ اور ارحام مطہرہ سے ہوتا ہوا حضور اکرمؐ تک پہنچا۔ سورۂ شعراء کی آیت ۲۱۹ اس پر شاہد ہے۔ ''اور سجدہ گزاروں میں تمہاری نقل و حرکت کو دیکھتا ہے۔'' (تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے اس جملہ کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے ''انبیاء کی صلبوں میں رکھا'' ایک پیغمبر سے دوسرے پیغمبر کے صلب میں، یہاں تک کہ اللہ نے آپؐ کو آپؐ کے باپ کے صلب سے باہر نکالا پاکیزہ نکاح کے ساتھ اور ہر چیز کی ناپاکی اور آلائشوں سے دور رکھا۔) اب ذرا جناب ابراہیمؑ کی دعا کو یاد کیجئے کہ جب آپؑ کو انسانوں کا امام ہونے کی خوشخبری دی گئی تو آپؑ نے فرمایا ''یا اللہ اس سلسلہ کو میری ذریت میں باقی رکھ۔'' اس پر اللہ کا جواب آیا کہ ہاں ہم اس سلسلہ امامت کو آپؑ کی ذریت میں باقی رکھیں گے مگر ان کے لئے نہیں جو ''ظالمین'' (گناہ گار) ہوں گے (سورۃ البقرہ، آیت ۱۲۴ تا ۱۲۸)۔ جب اعلان رسالت ہو گیا اور ہم حضور اکرمؐ کی رسالت پر ایمان لے آئے تو ہمیں یقین ہونا چاہئے کہ ذریتِ جناب ابراہیمؑ کے جس سلسلے سے جناب

رسالت مآبؐ کا تعلق ہے وہ گناہ گار یا ظالمین میں سے نہیں ہے بلکہ برگزیدہ، پاک و پاکیزہ اور اللہ واحد کا سجدہ گزار ہے۔ مندرجہ بالا آیات قرآنی اس پر نص ہیں۔

''حضورؐ کے والدین'' نامی کتاب میں جناب طاہر منصور فاروقی فرماتے ہیں کہ علمائے انساب نے حضورؐ کا شجرہ مبارک حضرت عبداللہ سے حضرت آدمؑ تک بیان کیا ہے اور کچھ نے حضرت عبداللہ سے حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ تک، لیکن درست قول یہی ہے کہ حضرت عبداللہ سے جناب عدنان تک شجرہ بلا شک وشبہ درست ہے۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں:۔۔۔۔۔عدنان اور حضرت اسماعیل کے درمیان ۳۷ پشتوں کی روایات بھی ہیں۔ جناب عدنان سے جناب ہاشم کا سلسلہ اس طرح ہے: جناب عدنان، جناب معد، جناب نزار، جناب مضر، جناب الیاس، جناب مدرکہ، جناب خزیمہ، جناب کنانہ، جناب نضر، جناب مالک، جناب فہر، جناب غالب، جناب لوئی، جناب کعب، جناب مرہ، جناب کلاب، جناب قصی، عبد مناف اور جناب ہاشم۔

جناب ہاشم کی شادی عدی بن نجار کے ایک شخص عمرو بن زید خزرجی کی بیٹی جناب سلمٰی سے ہوئی۔ جناب ہاشم اور جناب عبداللہ (والد بزرگوار جناب رسالت مآب) کے حالات بہت مشابہ ہیں۔ بچہ کی ولادت کے وقت جناب ہاشم اپنی زوجہ جناب سلمٰی کو یثرب (جو بعد میں مدینۃ النبی قرار پایا) ان کے والدین کے پاس چھوڑ کر سفر پر چلے گئے۔ غزہ میں وہ رحلت فرما گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ اس دوران جناب سلمٰی کے ہاں جناب شیبہ پیدا ہوئے۔ بچے کے چند بال پیدائش کے وقت سفید تھے، اس مناسبت سے انہیں سفید بالوں والا یعنی شیبہ پکارا جانے لگا۔ کچھ بڑا ہونے پر کچھ بزرگوں نے ان کی عادات واطوار دیکھ کر کہا کہ یہ طویل عمر پائیں گے اور لوگ ان کو حمد وثناء کے ساتھ یاد رکھیں گے۔ اس وجہ سے آپ کو شیبۃ الحمد کہا جانے لگا۔ جناب شیبۃ الحمد بہت ذہین، فہیم اور اپنے ہم عمر بچوں سے

بہت مختلف تھے۔ کھیل کود یا دیگر بے مقصد کاموں سے واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ ان دنوں جناب ہاشم کے بھائی جناب مطلب بن عبد مناف مکہ میں تھے۔ جناب شیبۃ الحمد اپنے چچا کے منتظر تھے۔ جب انہیں ایک بار مکہ کا ایک شخص ملا تو آپ نے ان کے ذریعہ جناب مطلب کو پیغام بھجوایا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ جناب مطلب کو جیسے ہی یہ پیغام ملا تو آپ فوراً مدینہ پہنچے اور جناب شیبۃ الحمد کی والدہ اور ان کے نانا سے اجازت لے کر انہیں اپنے ہمراہ مکہ لے آئے۔

جناب مطلب جب مکہ پہنچے تو ان کے ساتھ ایک نوعمر لڑکے کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھے کہ مطلب کوئی غلام خرید کر لائے ہیں۔ کسی نے کہا "ھٰذا عبد المطلب" یعنی کیا یہ مطلب کا غلام ہے۔ جناب مطلب نے فرمایا "نہیں! یہ میرا بھتیجا شیبۃ ہے"۔ جناب شیبہ کو یہ بات ایسی اچھی لگی کہ اپنے آپ کو زندگی بھر عبد المطلب یعنی اپنے چچا مطلب کا غلام کہلوایا۔ آپ کا یہ لقب ایسا مشہور ہوا کہ لوگ آپ کا اصل نام بھول گئے اور اسی لقب سے آپ تا زندگی پکارے گئے۔

جناب مطلب ایک مثالی چچا تھے۔ خاندان نبوت میں ایسے ہی ایک چچا جناب ابو طالب تھے جنہوں نے اپنی اور اپنے بیٹوں کی زندگیوں پر کھیل کر یتیم بھتیجے کی کفالت اور حفاظت کی۔ کربلا میں ایسے ہی ایک چچا جناب عباس علمدارؑ نظر آتے ہیں جنہوں نے بھتیجی بھتیجوں کی مثالی خدمت اور حفاظت کی۔ اپنی زندگی ہی میں جناب مطلب نے اپنے مرحوم بھائی حاشم کی نشانی کو اپنا وارث بنالیا۔ سعادت مند بھتیجے نے چچا کی خواہش کا احترام کیا اور ان کے تمام امور ان کی وفات کے بعد سنبھال لئے۔ اور انتہائی خوش اسلوبی سے قوم کی خدمت اور سرداری کا کام سرانجام دے کر وہ مقام و مرتبہ حاصل کیا جو ان کے بزرگوں میں سے کسی نے بھی حاصل نہ کیا تھا۔ جناب عبد المطلب کے کارہائے نمایاں بہت سے ہیں اور

تاریخ میں ان کی تفصیل بھری پڑی ہے۔ ان میں سے چاہِ زم زم کی بازیابی، اصحاب فیل کا واقعہ اور دعائے استسقاء زیادہ مشہور ہیں۔

زم زم کی دریافت:

چاہِ زم زم کے اجراء کا واقعہ سب جانتے ہیں۔ اللہ کا یہ انعام ایک ماں کے اضطرابِ فطری اور ایک معصوم شیر خوار کی بے تابانہ پیاس سے مربوط ہے۔ جناب عبدالمطلب کے حوالے سے زم زم سے وابستہ ایک واقعہ کا تذکرہ ممتاز محقق سید جاوید حسن رضوی کی معرکۃ الآرا کتاب "حضرت عبدالمطلب ابن حضرت ھاشم" (مطبوعہ اظہار سنز پرنٹرز، لاہور) سے:۔

آبِ زم زم سے تمام حاجی حضرت اسماعیلؑ سے لے کر بنی جرھم تک فیض یاب ہوتے رہے۔ جب بنی جرھم کا زوال ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ بنی خزاعہ ان پر غالب آ رہے ہیں تو انھوں نے خانۂ کعبہ کا تمام اثاثہ جس میں سونے اور چاندی کے علاوہ دو سونے کے ہرن اور دس تلواریں تھیں سب کو چشمۂ زم زم میں چھپا دیا اور چشمہ کو اس طرح بند کر دیا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ قبیلہ خزاعہ اس وقت تک مکہ پر قابض رہا جب جناب قصیٰ کا زمانہ آیا۔ قصیٰ نے مکہ پر دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور کعبہ کے متولی ہو گئے۔ مگر اس عرصہ میں لوگ چشمہ زم زم کو بھول چکے تھے۔ اس لئے قصیٰ پھر ان کے بعد عبدِ مناف پھر ھاشم اور ان کے بعد مطلب کسی کو اس طرف خیال نہ آیا۔ غالباً آبِ زم زم ایک افسانہ بن چکا تھا۔

حضرت عبدالمطلب کا معمول بن چکا تھا کہ وہ خانۂ کعبہ کے سامنے اپنی مسند بچھا کر بیٹھے رہتے اور رات کو عبادت کے بعد اکثر وہیں سو بھی جایا کرتے تھے۔ ایک رات اسی طرح سو رہے تھے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی بزرگ آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ برہ کو کھودو۔ جب بیدار ہوئے تو اپنے خواب پر بہت زور دیا مگر برہ سے ان کی

سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دوسرے روز پھر خواب میں دیکھا کہ وہی بزرگ کہہ رہے ہیں کہ طیبہ کو کھودو۔ مگر دن بھر غور وفکر کے باوجود ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر تیسرے دن خواب میں اسی طرح دیکھا کہ وہی بزرگ کہہ رہے ہیں کہ میمونہ کو کھودو۔ جناب عبدالمطلب دن بھر اس گتھی کو سلجھاتے رہے مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ چوتھے دن اسی بزرگ نے کہا زم زم کو کھودو یہ اس جگہ ہے جہاں ایک سفید کو اچیونٹیوں کے ایک بل پر بیٹھا دن بھر چیونٹیوں کو کھاتا رہتا ہے۔ حضرت عبدالمطلب اب جو بیدار ہوئے تو فوراً اس مقام کی تلاش میں نکل پڑے اور آخر کار اس کو تلاش کر کے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا اور نشان لگا دیا۔ کھدائی کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے تمام قریش کو جمع کیا اور اپنا خواب بیان کیا اور کہا کہ اگر تم لوگ میرے کام میں میری مدد کرو تو اللہ تعالیٰ ہم سب کو آب کثیر عطا کرے گا جو تمام حاجیوں کے لئے بہت بڑی نعمت ہوگی۔ اہل قریش نے ان کی باتیں سن کر قہقہہ لگایا اور کہا ہم ایسی فضول باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ ہم بلاوجہ کیوں محنت کریں۔ یہ کہہ کر سب چلے گئے۔ دوسرے دن حضرت عبدالمطلب نے پھر ان لوگوں کو بلایا اور سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ انھوں نے کہا تمھارے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تو یہ کام تم خود کرو ہم کیوں کریں؟

قریش کے واپس جانے کے بعد حضرت عبدالمطلب نے ارادہ کرلیا کہ وہ اکیلے ہی اس کام کو سرانجام دیں گے۔ آخر انھوں نے اللہ کا نام لیا اور کھدائی شروع کردی۔ تنہا کام کرتے کرتے آدمی اکتا جاتا ہے مگر جناب عبدالمطلب ایک عزم کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ خواب پر ان کو پورا یقین تھا۔ اس وجہ سے ان کے قدم ڈگمگائے نہیں۔ وہ برابر کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کو زمانہ قدیم کے آثار ملنا شروع ہوگئے اور ان کی ہمت بلند ہوتی چلی گئی۔ کچھ دنوں کی محنت کے بعد پانی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور اب حوصلے بلند

تر ہونے لگے۔ ایک مقام پر پہنچ کر سخت بو محسوس ہوئی مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔ تھوڑی ہی کھدائی اور کی تھی کہ وہ چاہ خوشبوؤں سے بس گیا۔ خوشبو ملتے ہی آپ نے ہمت کی اور کچھ ہی نیچے گئے تھے کہ پانی نکل پڑا۔

اس کامیابی کی خبر اہل قریش کو ہوئی تو وہ اپنی عادت کے بموجب حسد کے بخار میں مبتلا ہو گئے اور آ کر کہنے لگے چاہ زم زم پر تمہارا اکیلے کا حق نہیں ہے ہم بھی اس کے وارث ہیں۔ جناب عبدالمطلب نے فرمایا کہ جب میں نے تم سے کہا تھا کہ آؤ مل کر کھودیں تب تم نے انکار کیا اور کہا کہ ہم بیکار کام نہیں کرتے، اب جبکہ پانی نکل آیا ہے تو تم بھی اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہو۔ اس طرح آپس میں کافی نوک جھونک ہونے لگی اور قریب تھا کہ دونوں طرف سے تلواریں نکل آتیں، قریش کے ایک مرد بزرگ نے رائے دی کہ آپس میں خون خرابہ کرنے کے بجائے کیوں نہ ملک شام کی زن راہبہ سے، جو اپنے عدل کی وجہ سے مشہور ہے فیصلہ کرائیں۔ آخر اس بات پر سب راضی ہو گئے۔ حضرت عبدالمطلب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ قریش کے ساتھ ملک شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان لوگوں کا گزر ایک ایسے لق ودق ریگستان سے ہوا جہاں دور دور تک پانی کا نام ونشان نہ تھا۔ عین اس وقت حضرت عبدالمطلب اور ان کو ساتھیوں کا پانی کا ذخیرہ بالکل ختم ہو گیا۔ آپ نے قریش سے کہا کہ ہمارے پاس پانی ختم ہو گیا ہے۔ ہم نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ پیچھے واپس ہو سکتے ہیں۔ تم اپنے پانی میں ہم کو بھی شریک کر لو اس کے بدلے میں ہم تم کو پانی یا اس کی قیمت ادا کر دیں گے مگر قریش پانی دینے کو تیار نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ گروہ جناب عبدالمطلب کا پیاس کی شدت سے برا حال ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر قریش بہت خوش ہوئے۔ جب حضرت عبدالمطلب نے یہ دیکھا کہ اب سوائے موت کوئی چارہ نہیں، تو آپ نے ساتھیوں سے کہا کہ سب اپنی اپنی قبریں کھود لو تاکہ جو مرتا جائے اس کو دفن کرتے جائیں اور اس طرح

درندوں کے نقصان سے محفوظ رہیں گے۔ جب قبریں تیار ہو گئیں تو حضرت عبدالمطلب نے ایک بار پھر قریش کو بلایا اور کہا میں پھر تم سے پانی کی درخواست کرتا ہوں اور اس کا عوض ملک شام پہنچ کر ادا کر دوں گا۔ مگر قریش نے انکار کیا اور کہا ہم تم کو پانی تو نہیں دیں گے ہاں یہ کریں گے کہ تم سب کو قبروں میں ڈال کر بند کر دیں گے اور مکہ جا کر تمھارے گھر والوں کو یہ خبر سنا دیں گے اور چاہ زم زم پر قبضہ کر لیں گے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے خیموں میں چلے گئے۔ حضرت عبدالمطلب ہاتھ بلند کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوئے "اے مالک حقیقی جب بھی میں نے اس نور کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کیا جو میری پیشانی میں ہے تو نے میری مشکل آسان کی ہے۔ آج پھر میں اسی نور کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں تو مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو اس مصیبت سے نکال دے۔" اس کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا تم ناقوں پر سوار ہو کر چاروں طرف پھیل جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو پانی ضرور مل جائے گا۔ حضرت عبدالمطلب خود ایک سمت کو روانہ ہوئے۔ ابھی چند ہی قدم گئے تھے کہ اونٹ کو ٹھوکر لگی۔ آپ نے جھک کر نیچے دیکھا تو پانی کا چشمہ ابل رہا تھا۔ تمام ساتھیوں کو آواز دی سب جمع ہو گئے۔ حضرت عبدالمطلب سجدہ شکر میں جھک گئے۔ سب نے سیر ہو کر اس آب شیریں کو پیا اور مشکیزوں میں بھر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ قریش کو آواز دی اور کہا ہم کو ہمارے رب نے پانی دیا ہے آؤ تم بھی جی بھر کر پیو۔ جانوروں کو دو اور آگے کے لئے جمع کر لو۔ یہ سن کر قریش حیرانی کی حالت میں دوڑ پڑے۔ اللہ کا فیض و کرم جو آپ پر نازل ہوا اور اپنی بدسلوکی کے جواب میں جو کشادہ دلی کا مظاہرہ دیکھا تو اس پر بہت نادم و شرمسار ہوئے۔ پانی پینے کے بعد انھوں نے کہا اے عبدالمطلب واقعی تم اللہ کے مقرب ہو اور سرداری کے لائق ہو۔ اب ہم یقین کرتے ہیں کہ تم آب زم زم کو اسی طرح وقف رکھو گے۔ اب ہم آگے نہیں جائیں گے اور تمھاری بات پر راضی رہیں گے۔ اس طرح قریش نے آب زم زم سے اپنا

دعویٰ واپس لے لیا۔ (یہاں پانی کے بارے میں جناب امیرالمومنینؑ کی جنگِ صفین میں وہ دریادلی یاد آتی ہے کو دشمن نے دریا پر قبضہ کر کے آپؑ اور آپؑ کے سپاہیوں پر پانی بند کر دیا تھا اور جب آپؑ نے اس دریا پر قبضہ حاصل کیا تو کسی پر پانی بند نہ کیا۔ یہی سنت نواسہ رسولؐ شہید کربلا نے جاری رکھی۔ کربلا پہنچنے سے قبل جب دشمن کے پیاسے سپاہی نظر آئے تو مشکوں کے دہانے کھول دیئے۔ وہی پانی اگر حسینؑ کے پاس ذخیرہ رہتا تو دریا سے ہٹائے جانے کے باوجود کافی دنوں تک ان کے کام آتا۔)

واپسی پر جب حضرت عبدالمطلب نے چاہ زم زم کی کھدائی مکمل کرنی چاہی تو سونے کے ہرن، کچھ تلواریں اور سونا چاندی ملا۔ قریش نے پھر ان قیمتی اشیاء سے اپنا حصہ طلب کیا مگر قرعہ اندازی پر بمشکل راضی ہوئے اور جب قرعہ جناب عبدالمطلب کے نام ہی نکلا تو یہ کراہ ناکام واپس چلے گئے۔ اس طرح حضرت عبدالمطلب کی ذاتی کوششوں سے جو آب زم زم دوبارہ جاری ہوا وہ اب تک اسی آب وتاب سے جاری ہے۔

ایک شخص کی طعنہ زنی سے بددل ہو کر جناب عبدالمطلب نے طواف کعبہ کے بعد اللہ سے اولاد کے لئے دعا طلب کی اور منت مانی کہ اگر اللہ انہیں دس یا اس سے زیادہ فرزند عطا کرے گا تو وہ ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ کچھ کتابوں میں درج ہے کہ چاہ زم زم کی کھدائی کے وقت آپ کے ساتھ صرف ایک بیٹا تھا چنانچہ آپ نے یہ منت اس وقت مانی۔ الغرض جناب عبداللہ آٹھ یا دس سال کے ہو گئے تو ایک دن حضرت عبدالمطلب کو اپنی منت یاد آئی۔ چنانچہ آپ نے سب بیٹوں کو جمع کیا اور ان کو اپنے خواب کی خبر دی۔ سب بچے خاموش رہے مگر حضرت عبداللہ نے فرمایا، آپ نے جو منت مانی تھی اس کو پورا کیجئے۔ جناب عبدالمطلب نے بچوں سے کہا جاؤ اپنی اپنی ماؤں سے اچھے اچھے کپڑے پہن کر اور ان سے رخصت لے کر آجاؤ۔ بچوں نے جب ماؤں سے صورت حال

بیان کی تو گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ آخر کار بچے تیار ہو کر آ گئے۔ اب جب آپ نے قرعہ ڈالا تو وہ حضرت عبداللہ کے نام نکلا۔ حضرت عبداللہ نے کہا بابا جان میں بخوشی راضی ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ میں اللہ کی راہ میں قربان ہوں۔ مگر مادر گرامی جناب عبداللہ زاروقطار رونے لگیں اور انھوں نے حضرت عبدالمطلب سے کہا یہ وہ فرزند ہے جس کو میں جان و دل سے عزیز رکھتی ہوں، آپ ایسی کوئی سبیل کریں کہ میرا بیٹا بچ جائے۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا سب بیٹوں میں یہی تو میرا مقصد حیات ہے مگر میں کیا کروں میں بھی مرضی اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ شاید یہ میرا امتحان ہے، تم میرے ایمان کو کمزور نہ کرو۔ بی بی فاطمہ (والدہ جناب عبداللہ) دوڑی دوڑی اپنے عزیزوں میں گئیں اور اپنے ہمراہ قبیلہ کے کچھ بزرگوں کو لائیں۔ اس عرصہ میں حضرت عبدالمطلب نے تین دفعہ قرعہ نکالا مگر ہر مرتبہ حضرت عبداللہ ہی کا نام نکلا۔ حضرت عمران (جناب ابوطالب) نے کہا بابا جان میں اپنی رضا و رغبت سے بغیر قرعہ کے اپنے چھوٹے بھائی کے بدلے قربان ہونا چاہتا ہوں مگر باپ نے جواب دیا کہ میں قرعہ کا احترام کرتا ہوں۔ بہنوں نے بھی مزاحمت کی۔ آخر ایک مرد بزرگ کے مشورہ پر جناب عبداللہ کے مقابلہ میں پچیس اونٹوں کا قرعہ ڈالا گیا مگر قرعہ حضرت عبداللہ ہی کے نام نکلا۔ پھر اونٹوں کی تعداد پچاس کی گئی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پھر پچھتر کی گئی مگر کوئی فرق نہ پڑا۔ جب تعداد بڑھا کر سو کی گئی تب جا کر قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی نمودار ہوئی مگر حضرت عبدالمطلب نے کہا یہ کیا بات ہے۔ یہ تو ناانصافی ہے کہ صرف ایک مرتبہ قرعہ اونٹوں کے نام نکلا تو میں فیصلہ بدل دوں۔ ایک بار پھر لوگوں کے چہرے پر افسردگی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری مرتبہ پھر قرعہ اونٹوں کے نام نکلا۔ اب آپ نے کہا کہ میں تیسری اور آخری مرتبہ قرعہ ڈالتا ہوں۔ قرعہ پھر اونٹوں کے نام نکلا۔ جناب عبدالمطلب کے دل پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، آپ بے ہوش ہو گئے۔ عالم غشی

میں دیکھا کہ ایک مرد بزرگ کہہ رہے ہیں کہ مبارک ہو اے شیبۃ الحمد مبارک ہو۔ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اللہ نے تمھاری قربانی قبول کر لی ہے۔ اب تم اونٹ نحر کرو۔ آنکھ کھلتے ہی آپ نے جناب عبداللہ کو پیار کیا۔ ادھر بنی ھاشم میں عید کا سماں تھا۔ فوراً ہی ایک سو اونٹ مقام منیٰ میں لے جا کر ذبح کر دیئے اور پورے مکہ میں امیر ہو کہ غریب سب میں تقسیم کر دیئے۔

اس واقعہ کے بعد سے حضرت عبداللہ ذبیح کے لقب سے موسوم ہوئے اور اسی وجہ سے آنحضرتؐ کو ابن ذبیحین کہتے ہیں، یعنی دو ذبیح کے فرزند۔ (یہاں دو ذبیح سے مراد حضرت عبداللہ اور حضرت اسماعیلؑ ہیں۔)

یہ واقعہ اہلِ سنت کے ایک سیرت نگار جناب راجہ محمد شریف کی کتاب ''حیاتِ رسالت مآبؐ'' میں کچھ معمولی اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔

اصحاب فیل کا واقعہ:

یہ واقعہ قرآن مجید کے ایک سو پانچویں سورہ ''الفیل'' میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفسیر میں حضرت ادیب اعظم الحاج مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی فرماتے ہیں:

''اس سورہ کی شان نزول یہ ہے کہ کعبۃ اللہ کی طرف عام لوگوں کا رجوع دیکھ کر ابرہہ بادشاہ یمن کو رشک پیدا ہوا۔ اس نے ارادہ کیا کہ خانۂ کعبہ کو ڈھا کر مسمار کر دے اور اس کی جگہ یمن میں ایسا ہی گھر بنائے۔ چنانچہ وہ ایک بڑا لشکر جس میں بہت سے ہاتھی تھے، لے کر مکہ آیا۔ یہ حضرت عبدالمطلب جدِّ رسول اللہؐ کا زمانہ تھا۔ آپ کے اونٹ چراگاہ میں چرتے تھے۔ ابرہہ کے لشکر والے انہیں پکڑ کر لے گئے۔ جب حضرت عبدالمطلب کو خبر ہوئی تو آپ ان کی واگزاشت کے لئے اس کے پاس گئے۔ اس نے پوچھا، آپ کیسے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا ''تیرے فوجی میرے اونٹ ہنکا لے گئے ہیں ان کی واگزاشت کے لئے آیا ہوں۔

اس نے کہا مجھے آپ پر بڑا تعجب ہوتا ہے۔ آپ سردار قوم ہیں آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کس ارادہ سے آیا ہوں۔ آپ نے مجھ سے خانہ کعبہ کے منہدم نہ کرنے کے متعلق تو کچھ کہا نہیں بس اپنے اونٹوں کے متعلق کہا۔ فرمایا: اونٹ میری ملکیت ہیں اس لئے میں نے ان کے لئے کہا اور اس گھر کا مالک اور ہے وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبدالمطلب موحد تھے، بت پرست نہ تھے اسی طرح ابوطالب بھی جوان کے بیٹے تھے مومن و موحد تھے۔ الغرض ابرہہ نے جب اپنے ارادہ کو پورا کرنا چاہا تو اللہ نے ابابیل چڑیوں کا ایک لشکر بھیجا جن کے پنجوں اور چونچوں میں سخت مٹی کی کنکریاں تھیں۔ وہ جس کے سر پر گرتی تھیں سارا جسم توڑ کر نیچے سے نکل جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کے سب ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ اللہ کے ہوائی جہازوں کی یہ تھی وہ بمباری جس نے دم کے دم میں سب کو ہلاک کر دیا۔

تاریخ بنی ہاشم میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے۔ جناب عبدالمطلب نے ان اونٹوں کو آراستہ کر کے خانۂ کعبہ پر نذر چڑھایا اور حرم میں لا کر چھوڑ دیا۔ مکہ پہنچ کر جناب عبدالمطلب نے اہل مکہ کو ہدایت کی کہ وہ شہر چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے جائیں اور خود خانہ کعبہ میں جا کر دعائیں اور مناجات کرنے لگے۔ بہت سے مستند مورخین نے آپ کی وہ مناجات نقل کی ہیں جو آپ درِ کعبہ کی زنجیر پکڑ کر نہایت عاجزی و انکساری کے ساتھ بہت دیر تک اپنے مالک حقیقی سے کرتے رہے۔ اس مناجات سے آپ کے عقیدہ توحید کا واضح ثبوت ملتا ہے:

خدایا اب تیرے سوا کوئی نہیں
تو ہی اپنے حرم کی حفاظت کر
خدایا دشمن کعبہ تیرا بھی دشمن ہے

اسے اتنا موقع نہ دے کہ اس مکان کو برباد کر سکے
خدایا بندہ اپنے مال کا تحفظ کرتا ہے تو اپنے مال کا تحفظ کر
خدایا ایسا نہ ہو کہ مسیحیت کے آثار تیرے گھر پر غالب آجائیں
آج کے تیرے فعل سے تمام افعال کی تکمیل ہو گی
تو ہی وہ ہے کہ جب کسی باغی کے مقابلہ میں تجھ سے کچھ چاہتے ہیں تو ملتا ہے
خدایا یہ رسوا ہو کر پلٹیں اور انہیں ہلاک بھی کر دیا جائے
میں نے اتنی گندی ذہنیت سنی بھی نہیں کہ اب تجھ سے بھی جنگ ہو گی
یہ اپنا سارا اجتماع مع ہاتھی کے لے کر آئے ہیں تاکہ تیری پناہ والوں کو پکڑیں
یہ ترے حرم کا قصد کر چکے ہیں اور تیرے جلال کو بھول گئے ہیں
اگر آج تو نے انہیں چھوڑ بھی دیا تو تیری خاص مصلحت ہو گی

جب تمام اہلِ مکہ پہاڑوں اور غاروں تک پہنچ گئے تب آپ بھی درِ کعبہ کو بند کر کے پہاڑ پر چلے گئے اور نصرت وحمایت خداوندی کا انتظار کرنے لگے۔

دعائے استسقاء:

دعائے استسقاء کا واقعہ جناب ارتضیٰ بن رضا نواز پوری کی کتاب "دینِ آباؤ اجداد رسولؐ" میں اس طرح منقول ہے:

ایک مرتبہ ملک حجاز میں کئی برسوں سے بارش نہ ہونے کے باعث وہاں کے باشندوں کو قحط وخشک سالی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب جناب رسالت مآبؐ کا سن مبارک پانچ یا چھ سال کا تھا۔ قحط کی اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے جناب عبدالمطلب اپنی اولاد جن میں آنحضرتؐ بھی شامل تھے، کے ہمراہ کوہ ابوقبیس کی بلند ترین چوٹی پر کھڑے ہو کر اللہ رب کریم کے حضور نہایت عجز وانکساری و منت وزاری دعا کرنے لگے۔ بارگاہ رب

العزت میں آپ کی دعا قبول ہوئی اور مورخین کے بیان کے مطابق ابھی لوگ کوہ ابوقبیس سے نیچے بھی نہ اترے تھے کہ اتنی تیز بارش ہوئی کہ ندی نالے بہہ نکلے، کھیتیاں لہلہا اٹھیں، چوپائے سیراب ہوئے اور انسان خوش وخرم ہو گئے۔

دعائے استسقاء کا دوسرا واقعہ اس طرح ہے کہ قبیلہ قیس ومضر کے افراد بھی قحط کی اسی مصیبت میں مبتلا تھے جب انہیں یہ خبر ملی کہ جناب عبدالمطلب کی دعا کی برکت سے قریش کی مصیبت ٹل گئی تو ان کے ایک وفد نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کرنے کی درخواست کی۔ جسے آپ نے قبول فرمایا اور دوسرے روز عرفات میں حسب سابق دعا کی جو مستجاب بارگاہِ ایزدی ہوئی۔ ابر باراں برسا اور خوب برسا، ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

وفات:

حضرت عبدالمطلب کی عمر اسی سال ہو گئی تھی کہ اچانک آپ سخت علیل ہو گئے۔ جب مرض نے شدت اختیار کی اور آپ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تو آپ نے اپنے تمام بیٹوں کو جمع کیا اور کہا میں دین ابراہیمی کی باگ ڈور سنبھالتا ہوا یہاں تک لایا ہوں، جلد اس دین میں ایک نئی روح ڈالنے والا آئے گا۔ تم سب اس کی پیروی کرنا۔ یاد رکھو جو منحرف ہوا وہ ہم سے نہیں۔ جب تک اس آنے والے کا انتظار ہے میں عمران کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں کیوں کہ عمران میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مجھ میں تھیں۔ یہ کہہ کر آپ نے عمران کو اپنے قریب بلایا اور ایک صندوق کھول کر تبرکات سلف نکالے جن میں اور چیزوں کے علاوہ جناب شیثؑ کی نعلین، جناب نوحؑ کی انگوٹھی، جناب ابراہیمؑ کا پیراہن، جناب اسماعیلؑ کی کمان اور نزار کا علم بھی تھا۔ ان کے سپرد کیا اور کہا مجھے یقین ہے کہ تم دین ابراہیمی کو اسی طرح چلاؤ گے جس طرح میں چلا رہا تھا تا آنکہ نبی آخرالزماںؐ کی رسالت کا اعلان ہو۔ اس کے اعلان کے بعد یہ تمام تبرکات تم اس کے حوالے کر کے اس کی اس طرح پشت پناہی کرنا جیسے

میں کرر ہا ہوں۔ پھر بیٹوں کو مخاطب ہو کر کہا اگر تم سب عمران کے بازوؤں کو اپنے اتحاد سے قوی رکھو گے تو دنیا و آخرت دونوں میں فلاح پاؤ گے ورنہ دنیا میں برباد رہو گے اور آخرت میں بھی نقصان اٹھاؤ گے۔ پھر سب لڑکوں کو رخصت کر دیا اور کہا میں عمران سے تنہائی میں کچھ وصیتیں کرنا چاہتا ہوں۔

جب سب بیٹے چلے گئے تو آپ نے حضرت عمران کو وہ تمام علم جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق آپ کے سینہ میں تھا، عطا کر دیا اور کہا میری زندگی کا مقصد صرف یہی تھا کہ میں اس نور کی حفاظت کروں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے خاندان کو عطا کیا ہے اور تم کو بھی لازم ہے کہ تم بھی محمد کی حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح میں نے کی ہے۔ تمھارا زمانہ میرے زمانہ سے زیادہ سخت آئے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم ثابت قدم رہو گے۔ پھر حضرت محمدؐ کو بلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر حضرت عمران کے ہاتھ میں دیا اور کہا یہ عبداللہ کی نہیں بلکہ اللہ کی امانت تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ جناب عمران نے آنحضورؐ کا دست مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر کہا، پدر بزرگوار میں آپ سے عہد کرتا ہوں کہ میں محمد کی پرورش، دیکھ بھال اور اس کے حصول مقصد کی راہ میں حائل ہونے والی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے میں نہ صرف اپنی بلکہ اپنی اولاد کی جان کو بھی عزیز نہیں رکھوں گا۔ یہ کہہ کر حضرت عمران نے حضرت محمدؐ کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اس طرح حضرت محمدؐ قلب حضرت عبدالمطلب سے نکل کر قلب حضرت عمران میں منتقل ہو گئے۔ حضرت عبدالمطلب نے حضرت محمدؐ کو قریب بلایا اور آپ کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر فرمایا اے پیدا کرنے والے رب میں نے اپنی خلقت کے مقصد کے حصول کے لئے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے اگر کہیں کوئی لغزش ہو گئی ہو تو اس نور کے صدقے میں جس کے لئے تو نے مجھے خلق فرمایا ہے تو مجھے بخش دے۔ یہ کہتے کہتے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کی تاریخ وفات سے متعلق تواتر سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ جب حضور اکرم کی عمر ۸ سال دو ماہ اور دس دن کی تھی تو حضرت عبدالمطلب نے رحلت فرمائی۔ اس حساب سے آپ کی تاریخ وفات ۲۷ جمادی الاول ۸ ع ف مطابق ۴ اپریل ۵۷۹ء یوم اتوار تھی۔

جناب عبدالمطلب اور جناب ابوطالب کے بارے میں ارشادات ائمہ:

جناب امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالمطلب نے اپنے زمانہ میں پانچ سنتیں مقرر کیں جن کو اللہ نے اسلام میں جاری و قائم رکھا:

۱۔ سوتیلی ماؤں کو لڑکوں پر حرام قرار دیا جس کے بارے میں اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ۔ ''ولا تنکحو امانکح اباءو کم من النساء الّا ما قدسلف''۔ ''ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمھارے آباؤ اجداد نے نکاح کیا ہو'' (سورۃ النساء آیت ۲۲)

۲۔ انھوں نے خزانہ پایا تو اس سے پانچواں حصہ راہ خدا میں دے دیا۔ اللہ فرماتا ہے ''واعلمو انما غنمتم من شئی فان للّٰہ خمسہ' وللرسول والذی القربیٰ والیتٰمیٰ و لمسکین و ابن السبیل ...'' آیت ۴۱ سورہ الانفال۔ (اور جان لو کہ جس قسم کی غنیمت (فائدہ) تمھیں ملے تو اللہ، اللہ کے رسولؐ، ذی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے اس کا (خمس) پانچواں حصہ ہے)۔

۳۔ جب چاہ زم زم کھودا تو اس کو حاجیوں کا سقایہ (پانی پلانے کا انتظام) قرار دیا۔ ''اجعلتم سقایۃ الحاج ....'' آیت ۱۹ سورۃ التوبہ۔

۴۔ ایک آدمی کے مار ڈالنے کا خوں بہا سو اونٹ مقرر کیا جو اب تک قائم ہے۔

۵۔ قریش میں طواف کی تعداد مقرر نہ تھی، آپ نے سات سات مرتبہ طواف کرنا مقرر فرمایا۔

پھر فرمایا کہ حضرت عبدالمطلب نے نہ کبھی جوا کھیلا، نہ بتوں کی پرستش کی نہ ان جانوروں کا گوشت کھایا جو بتوں کے آگے کاٹے گئے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے

پدر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم ہوں۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ جبریل امین جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہوئے اور کہا خلاق عالم آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں نے اس پر آتش دوزخ کو حرام کر دیا جس کے سلب سے تم پیدا ہوئے اور جس کے رحم میں تم رہے یعنی حضرت عبداللہ اور جناب آمنہ اور حرام کیا ہے اس پر جس نے تمھاری کفالت اور محافظت کی ہے یعنی حضرت ابو طالبؑ پر۔

فرمایا امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے:

"کہ واللہ نہ میرے والد نے بتوں کی پرستش کی نہ میرے دادا عبدالمطلب نے۔ نہ میرے جد بزرگوار جناب ہاشم نے نہ عبد مناف نے بلکہ وہ سب دین ابراہیمی پر قائم تھے اور آنحضرتؐ کے دین پر متمسک رہے۔"

جناب ابوطالب۔ محسنِ رسالتؑ

جناب ابوطالبؑ حضرت عبدالمطلبؑ کے بیٹوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ جناب عبدالمطلبؑ نے اپنے پوتے جناب رسالت مآب کی کفالت وحفاظت کی ذمہ داری اپنے بعد جناب ابوطالبؑ کے سپرد کی۔

تمام علمائے شیعہ اور اہل سنت کے بہت سے بزرگ علماء نے جناب ابوطالبؑ کو مومنین اور اہل اسلام میں سے بیان کیا ہے۔ ایک گروہ البتہ ان کے اسلام اور ایمان پر شک کرتا ہے یا بے جا تہمت لگاتا ہے۔ اس کا سبب یقیناً حضرت علیؑ کے مقام ومرتبہ کے مخالف گروہ کا وہ پروپگنڈہ ہے جس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ جناب ابوطالبؑ حضرت علیؑ کے والد ماجد تھے۔

جناب عبدالمطلبؑ نے بھی حضور اکرمؐ کے عہد طفولیت سے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے اس لئے ان کے ساتھ بے حد مشفقانہ اور جداگانہ رویہ اختیار کیا اور پھر انہیں جناب ابوطالبؑ کے سپرد کر کے ایک اہم ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے۔

اس سلسلہ میں اہل سنت کے ایک سیرت نگار جناب راجہ محمد شریف کی کتاب "حیات رسالت مآبؐ" سے جناب ابوطالبؑ کے بارے میں یہ تحریر پیش خدمت ہے:

"آپ (جناب ابوطالبؑ) نے اپنے نامور والد حضرت عبدالمطلبؑ کے انتقال کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آٹھ سال کی عمر میں اپنی تربیت ونگہداشت میں لیا۔ آپؑ کو رسول کریمؐ سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی محبت کی بنا پر آپؑ نے آں حضرتؐ کی خاطر

بے شمار مصائب برداشت کیے اور تقریباً دس سال تک قریش مکہ کی مخاصمت و ایذا رسانی کا شکار رہے۔ مگر آپ نے اتنی شدید مخالفت کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی آں حضرتؐ کی امداد و اعانت سے ہاتھ پیچھے نہیں کھینچا۔ آپ نے حضور کی خاطر تمام عرب اپنا دشمن بنا لیا مگر آں حضرتؐ پر آنچ نہیں آنے دی۔ آپؑ کی یہ جاں نثاریاں یقیناً اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہیں اور وہی بہتر اجر رسالتؐ دینے والا ہے۔"

ایمان ابو طالبؑ کے سلسلہ میں جناب راجہ محمد شریف کی رائے اسی کتاب میں اس طرح موجود ہے:

خواجہ ابو طالب کی وفات:

آں حضرتؐ اور ان کے چچا خواجہ ابو طالبؑ معہ اپنے اہلِ خاندان کے شعب ابی طالب سے تین سال کی محصوری کے بعد نکلے ہی تھے کہ خواجہ ابو طالب کو پیغام اجل آ پہنچا۔

خواجہ ابو طالبؑ کے آخری وقت آں حضرتؐ آپ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس وقت ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بھی خواجہ ابو طالبؑ کے پاس موجود تھے۔ حضور اکرمؐ نے اپنے شفیق چچا سے فرمایا کہ وہ مرتے مرتے "لا الہ الا اللہ" کا اعلان کر دیں تاکہ آں حضرتؐ اللہ کے ہاں ان کے ایمان کی شہادت دے سکیں۔ یہ سن کر ابو جہل اور ابن امیہ نے کہا:

"ابو طالب! کیا تم عبدالمطلبؑ کے دین سے پھر جاؤ گے؟"

یہ سن کر خواجہ ابو طالبؑ نے قدرے توقف کیا اور پھر کہنے لگے:

"میں عبدالمطلبؑ کے دین پر مرتا ہوں"

ازاں بعد خواجہ ابو طالبؑ نے آں حضرتؐ کی طرف دیکھا اور کہا:

''میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا''

یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا:

''میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا، جب تک کہ اللہ مجھ کو ایسا کرنے سے منع نہ فرمادے''

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت حضرت ابوطالبؑ کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباسؓ (جو خود اس وقت اسلام نہیں لائے تھے) نے کان لگا کر سنا تو آں حضرتؐ سے عرض کیا:

''ابوطالبؑ وہ کلمہ کہہ رہے ہیں جس کے کہنے کے متعلق آپؐ نے کہا تھا۔'' (واللہ اعلم)

(''حیات رسالت مآب'' مولفہ جناب راجہ محمد شریف۔ مطبوعہ زاہد اکیڈمی، جوہر آباد۔ صفحہ ۱۵۳ تا ۱۵۵)

مندرجہ بالا روایت کو بہت سی کتب سیرت و تاریخ میں موضوع بحث بنایا گیا ہے لیکن اس پر سیر حاصل مطالعہ کے لئے جناب ارتضےٰ بن رضا نواز پوری کی کتاب ''دین آباؤ اجداد رسولؐ'' صفحہ ۱۳۳ سے ۱۴۷۔ مطبوعہ مکتبہ الشہباز۔ 15A، معاون مارکیٹ، کمرشل ایریا، ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی سے رجوع فرمائیں۔

ہمارے نزدیک ایمان ابوطالبؑ پر بحث بے معنی ہے کیوں کہ ان کہ زندگی میں کوئی چھوٹا سا عمل بھی ایسا نہیں ملتا جو اسلام کے منافی ہو۔

آیئے اب ہم ذات ابوطالبؑ کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کرتے ہیں:

سورۂ شعراء کی آیت ۲۱۹ ''وتقلبک فی السجدین'' کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اے رسول تمھارے نور کو ہم سجدہ کرنے والے مخلصین میں گردش دیتے رہے۔ یعنی آپ کا نور اصلاب طاہرہ سے ارحام طاہرہ کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تم کو رکوع و سجود و قیام کرنے والوں میں چلتے پھرتے دیکھا۔ آغاز رسالت میں حضورؐ ان

چند لوگوں کے ساتھ جنہوں نے سب سے پہلے تصدیق رسالت کی تھی با جماعت نماز پڑھتے تھے۔ اس وقت کی جماعت میں بجز حضرت علیؑ اور جناب خدیجہؑ کوئی دوسرا شریک نہ تھا، جب کہ جناب ابوطالبؑ انہیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے نگہبانی فرماتے تھے۔ پس یہی لوگ مراد ہو سکتے ہیں۔ ان ہی عبادت گزاروں کے درمیان اللہ اپنے رسول کو دیکھتا تھا۔ اولین معنوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کا نور مبارک حضرت آدمؑ سے جناب عبدالمطلبؑ تک گردش کرتا رہا اور یہ پورا سلسلہ سجدہ گزاروں کا تھا۔ جناب عبدالمطلبؑ سے یہ نور جناب عبداللہ اور جناب ابوطالبؑ میں منتقل ہوا اور اس کے بعد جناب رسالت مآبؐ اور حضرت علیؑ کے ذریعہ یہ نور آگے پھیلتا گیا۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں۔" اس آیت کی رو سے جناب ابوطالبؑ نہ صرف امینِ نورِ ولایت ہیں بلکہ حافظ رسالت بھی ہیں جس کا ذکر اگلی آیت کے حوالے سے کیا جائے گا۔

سورہ ۹۳، والضحیٰ۔ آیت ۶۔ ترجمہ: کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر اپنی (ابوطالبؑ کی) پناہ نہ دی؟ اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ اپنے رسول کو دلاسہ دینے کے لئے فرما رہا ہے کہ تم یتیم تھے، تمہارا کوئی پوچھنے والا نہ تھا، ہم نے ابوطالبؑ کی پناہ میں دے کر تمہاری کیسی حفاظت کی۔

مقام فکر ہے اللہ کسی انسان کے قول و فعل کو اپنا قول و فعل کہے تو ایسا انسان معصوم ہوتا ہے کیوں کہ غیر معصوم کے قول و فعل میں معصیت، گناہ، لغزش یا خطا کا امکان ہو سکتا ہے جب کہ اللہ ان باتوں سے منزہ و مبرا ہے۔ جناب ابوطالب نے اعلان نبوت سے لے کر تا دمِ مرگ مکہ کے سخت حالات میں کس کس طرح رسالت کی نصرت و حفاظت کی ہے۔ آپؑ کی وفات کے بعد جب مکہ کی سرزمین حضور کے لئے تنگ ہو گئی تو حفاظت نبوت کا یہ بار

سعادت مند بیٹے جناب امیرؑ نے اپنے کاندھوں پر لے لیا اور شبِ ہجرت سے لے کر مدینہ میں حضورؐ کی آخری سانس تک ان کی نصرت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یقیناً یہ سب تربیت جناب ابو طالبؑ کی برکات ہی تھیں۔

سورہ ۹۰، بلد۔ آیت ۳۔ ترجمہ: مجھے اس شہر مکہ کی قسم درحالیکہ تم اسی شہر میں اترے ہوئے ہو اور والد کی قسم اور اس بیٹے کی قسم جس کو اس نے جنا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ کعبہ، شہر مکہ، باپ اور اس کا بیٹا۔ شہر مکہ کی قسم اس لئے کھائی کہ اے حبیب تو اس سرزمین میں اترا ہے۔ تیرے پاک قدم اس زمین کو مس کر رہے ہیں۔ ان ہی قدموں کی بدولت یہ شہر مرکزِ توحید، مامن خلق اور بیت اللہ ہو گیا اور یہاں سے صدائے توحید بلند ہوئی جس سے کرۂ ارض گونج اٹھا۔ اس کے بعد قسم ہے والد کی جو اس کا وَلَد یعنی مولودِ کعبہ کا باپ ہے۔ جس کے وقار میں اسلام پھولا پھلا۔ اس کی حفاظت و نصرت کی بدولت اللہ کا پیغام عرب کے سخت دل لوگوں میں گھر کر گیا۔

بعض مفسرین نے باپ اور بیٹے سے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد مراد لی ہے جب کہ بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد آدمؑ اور ان کی اولاد ہے جب کہ ذکر یہ ہو رہا ہے کہ اے رسولؐ اس شہر کی قسم جس میں تم مقیم ہو تو اس موقع پر جناب ابراہیمؑ اور جناب آدمؑ کی کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا مکہ کے بعد ذکر اس کا ہونا چاہیے جس کی حفاظت و نصرت کی بدولت حضورؐ مکہ میں رہ سکے اور اللہ کے پیغام کو وہاں کے لوگوں تک اور آئندہ پوری دنیا تک پہنچا سکے۔ یہاں پر باپ سے مراد یقیناً حضرت ابو طالبؑ ہیں۔ دوسرے ان کا بیٹا جس نے آگے چل کر باپ کی طرح رسالت کو ہر خطرے سے بچایا۔ حضورؐ پہلے ابو طالبؑ کی حفاظت میں مکہ کے اندر چلے پھرے، رہے بسے پھر فتح مکہ کے بعد حضرت علیؑ

کے ساتھ اسی طرح رہے۔

جناب ابو طالبؑ سے متعلق چند قرآنی آیات کے حوالوں کے بعد مختصراً آپؑ کی اوّلیات (یعنی وہ باتیں جن میں ان کی مثل کوئی اور نہیں) پیش خدمت ہیں:

ا۔ جناب عبدالمطلبؑ نے اپنے دس بیٹوں میں سے جناب ابو طالبؑ کو اس اعزاز کا مستحق سمجھا کہ حضورؐ کی کم سنی کے خصائل عالیہ کو دیکھتے ہوئے ان کی کفالت اور حفاظت کی ذمہ داری ان کے سپرد فرمائی۔

۲۔ جناب ابو طالبؑ نے حضورؐ کو بچپن سے ہی اپنی خصوصی پناہ میں رکھا۔ تجارت اور دیگر معاملات میں بہترین سرپرستی فرمائی۔ اسی دوران ایک تجارتی سفر میں ''بحیرا'' نامی راہب نے حضورؐ کو دیکھ کر کہا کہ اس بچہ کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے جس کی نبوت و رسالت کی آسمانی کتابوں نے خبر دی ہے اور میں نے اس کی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہیں۔ جناب ابو طالب اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دیگر قرائن سے پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔ حضورؐ سے انسیت اور ان کے مستقبل کے ادراک سے وابستہ وہ واقعہ بھی ہے کہ جب سخت قحط سالی میں جناب ابو طالبؑ نے اپنے شیر خوار بھتیجے کو گود میں لے کر خانۂ کعبہ کے سامنے بلند کر کے دعا فرمائی ''پروردگار اس بچے کے حق کا واسطہ ہم پر بابرکت بارش نازل فرما''۔ کچھ ہی دیر میں بادل نمودار ہوئے اور بارش سے مکہ اور اس کے اطراف جل تھل ہو گئے۔

۳۔ حضورؐ کی شادی جناب خدیجہؑ سے ہونے کے سلسلے میں رشتہ کی سلسلہ جنبانی سے لے کر عقد اور رخصتی کے انتظامات اعلیٰ ترین طریقوں سے انجام دیے جس کے نتیجے میں حضورؐ اور جناب خدیجہؑ کے توسط سے معصومینؑ کی اعلیٰ ترین نسل وجود میں آئی۔

۴۔ جناب رسالت مآبؐ اور جناب خدیجہؑ کا نکاح آپ نے بہ نفس نفیس پڑھایا اور

ایسا فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا کہ اس خطبہ کے الفاظ کو اللہ نے اپنے کلام کا جز بنا لیا۔

۵۔ جناب ابو طالبؑ نے آخر عمر میں تین سال تک حضورؐ کی خاطر شعب ابو طالب میں محصور ہو کر انتہائی سخت حالات کا مقابلہ کیا۔ یہاں پر مقصد خالصتاً حضورؐ کے مشن کو تقویت دینا اور ان کی جان پر اپنی جاں نثاری بلکہ اولاد نثاری کا ثبوت دینا تھا جس کی نظیر تاریخ میں نا پید ہے۔

۶۔ حضرت ابو طالبؑ نے زندگی کے آخری لمحوں میں جو وصیت فرمائی ہے وہ بے حد بصیرت افروز ہے۔

وصیت نامہ کا ترجمہ:

''میں تمھیں خانۂ کعبہ کی تعظیم کی وصیت کرتا ہوں۔ اس سے اللہ کی رضا حاصل ہو گی اور اصلاح معاش کا وسیلہ اور روزی کا سہارا ہو گا۔ صلۂ رحمی اختیار کرو اس سے عمر میں زیادتی اور نسل میں ترقی ہوتی ہے۔ بغاوت اور نافرمانی چھوڑ دو، ان دونوں باتوں سے اگلی قومیں ہلاک ہوئیں۔ سچ مذہب کی دعوت دینے والے کی بات سنو۔ سائل کی حاجت پوری کرو۔ ان دونوں میں شرف حیات و ممات ہے۔ سچ بولو اور امانت ادا کرتے رہو۔ ان باتوں کی وجہ سے خواص محبت کرتے ہیں اور عوام عزت کرتے ہیں۔ محمدؐ کے بارے میں میں تمھیں وصیت کرتا ہوں۔ قریش انہیں امین سمجھتے ہیں اور تمام عرب انہیں سچا مانتے ہیں۔ جن باتوں کی میں نے تمھیں وصیت کی وہ سب ان میں موجود ہیں۔ وہ ایک ایسا امر لے کر آئے ہیں جسے لوگوں کے دل قبول کر چکے ہیں اور زبانیں دشمن کے خوف سے انکار کرتی ہیں۔ خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ عرب کے فقیر اور قرب و جوار کے باشندے اور کمزور افراد ان کے پیام کو قبول کر چکے ہیں اور ان کے کلام کی سچائی کو تسلیم کر چکے ہیں۔ اور ان کے امر کو بڑا سمجھ چکے ہیں۔ وہ ان کو لے کر موت کے بھنور میں کود پڑے ہیں اور قریش کے سردار ادنیٰ درجے کے

ہو گئے ہیں جو زبردست تھے وہ زیردست ہو گئے ہیں اور جو محمد کو اپنے سے کمتر جانتے تھے ان کی خالص دوستی حاصل کر لی ہے اور اپنے کو ان کے حوالے کر دیا ہے۔ اے قریش! ان کے دوست بن جاؤ اور ان کے گروہ کے حامی رہو۔ خدا کی قسم جو ان کے راستے پر چلے گا کامیاب ہو گا جو ان کی سیرت اختیار کرے گا سعید ہو گا۔ اگر میری زندگی اور ہوتی اور میری موت کچھ دیر کرتی تو میں ان سے ہر قسم کے مصائب کو ٹالتا۔ جب تک تم محمد کی بات سنتے رہو گے اور ان کے احکام کی پیروی کئے جاؤ گے تمہارے لئے ہر طرح بہتری ہو گی۔ دیکھو ان کی اطاعت کرو، ہدایت پاؤ گے۔

(مندرجہ بالا وصیت نامہ کا ترجمہ مورخ اسلام پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری، اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی کتاب "معارج العرفان در عصمۃ صغریٰ ابی طالب عمران" ۔ سے لیا گیا ہے)

ملیکۃ العرب جنابِ حضرت خدیجہؓ

اُم المومنین جناب خدیجہؓ بنتِ خویلد عرب کے مشہور شہر مکہ میں قریش کے ایک شریف اور معزز خاندان میں پیدا ہوئیں۔ واقدی کے بیان کے مطابق سیدہ خدیجہؓ کا شجرۂ نسب یہ ہے۔

حضرت خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن ق عبد العزیٰ بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر۔

یعنی باپ کی طرف سے قصی تک پہنچ کر آپ چوتھی پشت میں حضورؐ کی شریک نسب ہو جاتی ہیں۔ اس طرح جناب خدیجہؓ کی والدہ معظمہ فاطمہ بنتِ زائدہ بن الاصم بن رواحہ بن حجر بن عبد بن معیص بن عامر بن لوی تھیں۔ (طبقات ابن سعد) گویا مرسلِ اعظمؐ اور بی بی خدیجہ طاہرہؓ کا خاندان ایک ہی تھا۔

جناب خدیجہؓ کے عفت و بزرگی کے آثار بچپن ہی سے عیاں تھے۔ اس زمانہ تاریکی میں ہی آپ کو "طاہرہ" کا لقب دیا گیا اور بلحاظِ سیادت و شرافت ان کو قریش سیّدۃ النساء کہتے تھے۔

جناب خدیجہؓ کی حیاتِ مقدس کا مطالعہ کرنے کے لئے قرآن مجید کا سہارا لیتے ہیں۔ سورۂ والعصر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) "عصر کی قسم بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے، نیک اعمال کئے اور حق و صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

ایمان لانا کیا ہے اور اسلام میں داخل ہونا کیا ہے۔ اس کی صراحت قرآن مجید اور احادیث مبارک میں تفصیل سے موجود ہے۔ مختصراً، ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص صدقِ دل سے اللہ کی توحید اور جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت قبول کرلے۔

ظاہر ہے دل سے توحید اور رسالت قبول کرنے کا مقصد اور معنی یہ ہیں کہ اللہ اور اس کے پیارے رسولؐ کے احکامات پر دل کی گہرائیوں سے عمل کرے۔ یہ احکامات اسے قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے حاصل ہوں گے۔

وحی کے نزول کی خبر اور مبعوث بہ رسالت ہونے کا اعلان حضورؐ نے سب سے پہلے جناب خدیجہؓ کے سامنے کیا اور اس نیک سیرت بی بی نے نہ صرف دعوتِ اسلام فوری طور پر قبول کی بلکہ آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اس ضمن میں ہونے والی ہر بات پر مشاورت اور معاونت کا حق ادا کر دیا۔

''ایمان'' کے بعد دوسرا حکم ''اعمال صالح'' بجالانے کا ہے۔ کسی عورت کے اعمال کا جائزہ اس کے اعمال جو وہ شادی سے قبل بجالاتی ہے اور جو شادی کے بعد انجام دیتی ہے کے دیکھنے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ حضور اکرمؐ سے شادی سے پہلے کی جناب خدیجہؓ کی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تاریخ میں کہیں بھی آپ کی بابت کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی جو منفی تاثر رکھتی ہو نہیں ملتی۔ نہ کوئی مشرکانہ عمل، نہ کوئی معمولی بری عادت۔ بلکہ عورت ہونے کے ناطے اتنی بڑی تجارت کا انتظام واہتمام آپ کی بردباری اور شخصی عظمت کی دلیل ہے۔ دیانتداری، حرام سے گریز اور حلال سے وابستگی بھی آپ کی تجارت میں برکت کا مظہر نظر آتی ہے۔ اعمال صالح دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کا تعلق مال واسباب سے ہوتا ہے دوسرے وہ جو انسان ذہنی اور جسمانی طور پر انجام دیتا ہے۔ مالی اعمال صالح وہ انجام دے سکتا ہے جو مال و متاع رکھتا ہو۔ مثلاً حج کرنا، زکوٰۃ دینا، خمس ادا کرنا، غریبوں، ناداروں، محتاجوں کی مدد کرنا وغیرہ۔ اگر کسی کے پاس مال و متاع نہ ہو تو اس پر اس قسم کے اعمال ساقط ہیں۔ مثلاً اگر کوئی صاحب استطاعت نہیں تو وہ حج نہ کرے۔ کوئی صاحب نصاب نہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور خود محتاج و نادار ہے تو دوسرے محتاجوں ناداروں کی مدد کرنا ضروری نہیں۔ اب دوسرے قسم کے اعمال صالح ہیں، مثلاً نماز پڑھنا، روزے رکھنا،

والدین کی خدمت کرنا، خلقِ خدا سے خوش اخلاقی سے پیش آنا، معاملات میں خوفِ خدا رکھنا وغیرہ، یہ مالدار یا کم مالدار یا غریب پر بھی برابری کی سطح پر واجب ہیں۔ اب ذرا جناب خدیجہؑ کے اعمالِ صالحہ پر نظر کیجئے۔ انفاق کا وہ کون سا طریقہ تھا جو شہزادی نے اختیار نہیں کیا۔ اپنے خزانوں کے منہ امت کے لئے کھول دیے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اسلام جناب خدیجہؑ کے ذریعہ پھلا پھولا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الضحٰی کی آیت ۸ میں ارشاد فرمایا: ترجمہ: ''(اللہ نے) آپ کو تنگ دست دیکھ کر غنی بنا دیا'' یہاں اللہ نے بی بی کے عمل کو اپنا عمل قرار دیا۔ جناب خدیجہؑ کی دولت اپنے محبوب شوہر کو دینے کے بارے میں امام فخر الدین رازی نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں یوں تحریر فرمایا ہے:

''خدا نے رسول کو خدیجہ کے مال سے غنی کر دیا۔ (ایک دن) حضورؐ بی بی خدیجہؑ کے پاس آئے تو بے حد غمگین وملول اور افسردہ تھے۔ خدیجہؑ نے اس رنج کا سبب پوچھا تو فرمایا: ''یہ قحط کا زمانہ ہے۔ اگر میں تمھارا مال خرچ کر دیتا ہوں تو تم سے حیا آتی ہے اور اگر اس کو خرچ نہ کروں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔''

اس کے بعد (خدیجہؑ کے کہنے پر حضورؐ نے) قریش کو بلایا۔ جناب ابوبکر کا کہنا ہے کہ بی بی خدیجہؑ نے دینار نکال نکال کر سامنے ڈھیر کر دیے۔ یہاں تک کہ وہ اس مقدار میں ہو گئے کہ میں ان لوگوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا جو میرے آگے (سونے کے ڈھیر کے پیچھے) بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنا زیادہ مال تھا۔ پھر جناب خدیجہ نے فرمایا: ''تم سب گواہ رہنا کہ میرا یہ مال اب رسالتمآب کا مال ہے (ان کو پورا پورا اختیار ہے) وہ چاہیں تو اس کو خرچ کریں اور چاہیں تو روک لیں (نہ خرچ کریں)''

سیدہ خدیجہ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مال رکھا رہے اور عوام کو تکلیفوں اور پریشانیوں میں دیکھ کر اللہ کے رسول کڑھتے رہیں۔ اس سخاوت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے ''وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى o (سورۂ ضحیٰ آیت ۸) کا تاج رکھ کر جناب خدیجہ کو بزمِ نسواں میں باوقار کر دیا۔

یہ صرف ایک واقع تھا عملِ انفاق کا۔ عورت کی سب سے بڑی ذمہ داری یا عمل صالح کا ایک موقع جو ہر عورت کو شوہر سے معاونت، مشاورت اور خدمت کے سلسلے میں ملتا ہے، اس میں بی بیؑ کا کردار مثالی نظر آتا ہے۔ جس زمانے میں آپ غارِ حرا تشریف لے جاتے تھے، اس دوران جناب خدیجہؑ طاہرہ جبل نور پر خود کھانا پہنچانے جاتی تھیں۔ ناز و نعم سے پلی ایک شاہزادی کی اس مشقت کی نظیر نہیں ملتی جو یقیناً رسول اکرمؐ سے والہانہ محبت و عقیدت کی بنیاد پر تھی۔ جب حضورؐ پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؐ نے سب سے پہلے آ کر جناب خدیجہؑ سے اس کا ذکر فرمایا۔ وفا شعار اور ذہین بیوی نے جو علم و عرفان خاندانی اثرات سے حاصل کیا تھا اس کے تحت نہ صرف آپؐ کے نبی برحق ہونے کی تصدیق فرمائی بلکہ حتی المقدور دلجوئی اور مشاورت بہم پہنچائی۔ شادی کے بعد سے تادم مرگ آپؑ نے حضور کی ایسی خدمت کی کہ باوجود کثرت ازواج، حضورؐ آخر دم تک جناب خدیجہؑ کو دعائیہ کلمات کے ساتھ یاد فرماتے رہے۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ گھر سے نکلتے ہی نہیں تھے مگر یہ کہ جناب خدیجہؑ کی مدح و ثناء کرتے ہوئے۔

اب رہ گئی بات "تواصوا بالحق" اور تواصوا بالصبر" کی تو تاریخ میں مرقوم ہے کہ اعلان نبوت کے بعد مکہ میں جب آنحضرتؐ کی مخالفت بڑھی اور مشرکین آپؐ کے درپئے آزار ہوئے تو اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے حضرت خدیجہؑ ہر مخالفت کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئیں اور اپنی بلند شخصیت کی بناء پر کفار کی مخالفت کو غیر موثر کر دیتیں۔ آپؑ آخرِ عمر تک حضور کی ہر تکلیف میں برابر کی حصہ دار رہیں۔

کفار مکہ نے تحریک اسلامی کی بے انتہا کامیابی پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کیا اور اپنی ناکامیوں کا جائزہ لینے کے بعد طے کیا کہ بنو عبد المطلب سے سارے تعلقات ختم کر دیئے جائیں۔ سوشل بائیکاٹ کے بعد سردار مکہ حضرت ابو طالبؑ اپنے پورے خاندان کو لے کر شعب میں آگئے۔ پورے تین سال قید سخت کی زندگی ابو طالبؑ نے گزار دی مگر ہادی

اکبر کی حفاظت اور حمایت ترک نہ کی۔ ان قیدیوں میں شہزادی عرب سیدہ خدیجہؓ طاہرہ ہی نہیں بلکہ آغوش میں شہزادی نور جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی قیدی کی حیثیت سے ہیں۔ اس دور میں جو احوال گزرے ہیں ان کو پڑھ کر پتھر بھی پگھلنے لگتا ہے۔ درختوں کے پتے نگلے جاتے رہے اور سوکھے چمڑے ابال ابال کر اور آگ پر بھون بھون کر کھائے جاتے رہے۔ ایک مرتبہ حکیم ابن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) نے کچھ گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ چوری چھپے بھیجے۔ راستہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور گیہوں چھیننے کے درپے ہوا۔ اتفاق سے ابوالبختری بھی آ گئے۔ ان کے اندر کسی اچھے انسان نے کروٹ لی اور ابوجہل سے کہا: "چھوڑ و بھی! ایک بھتیجا اپنی پھوپھی کے لئے بھیجتا ہے تو تم اسے بھی روکتے ہو۔" اسی طرح ہشام بن عمرو چوری چھپے کچھ غلہ بھیج دیتے۔

شعب ابی طالب میں گذارے ہوئے ایام ملیکۃ العرب جناب خدیجہؓ کے صبر و استقامت کی عظیم مثال ہے۔

صحابی یا صحابیہ کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جو کوئی بھی حضورؐ کی حیات میں مشرف بہ ایمان ہوا، وہ صحابی یا صحابیہ کہلاتا یا کہلاتی ہے۔ اب ان صحابہ اکرام میں سے جو بھی حضورؐ سے جتنا قریب رہا وہ اتنا ہی برگزیدہ اور واجب التعظیم ہے۔ اب مقام فکر ہے کہ جناب خدیجہؓ ایمان لانے والوں میں اول ہیں اور حضور سے ہر اعتبار سے قریب رہنے کا اعزاز بھی رکھتی ہیں تو بطور صحابیہ بھی کتنا بلند و ارفع درجہ رکھتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ شعب ابوطالب کی محصوری کے ایام میں ایک زہریلی غذا کھانے سے ہی آپ علیل ہوئیں اور اسی باعث آپ کی وفات ہوئی۔ آنحضرت کو جناب خدیجہؓ کی وفات سے نہایت رنج ہوا۔ آپؐ جناب خدیجہؓ کا ذکر نہایت محبت کے ساتھ کرتے تھے۔ اور جب ان کا خیال آتا تھا تو رونے لگتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ کی کئی اولیات ہیں:

۱۔آپؑ جناب رسالتمآب کی سب سے پہلی زوجہ محترمہ ہیں۔آپ کی حیات میں حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔

۲۔آپؑ حلقۂ اسلام میں سب سے پہلے داخل ہوئیں۔

۳۔سب سے پہلے آپؐ نے اپنی بعثت کا تذکرہ جناب خدیجہؑ سے کیا۔

۴۔سب سے پہلے حضرت خدیجہؑ نے جناب رسالتمآب کی تصدیق فرمائی۔

۵۔سب سے پہلے نماز جناب خدیجہؑ نے جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ پڑھی۔

۶۔حضرت علیؑ کی پرورش کرنے کا اعزاز ان کو حاصل ہوا۔

۷۔دنیا کی چار بہترین عورتوں میں سے ایک آپؑ ہیں اور ان کی صاحبزادی عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔

حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ تمام دنیا کی عورتوں میں چار عورتیں بہترین اور افضل ترین ہیں۔ یعنی جناب خدیجہؑ بنت خویلد، فاطمہؑ بنتِ محمدؐ، مریمؑ بنتِ عمران اور آسیہؑ بنتِ مزاحم زوجہ فرعون۔

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا: ”قسم بخدا مجھے خدیجہؑ سے بہتر زوجہ نہیں ملی۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائی کہ جب کوئی بھی ایمان نہ لایا تھا۔ اس نے میرے دعوے (دعویٔ نبوت) کی اس وقت تصدیق کی جب اور لوگ تکذیب کر رہے تھے۔ اس نے مجھے اپنے مال میں شریک کیا کہ جب سب نے محروم کر دیا تھا، خدا نے مجھے اس سے اولادیں دیں جبکہ دوسری ازواج سے مجھے کوئی اولاد نہیں ملی۔

ماخذ

۱۔”ملیکۃ العرب“۔تصنیف مولانا سید کرار حسین میرپوری۔

۲۔”سیرۃ فاطمۃ الزہراؑ“۔تالیف، آغا محمد سلطان مرزا دہلوی۔

۳۔”حیات رسالت مآبؐ“۔تالیف، راجہ محمد شریف۔

شریکتہ الحسینؑ، جناب زینب سلام اللہ علیہا

جناب علی مرتضیٰؑ اور جناب فاطمۃ الزہراؑ کے صحن میں دو پھول جیسے شہزادوں کی آمد کے بعد ایک کلی کھلی ہوگی تو ان کی آنکھیں خوشی سے جھلملا گئی ہوں گی۔ ویسے تو یہ گھر ہی رحمت اللعالمین کا تھا مگر اولاد کے سلسلے میں اس گھر کو اللہ نے نعمتوں کے بعد اب رحمت سے نوازا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس مبارک ہستی کے استقبال کے لئے پنجتن پاک علیہم السلام چشم براہ تھے۔ جہاں ماں باپ اور بھائیوں کے دل شاداں و فرحاں تھے وہیں بزرگِ خاندان رسول کونین کی نظریں بھی خوشی سے چمک رہی ہوں گی کیوں کہ آج ان کی چہیتی نورِ نظر کے ہاں اس کی اپنی نورِ نظر جلوہ ریز تھی۔ جناب رسالت مآب کی خدمت میں جب بچی کو پیش کیا گیا تو آپؐ نے انہیں باپ کی زینت قرار دیتے ہوئے زین اب یعنی زینب نام تجویز کیا۔ اس طرح آپؑ تاعمر اسی نام سے پہچانی گئیں۔ نانا کے تجویز کردہ نام کی لاج رکھتے ہوئے یہ شہزادی زندگی کی ایک ایک سانس باپ کی زینت اور گھرانہ کی عزت و وقار کی نمائندہ بنی رہیں۔ کیوں نہ ہوتیں جب ماں ایسی عظیم کہ عالمین کی خواتین کی سردار، باپ ایسے کہ مومن کامل بلکہ امیر المومنین، امام المتقین اور بھائی وہ کہ جوانانِ جنت کے سردار۔ ان سب کے جد امجد افضل البشر، سید الکونین، رحمت اللعالمین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

طلوعِ اسلام سے قبل اس معاشرے میں عورت کی کیسی بے توقیری تھی کہ اسے زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا تھا اور اسے زندہ در گور کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ ایسے میں اللہ نے رسول کو ایسی بیٹی عطا فرمائی جو عالمین کی خواتین کے ماتھے کا جھومر ٹھہری اور ماں باپ کی تربیت کا شاہکار بن گئی۔ ایسی ہی تربیت جناب سیدہؑ اور

حضرت علیؑ نے اپنی اولاد کو عطا کی کہ بیٹے بھی ذی وقار اور بیٹیاں بھی ماں جیسی فخر کائنات ثابت ہوئیں۔ شہزادی نے تقریباً پانچ برس سرور کونین کا دور دیکھا۔ اسی عمر میں آپ نے کساء کا واقعہ دیکھا کہ نانا نے ماں باپ اور بھائیوں کو چادر کی عاطفت میں لیتے ہوئے ان کی بزرگی، طہارت اور معصوم ہونے کی دعا فرمائی اور اس کے بعد انہیں میدان مباہلہ میں لے جا کر عوام الناس کو بتایا کہ یہ ہیں وہ کائنات کی چنیدہ ہستیاں جو صرف اپنے وجود سے باطل کو شکست دے سکتی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ہر روز نانا ان کے گھر پر صدا لگاتے ہیں کہ اے پاکیزہ لوگو رسول آپ کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے اور اے اہل بیت نبوت اللہ نے ارادہ فرمایا ہے کہ آپ لوگوں سے رجس کو دور رکھے جیسا کہ دور رکھنے کا حق ہے۔

اسی دور میں شہزادی نے ایک روز جناب رسالتمآبؐ سے عرض کی کہ "نانا جان میں نے کل ایک خواب دیکھا ہے کہ سیاہ آندھی چلی جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی۔ آندھی کی شدت مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئی۔ ایسے میں میں نے ایک بڑا درخت دیکھا اور میں ہوا کے تیز جھونکوں کا شکار ہو کر اس درخت سے لپٹ گئی۔ مگر آندھی نے اس درخت کو اکھیڑ کر زمین پر گرا دیا۔ اس کے بعد میں اس درخت کی ایک ٹہنی سے لپٹ گئی، مگر تیز ہوا کے جھونکوں نے اسے بھی گرا دیا تو میں اس درخت کی ایک اور ٹہنی سے لپٹ گئی۔ مگر وہ بھی آندھی کے تیز جھونکوں کی وجہ سے گر گئی۔ پھر میں نے درخت کی دو شاخوں میں سے ایک کو تھام لیا۔ لیکن آندھی کے بے رحم جھونکوں نے اسے بھی توڑ ڈالا اور وہ شاخ بالآخر مجھ سے دور ہو گئی۔ نانا اس خواب کی کیا تعبیر ہو گی؟" حضور اکرمؐ جناب زینبؑ کا خواب سن کر زار و قطار رونے لگے اور فرمایا: "درخت سے مراد تمھارا جد (رسول اللہؐ) اور پہلی ٹہنی سے مراد تمھاری ماں فاطمہ زہراؑ اور دوسری ٹہنی سے مراد تمھارے والدِ گرامی علی مرتضیٰؑ اور دو شاخوں سے مراد تمھارے دونوں بھائی حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔"

کتابوں میں دوسری حدیث اس طرح مرقوم ہے کہ ایک روز جناب فاطمہؑ نے پیغمبر

اکرمؐ سے جناب زینبؑ اور حضرت امام حسینؑ کی والہانہ محبت کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو آپؐ اشکبار ہو گئے اور آپؐ نے فرمایا: "یہ دونوں بہن بھائی مصائب و آلام میں شریک ہیں۔"

جناب زینبؑ کا سن ابھی پانچ ساڑھے پانچ سال کا تھا کہ مشفق نانا کو اللہ کا بلاوا آ گیا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کنبہ پر جیسے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ باپؑ کو منصب خلافت اور ماں کو حق وراثت سے محروم کر دیا گیا۔ ان باتوں کا ماں کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ چند ہی دنوں میں بابا کے پاس چلی گئیں اور شہزادی زینبؑ ماں کی شفقت سے محروم ہو گئیں۔ ان چند روز میں کیسے کیسے خوں چکاں مناظر دیکھنے پڑے کہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس کے اوسان گم ہو جاتے مگر یہ تو خاندانِ نبوت کی بچی تھی۔ اس کی رگوں میں صبر و ضبط کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ باپ اور بھائیوں کی تربیت کا اثر قبول کرتے ہوئے ہمت و استقامت سے زندگی کے پر ہول سفر کو طے کرتی رہی۔

جناب زینبؑ باشعور ہوتے ہی جناب عبداللہ ابن جعفر کی زوجیت میں آ گئیں۔ جناب عبداللہ حضرت علیؑ کے بڑے بھائی جناب جعفر طیار کے فرزند تھے جن کی دو ہجرتیں، ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ مشہور ہیں۔ جناب جعفر طیار جنگ موتہ میں لشکر اسلام کے سپہ سالار اور علم دار تھے اور اس جنگ میں بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ جناب جعفر طیار وہ پہلے مجاہد ہیں جن کے دونوں ہاتھ راہ خدا میں جہاد کرتے ہوئے قطع ہوئے۔ جس پر حضورؐ نے بشارت دی کہ اللہ انہیں دو بال و پر عطا فرمائے گا جس سے وہ جنت میں پرواز کریں گے۔ اسی مناسبت سے ان کا لقب طیار یعنی پرواز کرنے والا قرار پایا۔ جناب عبداللہ نے حضرت علیؑ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ کہتے ہیں کہ شادی کے وقت جناب زینب نے حق مہر میں اور کچھ نہیں صرف بھائی سے ملتے رہنے اور ہمیشہ ساتھ رہنے کی اجازت طلب فرمائی۔ تاریخ میں بہن بھائی میں چاہت کی ایسی کوئی مثال شاید ہی ملے۔

جب حضرت نے کوفہ کو دار الخلافہ بنایا تو یہ سب کوفہ آ گئے۔ یہاں پر شہزادی نے درس و

تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ کوفہ میں خواتین کی ایک بڑی تعداد ان کی بارگاہ میں درس لینے کے لئے حاضر ہوتی تھی۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں حضرت علیؑ کے ظاہری دور خلافت میں سب سے زیادہ سازشیں ہوئیں اور بالآخر انہیں رمضان المبارک ۴۰ ہجری میں شہید کر دیا گیا۔ اب شہزادیؑ کے بھائی جناب امام حسنؑ کا دور خلافت شروع ہوا۔ وہ ٹولہ جو حضرت علیؑ کے راستے کا پتھر تھا پھر سر اٹھانے لگا اور امام معصومؑ کو باپ کی طرح مدینہ میں گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا اور آخر میں انہیں بھی زہر سے شہید کر کے راستے سے ہٹا دیا۔ اس امامؑ کو مرنے کے بعد بھی اس طرح اذیت پہنچائی گئی کہ نانا کے پہلو میں دفن نہیں ہونے دیا گیا بلکہ جنازے پر تیر برسائے گئے۔ دکھیا بہن نے یہ منظر بھی دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے بھائی کی لاش سے تیر نکالے۔ شہزادیؑ کے لئے نانا، ماں اور باپ کے بعد یہ ایک اور بڑا صدمہ تھا۔

شہزادیؑ کے مرکزِ نگاہ اب حضرت امام حسینؑ تھے جو انتہائی تدبر اور متانت سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بظاہر گوشہ نشینی کی سی زندگی گزار رہے تھے مگر حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے کیوں کہ بحیثیت امام وقت اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے۔ ہر چند کہ امیر شام نے صلح حسنؑ کا پاس نہیں رکھا تھا مگر یہ امام تھے اور بھائی کے عہد کا پاس رکھتے ہوئے تمام شرائط کی پاسداری کر رہے تھے اور فریق مخالف کو بدامنی پھیلانے کا کوئی موقع نہیں دے رہے تھے۔ ہاں اپنا کار امامت بہ طریق احسن انجام دے رہے تھے۔ مدینہ، کوفہ یا کسی بھی علاقے کے مسلمانوں کی رشد و ھدایت سے غافل نہیں تھے۔ ایسے میں معاہدۂ صلح حسنؑ کے برخلاف یزید کی جانشینی کا اعلان ہوا اور اس نے تخت سنبھالتے ہی سب سے پہلے حضرت امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنے اور بصورت دگر ان کا سر قلم کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ ایسے میں شہزادی زینبؑ کی نظروں میں دنیا اندھیری ہو رہی تھی۔ ایک بھائی کے بعد دوسرا آنکھوں کے سامنے تہِ تیغ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن آپ ایک جری کی بیٹی تھیں۔ ماں

باپ کی وصیتیں یاد تھیں۔ بھائی کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جب بھائی نے مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو آپ بھی ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ ان کے پیش نظر احکامات قرآنی تھے۔ "اور اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کی طرف تیزی سے قدم بڑھاؤ، جس (جنت) کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ جسے پرہیزگاروں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔" آل عمران۔ آیت ۱۳۳۔ یا "تم لوگ بہترین گروہ ہو، جسے بنی نوع انسان کے لئے (منصۂ شہود پر) لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور خدا پر یقین رکھتے ہو۔۔۔" آل عمران۔ آیت ۱۱۰۔ "اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔" آل عمران۔ آیت ۱۰۴۔ شوہر پہلے ہی حسینؑ کے گرویدہ و جاں نثار تھے۔ ساتھ جانا چاہتے تھے مگر بیماری اور حکم امام کے پیش نظر مدینہ ہی میں قیام کیا البتہ جب انہیں یہ خبر ملی کی حسینؑ مکہ چھوڑ کر اب عراق کی طرف عازم سفر ہیں تو وادی تنعیم (مکہ کے مضافات) آکر اپنے دو بیٹوں کو حسینؑ کی خدمت میں اپنی طرف سے پیش کر دیا۔

مدینہ سے روانگی کے وقت جناب زینبؑ کی شان ہی اور تھی۔ جوانان بنی ہاشم جن میں اپنے بھائی، بھتیجے اور دوسرے قریبی اعزا شامل تھے ان کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ سوار ہوتے ہوئے اور روانگی کے وقت دور دور تک گزرگاہیں بند کر دی گئیں تھیں۔ حتیٰ کہ مرزا دبیر کے ایک مرثیہ میں مذکور ہے کہ دراز قد لوگوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی گردنیں جھکا کے گزریں تا کہ کسی کی نظر خاندان عصمت و طہارت کی کسی فرد پر احتمالاً بھی نہ پڑ سکے۔

شاید یہ شہزادی کی زندگی کا یہ آخری یادگار منظر تھا جہاں جان چھڑکنے والے بھائی بھتیجے اور دیگر اہل خاندان ان کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھائے موجود تھے۔ اس کے بعد کی ہر گھڑی بڑی کٹھن تھی۔ کس میں طاقت کہ ان دنوں کی تفصیل بیان کر سکے جو آج کے بعد سے شہزادی نے گزارے۔ دکھوں کا اک سیل بے پناہ ہے۔ مدینہ سے روانگی، مکہ میں قیام، حج کا

عمرہ سے تبدیلی کا ارادہ، راستے میں حضرت مسلم ابن عقیلؑ کی شہادت کی سنائی، کربلا میں آمد جہاں کی ہواؤں میں گریہ وزاری اور مٹی سے بھائی کے خون کی بو آرہی تھی، یہ سب ایسے عوامل تھے جو شہزادی نے ہمت سے دیکھے۔ پھر شب عاشور آئی اور صبح شہادت نمودار ہوئی۔ ایک ایک کر کے سب پیرو جوان عازم خلد ہوئے۔ گود کے کھلائے عونؑ و محمدؑ، اولاد کی طرح پالے ہوئے علی اکبرؑ، بڑے بھائی کی نشانی قاسمؑ، سائے کی طرح محافظ عباسؑ کی قربانیاں دیکھیں پھر بھائی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے دیکھا۔ شام غریباں آئی اور شہزادیؑ کا اصل امتحان اب شروع ہوا۔ دشمنوں کا رخ خیمہ گاہ کی طرف دیکھا مگر ایسے میں بھی کنبہ کی فکر دامن گیر رہی۔ بیمار بھتیجے کو سنبھالا۔ بیبیوں اور بچوں کو آغوش میں رکھا اور لوٹ مار، بے پردگی، اسیری کو استقامت سے جھیلا۔ کہیں ہمت نہیں ہاری۔ اس کے بعد کوفہ وشام کی منزلیں تھیں۔

قلم میں ان آلام کو رقم کرنے کی قوت نہیں۔ ان ایام میں آپ کے خطبات ہیں جن کی تفصیلات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ان میں سے تین مواقع ایسے ہیں جن کے ذکر سے شہزادیؑ کی حوصلہ مندی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر صرف بازار کوفہ کا ایک خطبہ جو کم بیان ہوتا ہے کا مختصر بیان:

بشیر بن خزیم الاسدی (جو اسی دن کوفہ پہنچا تھا، بازار میں موجود تھا) کہتا ہے:

میں نے اس روز دختر علیؑ حضرت زینبؑ کو دیکھا۔ خدا کی قسم اس دن تک میں نے حضرت زینبؑ سے زیادہ باعفت و باحیا گفتگو کرنے والی کوئی خاتون نہیں دیکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؑ امیر المومنین علی ابن ابیطالبؑ کی زبان میں گویا ہیں۔ پھر میں نے ثانی زہراؑ کو دیکھا کہ اس طرح فرما رہی تھیں۔ "تمام حمد وثناء اللہ تعالیٰ (کی ذات اقدس) کے لئے مخصوص ہے۔ درود ورحمت پروردگار ہو میرے پدر بزرگوار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کے پاک خاندان پر جو (دنیا میں) ممتاز افراد ہیں۔ حمد پروردگار کے بعد اے کوفہ کے رہنے والو، اے وہ لوگو جو مکر وفریب ودھوکہ کے خوگر اور بے ہودہ گوئی کے عادی ہو۔ کیا تم

(ہمارے مصائب پر) گریہ کناں ہو؟ کاش تمہاری آنکھیں کبھی آنسوؤں سے خشک نہ ہونے پائیں، تمہارے اشک و آہ کبھی ختم نہ ہوں، یقیناً تمہاری داستان ایسی ہے جیسی اس نادان عورت کی تھی جس نے اپنے رشتہ و تعلق کو استوار کرنے کے بعد توڑ ڈالا۔ تم نے بھی (ہمارے ساتھ) اپنے رشتہ کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دیا۔ کیا تم میں فساد و خوشامد و خود بینی و نخوت و تکبر کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے؟ تم جاہلیت کے اخلاق و صفات کی طرف پلٹ گئے ہو۔ تمہارے کردار میں اب کنیز زادوں کی طرح چاپلوسی اور دشمنان دین کے نخرے اٹھانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا تم اس گھاس کی طرح نہیں ہو جو کوڑے کے ڈھیر پر اگتی ہے؟ یا تم اس کے سوا کچھ نہیں گویا چاندی کی کان مٹی میں چھپی ہوئی ہو۔ آگاہ رہو اور جان لو کہ تم نے خود اپنے لئے بدبختی فراہم کی ہے۔ مطمئن رہو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب و شدت غضب تم پر آ چکا ہے۔ اور تم اب عذاب خداوندی میں مستقلاً گرفتار رہو گے۔ کیا تم ہمارے عزیزوں کو قتل کرنے کے بعد اب روتے ہو؟ یقیناً خدا کی قسم۔۔۔۔ تمہیں رونا ہی چاہیئے۔ بس تم زیادہ روؤ اور کم ہنسو۔ تم نے اپنے لئے ننگ و عار خرید کیا اور اپنے دامن میں ننگ و عار کا پیوند لگایا۔ ایک ایسا پیوند و دھبہ کہ جس کو اپنے دامن سے دھو ڈالنا تمہارے لئے ہرگز ممکن نہیں۔ تم سے کیسے ممکن ہے کہ خاتم النبیینؐ کے خاندان کے قتل کو جرم کو اپنے سے جدا کر سکو۔ وہ پیغمبرؐ جو رسالت کی جان اور عظیم ترین رسالت کے معدن ہیں۔ اور حسینؑ جو جوانان اہل بہشت کے سردار ہیں۔ تم نے انہیں قتل کیا جو تمہارے لئے پناہ اور تمہاری ہدایت کا چراغ تھے۔ جو تمہارے لئے بلا و مصیبت کے طوفانوں میں تمہاری اعانت و سکون کا منبع تھے۔ وہ تمہارے لئے روشنی بخشنے والا چراغ اور تم پر اللہ تعالیٰ کی حجت تھے۔ وہ تمہارے لئے سنتوں کا مرکز و محل تھے۔ جان لو کہ تمہارا جرم بہت سنگین ہے۔ (خدا کرے) تم خیر و سعادت سے محروم رہو۔ تمہاری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوں۔ تمہارے ہاتھ کٹ جائیں۔ اس گناہ عظیم کے سبب شدید نقصان سے دوچار ہو۔ تم نے اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مستحق قرار دے لیا ہے۔ ذلت

وشکست کے تازیانے تمہارے سروں پر پڑتے رہیں گے۔ تم نے بدترین کام انجام دیا ہے۔ جس کے سبب خوف ہے کہ آسمانوں میں شگاف پڑ جائیں، زمین پھٹ جائے اور پہاڑ اس میں سما جائیں۔ اے اہلِ کوفہ وائے ہو تم پر۔ کیا تم جانتے ہو کہ تم نے رسول اللہؐ کے جگر کو زخمی کیا؟ تم نے کس طرح ان کی ہتکِ حرمت کی، کیسے تم نے ان کا خون بہایا، کس طرح تم نے ان کے پردۂ حرمت کو پھاڑ ڈالا؟ تم ایک بہت بڑے گناہ اور جرم کے مرتکب ہوئے ہو۔ ایسے حیران و پریشان کن گناہ جنہوں نے زمین کو بھر دیا، آسمانوں پر چھا گئے اور اسے تاریک کر دیا۔ اگر اس غم میں آسمان سے خون برسنے لگے تو کیا تم تعجب کرو گے؟ پھر بھی عذاب خدا آخرت میں سخت تر اور ذلت آور ہوگا۔ اس دن کوئی تمہاری مدد کے لئے نہیں اٹھے گا۔ تمہارے عذاب میں اللہ نے جو تمہیں مہلت دی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ اس نے تمہارے گناہوں کو چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے کے لئے جلدی و تیز اقدام نہیں کرتا۔ اس بات میں اسے (اللہ کو) کوئی عار نہیں کہ خون مظلوم کے انتقام میں تاخیر فرمائے۔ تاہم اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے لئے قریب اور ان کی گھات میں ہے۔"

جناب زینب کے وہ خطبے جو آپ نے دربار ابن زیاد اور دربار یزید میں دیئے وہ اور زیادہ سخت ہیں۔ ہم نے اس خطبے کا انتخاب اس وجہ سے کیا کہ یہاں مخاطب عوام الناس تھے جنہیں معاملے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ شہزادی کو احساس تھا کہ یہ خطبہ دشمنوں کے درمیان دیا جا رہا ہے۔ ایک مصیبت زدہ اور اپنے عزیزوں کی شہادت کے داغ سینے پر لئے ہوئے خاتون کا یہ خطبہ اتنا مطالب افروز اور پر معنی ہے کہ جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کلمات نے حالات کا رخ موڑ دیا اور کوفے میں جیسے انقلاب آ گیا۔ اس خطبہ کو سن کر لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ ایک بوڑھا شخص جو آپ کی باتیں سن رہا تھا رو رو کر کہہ رہا تھا: "میرے ماں باپ تم پر قربان! تمہارے بوڑھے بہترین بوڑھے ہیں، تمہارے جوان بہترین جوان ہیں، تمہاری خواتین بہترین خواتین ہیں، تمہارے خاندان کی نسل بہترین نسل ہے اور تم کبھی کسی

حالت میں شکست و ریخت سے دو چار نہ ہو گے۔" واقعہ کے گواہ ایک اور شخص کا بیان ہے: "خدا کی قسم میں نے لوگوں کو دیکھا کہ حیران و مبہوت ہو کر تنہائی میں رو رہے ہیں، اپنے ہاتھوں کو منھ پر رکھے ہوئے آنسو بہا رہے ہیں۔" کوفے کی عورتیں حیران ہو کر پوچھنے لگیں کہ تم کس خاندان سے ہو؟ جواب میں شہزادیؑ نے اپنا تعارف کرایا "ہم اسیران خاندان محمد مصطفیؐ ہیں"

یہ کارنامہ شہزادی زینبؑ کا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ آپؑ کا یہی وطیرہ دربار ابن زیاد، دربار یزید اور قید خانہ شام میں بھی رہا۔ جب بھی اور جہاں بھی ذرا بھی موقعہ ملا آپؑ نے حسینؑ کا تعارف اور حسینؑ کا پیغام عام کر دیا۔

شہزادیؑ کی جدوجہد رنگ لائی۔ ملک کے کونے کونے سے احتجاج کی آوازیں پہلے جیسی پھر بلند ہوتی گئیں۔ لشکر یزید کے خلاف عوام میں بے پناہ نفرت پیدا ہو گئی۔ مساجد میں ذکر حسینؑ ہونے لگا۔ یزید کے قریبی لوگوں نے بھی اسے مطعون کرنا شروع کر دیا اور اس کے پاس سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا کہ انہیں باعزت رہا کر کے وطن روانہ کر دے۔ مدینہ سے پہلے شہزادیؑ نے کربلا جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے رخصت ہو کر عازمِ مدینہ ہوئیں۔ راستے میں ہر شہر اور قصبہ کے لوگ ارد گرد جمع ہو جاتے جو قافلے والوں سے سن کر جاتے وہ اپنے بھائی بندوں اور دوسرے شہریوں کو سناتے۔ اس طرح جو کچھ کربلا میں آل رسولؐ پر بیتی تھی، گھر گھر کی کہانی بن گئی۔ لوگ جمع ہوتے، حالات سنتے، ماتم کرتے۔ حسینؑ سے عقیدت اور ان کے قاتلوں سے نفرت تیزی سے بڑھی۔ یہ وہ آگ تھی جسے بجھانا بڑی سے بڑی طاقت کے بس کی بات نہیں۔

کتاب "سخن" جو استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی تقاریر کا مجموعہ ہے سے ایک تقریر کا اقتباس:

"یہ تکالیف اور سختیاں ہی ہیں جن کے نتیجے میں بڑے بڑے سورما اور غیر معمولی ذہین اور عبقری پیدا ہوتے ہیں۔ طاقت اور قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ تکالیف برداشت کر کے ہی وہ عظیم رہنما وجود میں آئے جنھوں نے دنیا کو بڑی بڑی تحریکوں سے روشناس کیا۔

ہماری مذہبی اور دینی تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ خواتین اسلام میں ایک قابل فخر خاتون زینب کبریٰ علیہا السلام ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کربلا کے خونیں مصائب اور شدائد نے حضرت زینب علیہا السلام کو فولاد بنا دیا تھا۔ جو زینب شام سے مدینے واپس آئیں وہ وہی زینبؑ نہیں تھیں جو مدینے سے روانہ ہوئی تھیں۔ جو زینبؑ شام سے واپس آئیں وہ کہیں زیادہ بلند تھیں۔ جو مدینے سے روانہ ہوئی تھیں حتیٰ کہ دوران اسیری میں جو کارنامے آپؑ سے ظہور پذیر ہوئے وہ ایام کربلا کے ان واقعات سے یکسر مختلف ہیں جب آپؑ کے عظیم بھائی ابھی زندہ تھے اور آپؑ پر ابھی ذمہ داری کا بوجھ نہیں پڑا تھا۔

ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی ہمارے زمانے کی ایک قابل مسلمان عرب خاتون ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام بطلۃ کربلا (کربلا کی عظیم خاتون) ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کی عظمت کا سبب زیادہ تر حوادث و مصائب کربلا ہی ہیں۔ یہ واقعات کربلا ہی تھے جو اس کا موجب ہوئے کہ حضرت زینبؑ نے دربار یزید میں وہ آتش بار خطبہ دیا جو آپ سب نے سنا ہے۔"

جس طرح جناب فاطمہؑ بابا کی جدائی نہ برداشت کر سکیں ویسے ہی جناب زینبؑ بھی بھائی کی فرقت برداشت نہ کر سکیں اور صرف ڈیڑھ دو سال ہی زندہ رہ سکیں اور بھائی کو روتے روتے بھائی کے پاس چلی گئیں۔

باحوصلہ، جرأت مند اور تاریخ ساز خواتین کا جب بھی ذکر آئے گا جناب زینبؑ کا ذکر سب سے پہلے آئے گا۔

(اس مضمون کی تیاری میں ان کتب سے مدد لی گئی: "سخن" از استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ۔ "جناب زینب کبریٰؑ" از علامہ سید رضی جعفر نقوی۔ "علیؑ کی بیٹی۔ سوانح حیات" از ڈاکٹر علی قائمی۔ ترجمہ سید محمد حسین زیدی البارھوی۔ "ایک قطرہ خون" از عصمت چغتائی۔)

عالمہ آلِ عباء شہزادی فاطمہ معصومہ قم سلام اللہ علیہا

جنابِ معصومہ قم کا اصل نام "فاطمہ" تھا۔ ساتویں امام باب الحوائج حضرت موسیٰ ابنِ جعفر علیہ السلام آپؑ کے والد اور جنابِ نجمہ خاتونؒ جو امام رضا علیہ السلام کی بھی والدہ ہیں آپ کی مادرِ گرامی ہیں۔ آپؑ یکم ذی القعدہ ۱۷۳ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں اور ۱۲ ربیع الثانی ۲۰۱ھ میں شہرِ قم میں وفات پائی۔ آپ عالم اسلام کی عظیم القدر خواتین میں سے ایک ہیں۔ آپ کے بھائی، والد اور دادا امام معصوم تھے اور جدِّ امجد حضرت ختمی مرتبت پیغمبرِ اکرم احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک مقدس اور اخلاق فضائل سے مالا مال خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کی عظمت و بزرگی آپ کے ان اسماء و القابات سے بھی ظاہر ہوتی ہے:

۱۔ طاہرہ: پاک و پاکیزہ۔ ۲۔ حمیدہ: تعریف و ستائش یافتہ۔ ۳۔ برّہ: نیک۔ ۴۔ رشیدہ: ہدایت یافتہ و عاقلہ۔ ۵۔ تقیہ: پرہیزگار۔ ۶۔ رضیہ: اللہ سے راضی۔ ۷۔ مرضیہ: جس سے اللہ راضی ہو۔ ۸۔ سیدہ صدیقہ: بے حد سچی خاتون۔

جنابِ معصومہ قم کی حیات مبارکہ کئی اعتبار سے جنابِ زینبؑ سے مماثل ہے۔ اوّل یہ کہ آپؑ جناب زینب کبریٰؑ کی طرح عالمۂ غیر معلمہ (عالمہ ہیں مگر ان کا کوئی استاد نہیں) ہیں۔ دوسرے یہ کہ بھائی سے بے مثال محبت۔ تیسری بات بھائی کے مشن کی تکمیل اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جرأت سے مقابلہ کرنا۔ اس کے علاوہ زہد و عبادت، پارسائی و تقویٰ، صداقت اور حلم، مشکلات و مصائب میں صبر و استقامت، جود و سخا، رحمت و کرم، پاک

دامنی اور ذکرِ الٰہی میں ان دونوں بیبیوں کی نظیر نہیں ہے۔

آپ کی علمی قدر و منزلت اس روایت سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایک روز شیعانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا ایک گروہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں مدینۂ منورہ آیا۔ چونکہ امامؑ سفر پر گئے ہوئے تھے اور یہ لوگ امام سے کچھ سوالات پوچھنے آئے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے سوالات حضرت فاطمہ کو پیش کیے جو ابھی نو عمر بچی تھیں۔ یہ لوگ دوسرے روز پھر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر امام ابھی نہیں لوٹے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوال واپس مانگے۔ سیدہ معصومہ نے ان سوالات کے جوابات تحریر کر رکھے تھے۔ جب ان لوگوں نے اپنے سوالات کے جوابات دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور مدینہ سے واپس جانے لگے۔ اتفاق سے راستے میں ان کی ملاقات امام موسیٰ کاظمؑ سے ہوگئی۔ انہوں نے پورا واقعہ امامؑ کو گوش گزار کیا۔ جب امامؑ نے سوالات اور جوابات کا مطالعہ کیا تو بے ساختہ کہا "باپ اس پر فدا ہو، باپ اس پر فدا ہو"۔

حضرت معصومہؑ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ خاندان رسالت کی خواتین میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ تاریخِ اسلام میں جنابِ رسالت مآب کی والدہ حضرت آمنہؑ بنتِ وہب، حضرت علیؑ کی والدہ حضرت فاطمہؑ بنتِ اسد، جناب سیدہ کی والدہ جنابِ خدیجہؑ بنتِ خویلد، حضرت عباسؑ کی والدہ جنابِ ام البنینؑ، جنابِ زینبؑ بنتِ علیؑ، حضرت امام علی نقیؑ کی ہمشیرہ حضرت حکیمہ خاتونؑ اور حضرت امام مہدیؑ کی والدہ ماجدہ جنابِ نرجس خاتونؑ جیسی عظیم اور عالی مرتبت خواتین ہو گزری ہیں جن کے مقام و منزلت میں شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے مگر اتنی کم عمری میں جنابِ فاطمہ معصومہؑ نے خاتون ہوتے ہوئے جو معیار عظمت و بزرگی دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ایسا ہے کہ آپ کو بھی ان عظیم المرتبت خواتین کی صف میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ اس معظمہ کی خصوصی شان و منزلت ہے کہ معصومین ان کے لئے زیارت مدوّن فرمائیں تاکہ پیروکارانِ اہلِ بیتِ عصمت و

طہارت بالخصوص خواتین اس عظمت کا پاس رکھیں اور روئے زمین پر عفت وحیاوتقویٰ کے نمونے پیش کرتی رہیں۔

سب جانتے ہیں کہ جناب امام رضاؑ کو مجبوراً شہر مرو آنے پر مجبور کیا گیا۔ بھائی سے والہانہ محبت کرنے والی بہن کچھ عرصہ بعد ہی اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ دیدار اور اپنے امام زمانہ سے تجدید عہد کی نیت سے عازمِ سفر ہوئیں۔ جب ساوہ پہنچیں تو معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگ اس زمانے میں اہلِ بیت کے مخالف تھے لہٰذا انہوں نے حکومتی کارندوں سے مل کر آپ کے قافلے پر حملہ کر دیا جس سے بہت سے لوگ، جس میں آپ کے کئی بھائی بھی شامل تھے شہید ہو گئے۔ آپ غم والم کے سبب علیل ہو گئیں۔ ایک روایت کے مطابق ساوہ میں ایک عورت نے آپ کو زہر دے دیا۔ جس سے آپ بیمار ہو گئیں اور محسوس کیا کہ اب خراسان نہ جا سکیں گی اور اب زیادہ دیر زندہ بھی نہ رہ سکیں گی۔ آپ نے فرمایا مجھے شہرِ قم لے چلو۔ میں نے اپنے بابا سے سنا ہے کہ قم ہمارے شیعوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ آپ واردِ قم ہوئیں۔ ... نے آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ موسیٰ بن خزرج اشعری آپ کو عزت واحترام سے لے آئے۔ بی بی نے ۱۷ دن اس شہرِ مقدس میں مسلسل مشغول عبادت رہ کر ... بالآخر دعوت حق کو لبیک کہا اور سن ۲۰۱ ہجری آپ کی شہادت کا سال قرار پایا۔

آپؑ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد آپؑ کو غسل دیا گیا۔ تکفین کے بعد قبرستانِ بابلان کی طرف آپؑ کی تشیع کی گئی لیکن دفن کے وقت کسی محرم نہ ہونے کے سبب لوگ پریشان ہو گئے۔ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ دو سوار صحرا کی طرف سے آ رہے ہیں۔ نزدیک پہنچ کر دونوں سواری سے اترے اور کچھ کہے بغیر نماز جنازہ پڑھی اور اس گل چمن زار رسالتؐ کے جسدِ اطہر کو سرداب میں دفن کر دیا اور کسی کو کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔ کوئی ان لوگوں کو نہ پہچان سکا۔ یہ امر بعید نہیں کہ یہ دو بزرگوار دو امامِ معصوم رہے ہوں جو

اس اہم کام کے لئے قم تشریف لائے اور چلے گئے۔ جنابِ موسےٰ بن خزرج جو آپ کے میزبانِ خاص تھے نے حصیر و بوریا کا ایک سائبان قبرِ مطہر پر ڈال دیا جو ایک مدت تک باقی رہا۔ جب حضرت زینبؑ بنتِ امام محمد تقیؑ قم تشریف لائیں تو انہوں نے مقبرے پر اینٹوں کا قبہ تعمیر کرا دیا۔

شفاعت کا اعلیٰ ترین مقام جنابِ رسالت مآبؐ کا مقام ہے جسے قرآن کریم نے مقامِ محمود قرار دیا ہے۔ اسی طرح خاندان رسالتؐ میں دو خواتین کے لئے وسیع شفاعت مقرر ہے۔ پورے اہلِ محشر ان دو عالی مرتبت خواتین کی شفاعت سے مشرف ہو سکتے ہیں' بشرطیکہ وہ شفاعت کے لائق ہوں۔ یہ دو عالی مرتبت خواتین جنابِ فاطمہ زہراؑ اور جنابِ فاطمہ معصومہؑ ہیں۔ جنابِ فاطمہ زہراؑ کا مقام شفاعت یوں ہے کہ شفاعت آپ کا حق مہر ہے۔ جب آپ کا نکاح حکمِ الٰہی کے تحت حضرت علیؑ سے ہو رہا تھا' قاصدِ وحیؑ نے خدا کا بھیجا ہوا شادی کا تحفہ جنابِ رسالت مآبؐ کے حوالے کیا۔ وہ تحفہ ایک ریشمی کپڑا تھا جس پر لکھا تھا ''امتِ محمدؐ کے گنہگاروں کی شفاعت خداوندِ عالم نے فاطمہ زہراؑ کا حقِ مہر قرار دیا ہے''۔ جنابِ سیدہؑ کے بعد حقِ شفاعت جنابِ فاطمہ معصومہؑ کے علاوہ کسی اور خاتون کو حاصل نہیں ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے تین دروازے قم کی جانب کھلتے ہیں۔ میری اولاد میں سے ایک خاتون جن کا نام فاطمہؑ ہے قم میں رحلت فرمائیں گی جن کی شفاعت سے ہمارے تمام شیعہ بہشت میں وارد ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں خواتین ذاتی اور خاندانی شرافت کے ساتھ ساتھ ایمان اور عمل کے میدان میں بھی ممتاز تھیں اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے انتخاب سے اعلیٰ انسانی اقدار کے اعلیٰ مدارج و مراتب طے کئے تھے اور اپنے عرفان و عمل کی بناء پر اس مقام و منزلت تک عروج کر چکی تھیں۔ حضرت معصومہؑ عمل' عرفان'

ایمان، سیاست اور مقام امامت کی حمایت کے سلسلے میں ممتاز تھیں اور آخر کار اسی راستے میں مرتبۂ شہادت پا گئیں۔

آپؑ نے قم میں اپنے سترہ دن عبادت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز و نیاز میں گزار دیئے۔ آپؑ کی قیام گاہ کو "بیت النور" کا نام دیا گیا اور یہ عبادت گاہ اس وقت قم کے میدان میر کے محلّے اور مدرسہ ستیہ میں ہے جو آپؑ کی نورانیت اور خالق حقیقی سے آپ کی قربت کی گواہی دے رہی ہے۔

شہزادیؑ کے سترہ روزہ بابرکت قیام نے قم کے حوزۂ علمیہ کو بقائے جاودانہ بخشی۔ آپؑ ہی کے قدموں کی بدولت ہزار ہا محقق، عالم، دانش ور، مراجع اور مجتہدین عالم تشیع کے حوالے کر دیئے۔ اکابر علماء جیسے امام رضاؑ کے صحابی زکریا بن آدم، اور امام حسن عسکریؑ کے وکیل حسین بن اسحاق سے لے کر علمائے مفکر اور مراجع تقلید جیسے میرزائے قمی، آیت اللہ شیخ ابوالقاسم قمی، آیت اللہ حائری، آیت اللہ صدر، آیت اللہ سید محمد تقی خوانساری، آیت اللہ حجت، آیت اللہ بروجردی، آیت اللہ سید احمد خوانساری، آیت اللہ گلپایگانی، آیت اللہ مرعشی نجفی، آیت اللہ اراکی، علامہ طباطبائی، استاد شہید مرتضیٰ مطہری و حضرت آقائے خمینی اعلی اللہ مقامہم الشریف تک سب کے سب عالم، عالمۂ آل عبا حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کے وجود کی برکت سے اس سرزمین پر نشو و نما پا چکے ہیں اور بی بیؑ ہی کے وجود نے حوزۂ علمیہ کو مرکزیت و محوریت عطا فرمائی ہے اور قم نے آپؑ ہی کی برکت سے مدینۂ فاضلہ کی حیثیت اختیار کی ہوئی ہے۔ اسلامی انقلاب درحقیقت اسی سرزمین کے فرزند کی آغوش میں پلا بڑھا۔

(اس مضمون کا بیشتر مواد انٹرنیٹ کے توسط سے جناب رزمی صاحب کے ارسال کردہ فیس بک کے ایک پیغام سے اخذ کیا گیا ہے۔)

سفیرِ حسینؑ، شہیدِ کوفہ، جناب مسلم بن عقیلؑ

جناب مسلم بن عقیلؑ، سانحۂ کربلا کا ادراک کرنے والے اولین لوگوں میں سے ہیں۔ بچپن ہی سے یہ امیر المومنین حضرت علیؑ کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ ان کی تربیت ان خطوط پر ہوئی جو خاندان نبوت کے پروردہ لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ آپؑ کی حیات مبارکہ اور کارناموں کا جائزہ لینے سے پہلے ایک نظر ایک آیۂ قرآنی پر کرتے ہیں۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۹۵ میں ارشاد باری ہے: ترجمہ۔ جن لوگوں نے میری خاطر ہجرت کی ہو اور اپنے گھروں سے نکالے گئے ہوں اور ستائے گئے ہوں اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ہوں تو میں ان کے گناہوں کی تلافی کروں گا اور انہیں ایسے باغیچوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ہے جزاء اللہ کے ہاں! اور بہترین جزاء تو اللہ ہی کے پاس (ملتی) ہے۔

جناب مسلمؑ امیر المومنین حضرت علیؑ کے بھائی جناب عقیلؑ کے فرزند تھے۔ جناب عقیلؑ خاندان ابوطالب کے ممتاز فرد تھے۔ آپ ماہرِ علم الانساب تھے۔ عرب کے بڑے بڑے خاندانوں کے شجرے انہیں ازبر تھے۔ بہت مشہور روایت ہے کہ جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کی رحلت کے بعد جب حضرت علیؑ نے دوسری شادی کا ارادہ کیا تو آپ نے جناب عقیلؑ سے مشورہ کے بعد جناب ام البنینؑ سے اس لئے عقد فرمایا کہ وہ ایک بہادر اور نامور قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جناب عباس علمدارؑ ان ہی کے بطن مبارک سے تھے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص دوسروں کو شادی کے سلسلے میں مشورے دیتا ہو، خود اس نے اپنی شادی

کے وقت خاندان اور قبیلہ کی کتنی چھان بین کی ہوگی۔ تاریخ میں جناب مسلم کی والدہ کا نام نبطیہ ملتا ہے۔ آپ ایران کے فرزندی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جناب مسلمؑ کے خاندان کی عظمت کا اندازہ اس حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ جن پر صدقہ حرام ہے وہ آلِ عباس، آلِ علی، آلِ جعفر، آلِ عقیل اور آلِ حرث بن عبدالمطلب ہیں۔ یہ روایت بیشتر تفاسیر میں آیہ مودت (**قل لا اسئلکم علیه اجرا** ۔۔۔ شوریٰ آیت ۲۶) کی تفسیر میں بیان ہوئی ہے۔ جناب مسلمؑ کے دادا جناب ابوطالبؑ، چچا حضرت علیؑ و جعفرؑ کی بہادری اور شمع رسالت کی حفاظت کی خاطر کدو کاوش سے کون آگاہ نہیں۔ جناب مسلمؑ کی بہن جناب امِ ہانیؒ بھی ایک بافضیلت خاتون تھیں۔ حضور اکرمؐ معراج پر اور جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ حضرت علیؑ کی ولادت کے لئے خانہ کعبہ انہی معظمہ کے گھر سے روانہ ہوئے۔

جناب مسلم علم وفضل میں، زہد وتقویٰ میں، شجاعت ودلیری میں یکتا تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے اپنے خاندان میں سے چن کر آپ کو اپنا نائب بنا کر کوفہ اسی لئے روانہ فرمایا تھا کہ آپ کا علم وفضل بہت بلند تھا۔ وہ وقت اور موقعہ کی مناسبت سے حضرت امام حسینؑ کی نیابت سب سے احسن طریقہ سے کر سکتے تھے۔ سفارت معمولی کام نہیں ہوتا۔ سفیر کسی کا نمائندہ ہوتا ہے، اسے ہر کام نہایت سوچ سمجھ کر اور جس کی نمایندگی کر رہا ہو اس کے وقار و مفاد کے پیشِ نظر کرنا ہوتا ہے۔ جناب مسلم کے علم وحلم پر حضرت امام حسینؑ کو پورا اعتماد تھا۔ کتابوں میں ملتا ہے کہ جناب مسلم کوفہ روانگی کے وقت زار وقطار رو رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیا جان کے خوف سے روتے ہو، فرمایا جان کے خوف سے نہیں، اس بات پر گریہ کرتا ہوں کہ تمام عمر فرزند رسول کی خدمت گزاری میں رہا، اب مشکل وقت میں ان کا ساتھ چھوٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ آپ دو بار جا جا کر واپس آئے جو آپ کی حسینؑ سے دلبستگی کے سبب سے تھا۔ زہد و

تقویٰ کا اندازہ ان کے کوفہ میں چند روزہ قیام اور اصحاب و انصار ان امام کے ساتھ ان کے معاملات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مسجد کوفہ میں امامت، طوعہ کے گھر قیام میں ساری رات عبادت و ریاضت ان کے زہد و خدا خوفی کے ثبوت ہیں۔ ایک موقعہ پر جب جناب ہانیؓ کے گھر پر ابن زیاد آ گیا تھا اور اسے دھوکے سے مارا جا سکتا تھا، جناب مسلمؑ نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا اور گھر آئے دشمن کو صرف شریعت کی پاسداری کے سبب جانے دیا۔ جناب مسلمؑ کی بہادری کے لئے اتنا اشارہ کافی ہے کہ خاندان نبوت میں اس وقت امام مظلومؑ کے پاس جناب عبداللہ ابن جعفر، جناب محمد حنفیہ، جناب مسلم اور جناب عباس جیسے دلیر موجود تھے۔ یہ سب حضرات حضرت علی کے ساتھ جنگ صفین، جنگِ نہروان اور جنگِ جمل میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا چکے تھے۔ لیکن حسینؑ تو تلوار اٹھانے کے لئے آمادہ ہی نہیں تھے۔ وہ تو یہ جنگ اپنے صبر و استقامت سے جیتنا چاہتے تھے۔ اسی لئے آپؑ نے جناب محمد حنفیہ اور جناب عبداللہ ابن جعفر کو مدینہ ہی میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور جناب مسلمؑ کو کوفہ سفیر بنا کر بھیج دیا۔ صرف حضرت عباسؑ کو اپنے ہمراہ رکھا اور وہ بھی علمدار بنا کر۔ آخر آخر تک انہیں جنگ کی اجازت نہ دی۔ ان باتوں سے سیدالشہداؑ کی اعلیٰ حکمت عملی، ارفع بصیرت اور امن پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ چاروں حضرات اگر روز عاشور حسینؑ کے ساتھ ہوتے اور انہیں جنگ کی اجازت ہوتی تو جنگ کربلا کا منظر ہی کچھ اور ہوتا مگر حسینؑ کی نظر میں تو اس معرکہ کو سر کرنے کا قرینہ بہت مختلف تھا۔

بنائے کربلا تو مدینہ میں ہی رکھی جا چکی تھی۔ کوفہ سے آنے والے خطوط اور مدینہ میں دارالامارہ میں مروان کی یزید کی طرف سے بیعت طلبی نے حسینؑ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ آپؑ نے موسم حج کے پیش نظر مکہ کا رخ کیا۔ یہاں سازش کی بو پا کر آپؑ نے فیصلہ کیا کہ جناب مسلمؑ کو کوفہ روانہ کیا جائے۔ سوچ بچار کے بعد حسینؑ نے

جناب مسلمؑ کو طلب کیا اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا اور کوفہ روانہ ہونے کا حکم یہ کہہ کر دیا: "میں تمھیں کوفہ بھیج رہا ہوں۔ حالات ایسے نظر آرہے ہیں کہ شاید ہم دونوں ہی شہادت کے درجہ پر فائز ہوں گے۔ کوفہ پہنچ کر لوگوں کو میری اطاعت کی دعوت دینا اور اگر لوگ میری بیعت پر مجتمع ہوں تو مجھے اطلاع کرنا۔" اس وصیت پر جناب مسلمؑ بہت دل ملول ہوئے۔ بھائی کا فراق بہت گراں تھا خاص کر حالات کے پیش نظر کہ تمام عمر ان سے کبھی الگ نہ ہوئے تھے۔ ۱۵ رمضان المبارک سن ساٹھ ہجری کو آپ بجھے دل سے اطاعت امام کے پیش نظر کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے جہاں شہادت گود پھیلائے ان کی منتظر تھی۔

کوفہ کے حالات اگر تفصیل سے بیان کیے جائیں تو اس کے لئے کتاب بھی ناکافی ہوگی اس لئے ان پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ کوفہ میں جناب مختارؓ، جناب ہانیؓ اور کئی دوسرے جاں نثاران علیؑ موجود تھے۔ سب نے بڑھ کر جناب مسلمؑ کا خیر مقدم کیا۔ جناب مسلمؑ نے سب سے پہلے جناب مختارؓ کے گھر قیام فرمایا۔ یہاں پر کافی دوست داران حسینؑ آتے رہے اور جناب مسلمؑ کے ہاتھوں پر حسینؑ کی بیعت کرتے رہے۔ پہلے دنوں میں ہی یہ تعداد اٹھارہ ہزار ہو گئی۔ کوفیوں کے والہانہ انداز کو دیکھتے ہوئے جناب مسلمؑ نے حضرت امام حسینؑ کو خط روانہ کر دیا کہ یہاں کے حالات سازگار ہیں، آپ جلد از جلد یہاں آکر لوگوں کی امامت اور ہدایت کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ جناب مسلمؑ کوفیوں کے باطن کا اندازہ نہ کر سکے۔ ادھر یزید کو جب اطلاع ملی کہ حسینؑ کا نمائندہ کوفہ پہنچ گیا ہے تو اس نے مشاورت کے بعد کوفہ کا گورنر ابن زیاد کو نامزد کر دیا جو اس وقت بصرہ کا حاکم تھا۔ حکم پاتے ہی ابن زیاد رات کی تاریکی میں نقاب ڈال کر خاموشی سے وارد کوفہ ہوا۔ راستے میں کئی لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ فرزند رسول حسین ابن علیؑ ہیں اس کا والہانہ استقبال کیا اور اپنے تعاون اور اطاعت کا عندیہ ظاہر کیا۔ ابن زیاد کوفہ پہنچتے ہی اپنی

سازشوں میں مصروف ہوگیا۔ طاقت، ظلم، دھمکی اور جاسوسی کے ایسے جال پھیلائے کہ کوفیوں کی بڑی تعداد اپنے وعدوں سے منحرف ہوگئی۔ جان اور مال کی محبت ایمان کی قوت پر غالب آگئی۔ مسلم کوفہ میں یکہ وتنہا رہ گئے۔ ایک روز ایک مسجد میں گوشہ نشین رہے اور دوسرے روز ایک فرشتہ صفت مومنہ طوعہ کے گھر میں پناہ لی۔ مسلم نے ہر ہر موقع پر ایمان اور تقویٰ کا دامن تھامے رکھا۔ ایک بار ابن زیاد کو دھوکہ سے ہلاک کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے دیا اور دوسری بار پناہ دینے والی اپنی محسنہ کے گھر کو جنگ وقتال سے بچانے کے پیش نظر باہر آکر اکیلے واکیلے فوج جفاکار سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر سفیر پاکباز بے پناہ شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ظالم کے دام میں گرفتار ہوگیا۔

جب جناب مسلم دارالامارہ کے دروازہ پر پہنچے تو شدید پیاسے تھے۔ پانی کا ایک ظرف دیکھ کر آپ نے فرمایا مجھے پانی پلادو۔ مگر ظالموں نے صاف منع کر دیا۔ بالآخر عمرو بن حریث نے اپنے غلام کے ذریعہ پانی پیش کیا۔ پیالہ جب منہ کے قریب آیا اور آپ نے چاہا کہ پانی پی لیں تو دہن مبارک زخمی ہونے کے سبب پیالہ خون سے بھر گیا۔ دوبارا بھی یہی ہوا۔ تیسری بار کوشش پر آپ کے دانت اس پیالے میں گر گئے۔ غرضیکہ پانی نہ پی سکے۔ اسی حالت میں جب قصر ابن زیاد میں داخل ہوئے تو آپ نے ابن زیاد کو سلام نہیں کیا۔ جب کسی نے کہا تم نے امیر کو سلام کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا جو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے اسے کیا سلام کرنا اور اگر قتل نہیں کرنا چاہتا تو بعد میں بہت مواقع ہیں۔ جب ابن زیاد نے قتل کا ارادہ ظاہر کردیا تو آپ نے وصیت کی خواہش کی۔ حاضرین میں آپ کی نظر عمر بن سعد پر پڑی۔ آپ نے اسے گوشہ میں بلا کر فرمایا کہ میں کوفہ میں سات سو درہم کا مقروض ہوگیا ہوں، یہ قرض تم میری زرہ اور تلوار بیچ کر ادا کردینا۔ دوسرے یہ کہ میری لاش لے کر دفن کردینا۔ تیسری اور اہم وصیت یہ ہے کہ کسی طرح حسینؑ کو کوفہ کی طرف آنے سے روک دو،

اس لئے کہ میں انہیں کوفہ آنے کا لکھ چکا ہوں۔

اس کے بعد ابن زیاد نے جناب مسلم سے جو گفتگو کی اسے ہم علامہ طالب جوہری کی کتاب ''حدیث کربلا'' سے من وعن پیش کرتے ہیں:

.....ابن زیاد جناب مسلم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ اے ابن عقیل! تم نے اس شہر کے لوگوں میں آ کر انتشار اور افتراق پھیلا دیا، حالاں کہ یہ لوگ تمھارے آنے سے پہلے متفق اور متحد تھے۔ لیکن تم نے گروہ بندی کر کے ایک دوسرے سے لڑا دیا۔ مسلم نے جواب میں کہا کہ میں ہرگز ان کاموں کے لئے نہیں آیا (جن کا تو مجھ پر الزام رکھ رہا ہے) اصل حقیقت یہ ہے کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ تمھارے باپ نے اخیار و ابرار کو قتل کر دیا اور ان کا خون بہا دیا اور شاہانِ ایران و روم کے طریقے اپنائے اور ان کے ساتھ بادشاہوں جیسا سلوک کیا تو ہم ان لوگوں کے پاس آئے کہ انھیں عدل کی تعلیم و تربیت دیں اور کتاب اللہ کے احکام کی طرف انھیں دعوت دیں۔ بھرے ہوئے دربار میں جناب مسلم کے یہ جملے ابن زیاد کے سر پر تلوار بن کر گرے اور انقلاب کا خطرہ محسوس ہوا۔ لہٰذا اس نے فوراً کردار کشی کے ذریعہ جملوں کے اثر کو کم کرنا چاہا اور کہا کہ تم کو ان باتوں سے کیا کام؟ تم جب مدینہ میں تھے اور شراب پیتے تھے تو اس وقت تم لوگوں میں عدالت اور حکم قرآن پر عمل کیوں نہیں کرتے تھے؟ اس جملہ سے ابن زیاد نے ایک طرف درباریوں میں مسلم کی شخصیت کا غلط تاثر پیش کرنا چاہا اور دوسری طرف اس انتہائی ذلیل تہمت کے ذریعہ جناب مسلم کو مشتعل کرنا چاہا لیکن آپ نے پورے سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ میں اور شراب؟ اللہ گواہ ہے اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تو جھوٹا ہے اور بے حقیقت بات کہہ رہا ہے۔ جیسا تو کہہ رہا ہے میں ویسا نہیں ہوں۔ شراب پینا تو تمھارا شیوہ ہے۔ شراب پینا تو اس شخص کا کام ہو سکتا ہے جو کتے کی طرح اپنی زبان سے مسلمانوں کا خون چاٹے اور انھیں قتل کر دے۔ اور ایسے کو ناحق قتل

کرے جس کا قتل اللہ نے حرام کیا ہے جو ظلم، دشمنی اور سوء ظن پر لوگوں کو قتل کرواتا ہو اور پھر اطمینان سے لہو ولعب میں بھی مشغول ہو۔ اور اپنے گناہوں اور مجرمانہ کرتوتوں کو ایک کھیل سمجھے کہ جیسے کچھ کیا ہی نہیں۔ ابن زیاد گھبرا گیا کہ مسلمؑ کے یہ جملے سننے والوں کے شعور میں راسخ نہ ہو جائیں۔ کہنے لگا کہ تم تباہی پھیلانے والے ہو۔ تمھارے نفس نے تمھیں اس چیز کا خواہشمند بنا دیا جس سے اللہ نے تمھیں روک دیا اس نے تمھیں اس کا اہل نہیں پایا۔ مسلمؑ نے فرمایا کہ اگر ہم اس چیز کے اہل نہیں ہیں تو پھر وہ کون ہے جو اس چیز کا اہل ہے؟ ابن زیاد نے کہا امیر یزید۔ جناب مسلمؑ نے جواب میں فرمایا کہ ہر حال میں اللہ ہی تعریف کا سزاوار ہے۔ ہم اپنے اور تمھارے درمیان اللہ کے فیصلے پر خوش ہیں۔ ابن زیاد جناب مسلمؑ کے صبر وسکون اور اطمینانِ قلب کو دیکھ کر تلملا گیا اور کہنے لگا کہ اگر میں تمھیں قتل نہ کروں تو اللہ مجھے قتل کر دے۔ اس طرح قتل کروں گا کہ اسلام میں کوئی ایسے قتل نہ ہوا ہو گا۔ جناب مسلمؑ نے فرمایا کہ ہاں تمھیں یہ کر سکتے ہو کہ جو بات اسلام میں نہ ہو وہ ایجاد کر دو۔ یقیناً تم اپنی کامیابی کے ان دنوں میں بری طرح قتل بھی کر سکتے ہو، ہاتھ پاؤں بھی کاٹ سکتے ہو، بدگمانی اور کینہ اندوزی بھی کر سکتے ہو اور یقیناً کسی شخص کے لئے بھی تم کوئی ظلم اٹھا نہیں رکھو گے۔ ابن زیاد جناب مسلمؑ کے انتہائی پرسکون، معتدل اور مستحکم لب ولہجہ سے اشتعال کی آخری سرحدوں کو چھونے لگا اور خود مسلمؑ اور امام حسینؑ اور جناب عقیلؑ کو ناسزا الفاظ سے یاد کرنے لگا۔ جناب مسلمؑ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی اختیار فرمائی۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ مسلمؑ کو چھت پر لے جاؤ۔ ان کا سر کاٹ لو اور جسم نیچے پھینک دو۔ مسلم بن عقیلؑ نے مہر سکوت کو توڑا اور عجیب جملہ ارشاد فرمایا کہ اگر مجھ میں اور تجھ میں رشتہ داری ہوتی تو تو مجھے قتل نہ کرتا۔ (یہ ابن زیاد کے حلال زادہ نہ ہونے پر طنز تھا) ابن زیاد پریشان ہو گیا، اس نے آواز دی کہ وہ شخص کہاں ہے جس کے سر پر مسلم بن عقیلؑ نے تلوار ماری تھی۔ بکر بن حمران

احمری کو بلایا گیا۔ ابن زیاد نے کہا مسلمؑ کو دارالامارہ کی چھت پر لے جاؤ اور اپنے سر کے زخم کے بدلے میں مسلم کی گردن کاٹ دو۔ بکر جناب مسلمؑ کا ہاتھ تھام کر چھت کی طرف چلا۔ آپ ہر زینہ پر تکبیر، استغفار اور درود پڑھتے ہوئے بلند ہوتے رہے اور یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ بارالہا! ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان فیصلہ فرما جنھوں نے ہمیں دھوکہ دیا، ہم سے دروغ بیانی کی اور ہماری مدد سے ہاتھ اٹھالیا۔ جناب مسلمؑ دارالامارہ کی چھت پر پہنچے۔ آپ کی گردن کاٹ کر پہلے سر کو نیچے پھینکا گیا پھر جسم مبارک کو بھی نیچے پھینک دیا گیا۔ (ارشاد مفید ج ۲ ص ۶۴، تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۸۲، تاریخ کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۱۴، نور بتول ص ۳۱)۔ ("حدیث کربلا" ۔علامہ طالب جوہری۔ ص ۱۱۱ سے ۱۱۳)۔

مادرِ باصفا، جنابِ امّ البنین سلام اللہ علیہا

قرآن مجید کے ۲۵ ویں سورہ الفرقان کی آیت ۵۴ میں ارشاد ربّ العزت ہے

:(ترجمہ: ''وہی تو وہ اللہ ہے جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان اور سسرال والا بنایا اور (اے رسولؐ) تمہارا پروردگار ہر چیز پر قادر ہے۔''

اسی طرح ۴۹ ویں سورہ الحجرات کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا:

ترجمہ: ''اے لوگو! ہم نے تو سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم ہی نے تمھارے قبیلہ اور برادریاں بنائیں تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک تم سب میں عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔ بے شک اللہ بڑا واقف کار اور خبر والا ہے۔''

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا اپنے انساب کو پہچانو تا کہ صلہ رحمی یعنی نیکی کرسکو اقرباء نسبی کے ساتھ۔ ایک اور حدیث میں اپنے نسب کو صلہ رحم کے لئے ستر پشت تک شمار فرمایا۔

مندرجہ بالا آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں خاندان، سسرال، نسب اور قبیلہ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ تا کہ لوگ نہ صرف ایک دوسرے کو شناخت کریں بلکہ صلہ رحم یا نیکی کر کے عزت دار اور پرہیزگار بننے کی کوشش کریں۔ شادی چونکہ نسل کو آگے بڑھانے اور ایک خاندان کی بنیاد قائم کرنے کا ادارہ ہے اس لئے اس میں طرفین کو انتہائی احتیاط اور چھان بین کے بعد اعلیٰ خاندان کے افراد کا انتخاب کرنا چاہیے۔

سب جانتے ہیں کہ جناب ذکریاؑ کی دعا اور تمنا سے جناب حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے۔

(سورہ مریم ابتدائی ۱۴ آیتیں) اور حضرت فاطمہ بنت اسد کی دعا اور تمنا سے حضرت علیؑ متولد ہوئے (مناقب شہر آشوب)۔ اسی طرح حضرت علیؑ کی دعا اور تمنا سے حضرت عباس علمدارؑ پیدا ہوئے۔

حضرت علیؑ حادثۂ کربلا سے آگاہ تھے۔ دل میں تمنا بیدار ہوئی کہ کاش میری کوئی اولاد ایسی ہوتی جو حسینؑ کے اس مشکل وقت میں کام آتی۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے بھائی حضرت عقیل ابن ابی طالب سے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ آپ عرب کی کسی ایسی عورت کو تلاش کیجئے جو بہادروں کی نسل سے ہو تاکہ میں اس سے عقد کروں اور اس کے بطن سے ایسا بہادر لڑکا پیدا ہو جو رزمگاہ کربلا میں میرے فرزند حسینؑ کی کمال انہماک سے مدد کر سکے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ حضرت علیؑ تو خود تمام علوم بشمول علم الانساب پر کامل عبور رکھتے تھے۔ جنگ کے میدان میں آپؑ کی تلوار دشمن کی آئندہ نسلوں کو دیکھ کر چلتی تھی تو کسی کی سابقہ نسل پر نظر رکھنا کون سا مشکل کام تھا۔ لیکن حضرت عقیل سے اس خواہش کا اظہار بتاتا ہے کہ ان کا یہ فعل بزرگانِ خاندان کی اہمیت جتانے کے لئے تھا۔ اور آئندہ نسلوں کو یہ باور کرانے کے لئے تھا کہ رشتۂ ازدواج قائم کرتے وقت لوگ اپنے بڑوں کو فراموش نہ کریں۔

جناب عقیل ابنِ ابی طالبؑ جو ماہرِ انساب بھی تھے اور حضرت علیؑ سے تقریباً دس سال بڑے تھے، فرماتے ہیں: اے بھائی علیؑ آپ جناب ام البنینؑ سے عقد فرمایئے، اس لئے کہ اس کے آباؤ اجداد سے زیادہ شجاع اور بہادر کوئی نہیں۔ (بی بی کا نام شادی کے وقت فاطمۂ کلابیہ تھا۔ ام البنین آپ کو شادی کے بعد کہا گیا)۔

جناب عقیل نے حضرت علیؑ سے جناب ام البنینؑ کی کمال مدح وثناء کرنے کے بعد فرمایا: اگر آپ اجازت دیں تو میں رشتہ کے لئے جاؤں۔ حضرت علیؑ نے حضرت عقیلؑ کو

وکیل بنا کر کثیر مہر دے کر قبیلہ کلاب کی طرف روانہ فرمایا۔ حضرت عقیل جب والدِ جناب ام البنین حضرت حزام کے گھر پہنچے تو انہیں احترام سے صدرِ مجلس میں جگہ دی گئی۔ ابتدائی بات چیت کے بعد حضرت عقیل نے مدعا بیان کیا۔ جناب حزام نے پوچھا میری بیٹی کا رشتہ آپ کس کے لئے چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اپنے بھائی علیؑ ابن ابی طالب کے لئے۔ یہ سن کر جناب حزام بے حد خوش ہوئے اور گھر میں جا کر بیٹی سے کہا کہ عقیل بن ابی طالب آئے ہیں اور اپنے بھائی علی ابن ابی طالبؑ کے لئے تیرے خواستگار ہیں۔ بیٹی تیری کیا رائے ہے؟ جناب ام البنین نے جب یہ سنا تو بے حد خوش ہوئیں اور فرمایا بابا جان آپ کو اختیار ہے۔ میرے دل میں تو پہلے ہی یہ تمنا تھی کہ میرا شوہر بے مثل و بے نظیر، یکتا و بے ہمتا ہو۔ میں خوش نصیب ہوں کہ میری دلی مراد بر آنے کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔

جناب حزام نے حضرت عقیل سے کہا کہ حضرت علیؑ سے رشتہ قائم کرنا عین سعادت ہے۔ اس سلسلہ سے علیؑ کو نہیں ہمیں شرف و افتخار حاصل ہوگا۔ حضرت عقیل نے واپس آ کر بھائی کو خوش خبری سنائی۔ حضرت علیؑ نے خوشی کا اظہار فرمایا اور جناب ام البنین سے عقد فرمایا۔

جناب ام البنینؑ فرماتی ہیں کہ "میں ساری دنیا کی عورتوں پر اس بارے میں فخر کیا کرتی تھی کہ میں جناب فاطمہؑ کی کنیز اور تاجدار عالم کی زوجہ ہوں۔

علامہ قزوینی فرماتے ہیں:

جناب ام البنینؑ نے حضرت علیؑ کے گھر میں داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی کو بوسہ دیا اور داخل حجرہ ہو کر سب سے پہلے حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کو جو کہ بیمار تھے اٹھا کر بٹھایا اور دونوں کے گرد تین بار قربان ہوئیں۔ پھر منہ چومے، زلفیں سونگھیں اور رو کر عرض کی اے میرے آقا اور اے میرے آقازادو مجھے اپنی کنیزی میں قبول کرو میں تم پر نثار میں تمہاری

خدمت کے لئے آئی ہوں۔ تمہارے کپڑے دھوؤں گی اور دل جان سے تمہاری خدمت کروں گی۔

جناب ام البنینؑ کے اس طرز عمل سے حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ روح جناب فاطمہ زہراؑ بھی مسرور ہوگئی ہوگی، اس لئے کہ ان کی دلی تمنا بھی یہی تھی کہ میرے بعد علیؑ جو عورت بھی لائیں وہ میرے بچوں کی نگہداشت کرنے والی بھی ہو۔

بی بی نے جیسا کہا ویسا کر دکھایا۔ شاید یہ نام "فاطمہ" کا اثر تھا۔ تاریخ میں جناب فاطمہ زہراؑ کے پہلے اور بعد میں جو عورتیں گزری ہیں وہ غیر معمولی شخصیت کی حامل تھیں اور جناب ام البنینؑ کا ان خواتین میں منفرد مقام ہے۔ جناب فاطمہ بنت اسد کی بہو ہونا، جناب علی مرتضیٰؑ کی رفیقۂ حیات قرار پانا غیر فانی اعزاز ہے۔ جس کی بہت سی زنانِ عرب کو تمنا تھی۔ ان کو خصوصی شرف یہ حاصل تھا کہ خود مولائے متقیان طلبگار ہوئے۔ حضرت عقیل واسطہ بنے اور ایسے گھر میں آئیں جہاں جناب فاطمہ زہراؑ کی ثانوی حیثیت پائی۔ سب سے بڑا اور اعزاز یہ تھا کہ جوانان جنت کے سردار اور ثانیِ زہراؑ کی ماں کہلائیں۔ دونوں فرزند درجہ عظمیٰ امامت پر فائز اور گوشوارہ عرش تھے اور جناب ام البنینؑ ان کی ماں تھیں۔ ان حضرات کا قاعدہ یہ تھا کہ پرورش کرنے والی عورت اور (کھلائی) پر کھانے میں سبقت نہ کرتے تھے چہ جائیکہ باپ کی رفیقِ زندگی اور وہ خاتون جس کا انتخاب بڑے گہرے مقاصد کے تحت ہوا ہو یعنی جس کی تزویج ایک نسل کا منبع سمجھ کر ہوئی۔

جناب امیر المومنینؑ نے جناب عقیل سے جو بہادر خاندان کی خاتون سے رشتہ کرنے کا ارادہ فرمایا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جری خانوادے کے بچے جری ہوتے ہیں۔ اجداد کی فضائل وخصوصیات بچوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ:

"بچوں میں ماموں کی عادتیں بھی منتقل ہوتی ہیں"

جناب ام البنین کے اجداد میں ایسے بہادر تھے جنہیں شجاعت و بہادری کی وجہ سے "ملاعب الاسنہ" (کھیل میں نیزہ چھین لینے والے) کا لقب ملا۔ یہ لقب حسان نے جناب ام البنین کے نانا کو اس وقت دیا تھا جب وہ یک و تنہا دشمنوں میں گھر گئے تھے اور دشمن کا نیزہ چھین لیا تھا۔ بی بی کے رشتہ داروں میں عامر بن طفیل بھی ہیں جو بے حد بہادر و دلیر تسلیم کئے جاتے تھے۔ قیصر روم کے لئے مشہور ہے کہ جب کوئی عرب اس کے دربار میں جاتا تو وہ سوال کرتا کہ کیا عامر سے تمہارا کوئی رشتہ ہے اگر وہ عرب اقرار کرتا تو قیصر اسے انعام و اکرام سے نوازتا ورنہ کوئی توجہ نہ کرتا۔

اس طرح خاندان جناب ام البنین میں طفیل کو بھی خاصی شہرت رہی۔ آپ کی شجاعت و دلاوری زبان زد خاص و عام رہی۔

جناب ام البنین کے چار فرزند تھے: عباس، عبداللہ، جعفر اور عثمان۔ آپ حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کے کافی عرصہ بعد تک حیات رہیں لیکن دوسری شادی نہیں کی۔ اسی طرح جناب اسماء بنتِ عمیس، لیلیٰ اور نہشلیہ نے بھی بعد شہادتِ حضرت علیؑ عقد نہیں کئے۔ جب جناب امامہؓ سے کسی نے عقد کی خواہش کی تو آپ نے حضرت امیر المومنینؑ کی حدیث نقل کردی۔

"پیغمبرؐ اور اوصیاءؑ کی ازواج اپنے شوہروں کی وفات کے بعد شادیاں نہ کریں۔"

جناب امّ البنین نے واقعۂ کربلا کے وقت اور اس کے بعد بھی محبت و خدمت اہلبیت کا حق ادا کردیا۔ جب حسینی قافلہ عراق کے لئے روانہ ہوگیا تو اس کے بعد خاندان بنی ہاشم کے جو افراد خصوصاً بچے جیسے جناب صغراؑ اور بزرگ جیسے ام المومنین جناب امّ سلمہؓ وغیرہ ان سب کی دیکھ بھال اور خبر گیری کے فرائض آپ نے بھرپور طرح سے انجام دیئے۔ کربلا والوں کا لٹا ہوا قافلہ جب مدینہ واپس آیا تو ان کی مزاج

پرسی اور تسلی و تشفی فرمائی۔

کربلا کے لئے حضرت عباس علمدارؑ جیسے دلیر اور جری کی تربیت جناب ام البنینؑ کا خاص کارنامہ ہے۔ گہوارے سے روانگیٔ کربلا تک آپ نے جناب عباسؑ کو اس طرح تیار کیا کہ عباس نام ہی وفا کی علامت و مصداق بن گیا۔

بلا شبہ یہ سب کچھ ان کے اعلیٰ نسبی خون کی تاثیر اور خاندانِ عصمت و طہارت کے ماحول کا فیض تھا کہ جناب ام البنینؑ اسلام کی مثالی خواتین میں ایک نمایاں نام بن گئیں۔

۴ شعبان ۔ رویتِ قمر بنی ہاشمؑ

حضرت عباسؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ کی تاریخ ولادت ۴ شعبان المعظم ۲۶ ہجری ہے۔ ایک زمانی اتفاق یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کی تاریخ پیدائش ۳ شعبان ہے۔ شاید یہ بھی قدرت کا ایک اشارہ ہے کہ دونوں بھائیوں میں ایسی محبت و یگانگت تھی کہ تاریخ پیدائش میں بھی بس ایک قدم کا فرق نظر آتا ہے۔ بقول شاعر:

یہ امر حقیقت ہو عقیدت پہ نہ محمول　　اک نور کے دو ٹکڑے ہیں اک شاخ کے دو پھول
اک سطح کے دو ناپ ہیں اک عرض ہے اک طول　　چھوٹا ہے اگر ایک تو یہ حدِ ادب ہے
اس پر بھی کوئی ان کو نہ مانے تو غضب ہے

(یہ کلام جناب مولوی سید حسن امداد صاحب نے حضورؐ اور حضرت علیؑ کی نسبت سے ارشاد فرمایا ہے)

حضرت عباسؑ کے دادا حضرت ابو طالبؑ کو سب جانتے ہیں۔ کتنی دل سوزی اور مشقت سے آپ نے شمع رسالت کی حفاظت فرمائی کہ اللہ نے قرآن مجید میں ان کی سرپرستی اور پناہ کو اپنی سرپرستی اور پناہ قرار دیا (اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَاٰوٰی ۔ ہم نے آپ کو یتیم پایا پھر پناہ دی۔ سورۃ الضحیٰ ۔ آیت ۶)۔ اسی طرح حضرت عباسؑ کی دادی جناب فاطمہ بنت اسدؑ کا ولادت علی ابن ابی طالب کے لئے خانۂ خدا میں معجزاتی طور پر تشریف لے جانا اور یہاں مولائے کائنات کی ولادت اتنی بڑی فضیلت ہے جس کی مثال ناممکن ہے۔

حضرت عباسؑ کے والد محترم حضرت علی مرتضیٰ کی مدح و توصیف بیان کرنے کے لئے دنیا کے وسائل ناکافی ہیں۔ وہ مومنین کے امیر، متقین کے امام و پیشوا، مشرکین کے قاتل، منافقین کی آنکھ کا کانٹا، عبادت گزاروں کی زینت، شہر علم کا دروازہ، منبر سلونی کے خطیب، شارح قرآن، فاتح خیبر و خندق، غریبوں کے مددگار، قسیم جنت و جہنم، ساقی کوثر اور سب سے بڑھ کر حضورؐ کے پیغام توحید و رسالت پر لبیک کہنے والے ہیں۔ ان کی دوررس نگاہوں نے حضرت عباسؑ جیسے باوفا اور بہادر شخص کی ولادت کے لئے جناب ام البنینؑ جیسی خاتون کا انتخاب کیا۔

حضرت عباسؑ کی والدۂ ماجدہ جناب فاطمہ کلابیہ ام البنینؑ عرب کے اعلیٰ اور شجاع خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے تربیت اولاد کا حق ادا کر دیا اور کربلا میں حضرت عباسؑ کے ساتھ اپنے تین دوسرے بیٹے جناب سیدہؑ کے لال کے ساتھ دین حق پر قربان کر دیے۔ جناب ام البنینؑ سے شادی کے پہلے سال ہی حضرت عباسؑ کی ولادت ہوئی۔ سفید کپڑے میں لپٹا ہوا یہ چاند کا ٹکڑا جناب امیرؑ کی آغوش میں دیا گیا۔ جس طرح حضرت امام حسینؑ کو گود میں لیتے ہی جناب رسالت مآبؐ نے اپنی زبان مبارک سے بچے کی آنکھوں، کانوں اور دہن کو مس فرمایا تھا ویسے ہی جناب امیرؑ نے اپنی زبان پاک سے اس معصوم کے چشم و دہن کو معطر فرمایا۔ ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہی۔ نام اپنے چچا عباس ابن عبدالمطلب کے نام پر عباسؑ رکھا۔ جس کے معنی شیر اور شیر دل جوان ہوتے ہیں۔ آٹھویں دن حسنین علیہم السلام کی طرح عقیقہ پر گوسفند ذبح کرایا۔

ان کی تربیت بچپن سے ہی اس انداز سے کی گئی تھی کہ ایک دن حضرت حسینؑ میں دین حق کے لئے جان دینی ہے۔ کیا کہنے اس آغوش تعلیم و تربیت کے جو حضرت عباسؑ کو

نصیب ہوئی۔

حضرت عباسؑ کے بچپن کے چند واقعات جو کتابوں میں ملتے ہیں:

۱۔ جب جناب عباسؑ چھوٹے سے تھے تو جناب امیرؑ نے ایک بار ان سے کہا کہ کہو ایک! جناب عباسؑ نے کہا ایک۔ آپؑ نے ان سے کہا اب کہو دو! جناب عباسؑ نے فرمایا بابا! جس زبان سے میں نے ایک کہا ہے اس سے دو کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

۲۔ ایک روز مسجد میں حضرت امام حسینؑ کو پیاس محسوس ہوئی۔ حضرت عباسؑ تیزی سے باہر گئے اور ایک برتن میں جو پانی سے لبالب بھرا تھا لائے اور بھائی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

۳۔ ایک دن جناب عباسؑ کو ایک خوشہ انگور ملا تو دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ لوگوں کے پوچھنے پر بتایا یہ میں اپنے بھائی حسینؑ کو دینا چاہتا ہوں۔

۴۔ ایک روز جناب امیرؑ حضرت عباسؑ کو گود میں لئے بیٹھے تھے۔ گریہ کرتے جاتے تھے اور بچے کے بازوؤں کو چومتے جاتے تھے۔ جناب ام البنینؑ کے پوچھنے پر فرمایا کہ "اس کے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی ان کے کاٹے جانے کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جناب ام البنینؑ نے گریہ وزاری کے بعد صبر سے کام لیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کا بیٹا رسولؐ کے نواسے کے ساتھ دین مبین کی سرفرازی کے لئے جان قربان کرے گا۔

جناب ام البنینؑ عالمہ اور شاعرہ تھیں۔ حضرت علیؑ تو شہر علم کا دروازہ تھے ہی، جناب حسنینؑ اور جناب زینبؑ و ام کلثومؑ بھی عالمہ و فاضلہ تھیں۔ حضرت عباسؑ ان سب کی گودوں میں پروان چڑھے اور کسب علم میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کربلا میں دشمنوں سے خطاب اور رجز میں انہوں نے اپنے علم و کمال کے جوہر دکھادیے۔

جنابِ عباسؑ کی حیاتِ مبارک پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اللہ نے جناب امام حسینؑ کے لئے ویسا ہی بنایا تھا جیسا حضرت علیؑ کو جنابِ رسالت مآبؐ کے لئے۔ جس طرح حضرت علیؑ پیدائش سے آخرِ عمر تک حضور کی نصرت فرماتے رہے، ویسے ہی حضرت عباسؑ، نواسۂ رسولؐ کے لئے تمام عمر فرشِ راہ رہے۔ دوسری طرف حسینؑ کے بچوں پر ایسے فدا تھے جیسے حضرت ابو طالبؑ حضور اکرمؐ کے لئے۔

بھائی کے بچوں سے چاہت کی مثال — یا ابو طالبؑ ہیں یا عباسؑ ہیں

(عقیل عباس جعفری)

غلام کیا کہیں عباسؑ کو کہ نام ان کا — لغت نے مانگ لیا معنیِ وفا کے لیے

(شادانؔ دہلوی)

تاریخ کا سب سے کم سن سپاہی

حضرت علی اصغرؑ

قرآن مجید میں ہر شے کا بیان ہے اور کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو (انعام آیت ۵۹) کتنے ہی مواقع ایسے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بچوں کی مدد سے سچائی کی سربلندی کا کام لیا۔ جب جناب مریم علیہا السلام کی پاکدامنی پر لوگوں نے انگلیاں اٹھائیں تو آپ نے گہوارے کی طرف اشارہ کیا جناب عیسیٰؑ جو نومولود تھے اللہ کے حکم سے گویا ہوئے اپنا تعارف کرایا اور ماں کی عصمت، طہارت، عزت اور شرف و وقار کو ظاہر کیا۔ اسی طرح جب جناب یوسفؑ کی پاکدامنی پر حرف آیا تو ان کی عصمت کی گواہی ایک شیر خوار کے ذریعہ گہوارے سے دلوائی (حوالہ تفسیر القرآن مولانا سید ظفر حسن امروہوی ج ۲ ص ۲۳۳)۔

مباہلے میں بھی تین بزرگوں کے ساتھ دو معصوم بچوں کی گواہی نظر آتی ہے جنہوں نے نجران کے نصاریٰ کو صرف اپنے چہروں سے اپنی عظمتوں کا قائل کر دیا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام جو آغوش نبوتؐ کے پروردہ تھے عصمت و امامت سے تربیت یافتہ تھے کربلا میں بچوں کو اہلبیت رسالت کی ولایت، امامت اور صداقت کو ثابت کرانے کے لئے لے گئے۔ مباہلہ میں اگر جناب سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا گئیں تو کربلا میں بنتِ زہرا جناب زینبؑ۔ اسی طرح مباہلے میں اگر حسنؑ اور حسینؑ تھے تو کربلا میں جناب علی اصغر اور جناب سکینہؑ جنہوں نے دین حق اور امامت اہلبیت کی صداقت و عظمت کو نہ صرف نمایاں کیا بلکہ امام مظلوم پر ملک گیری یا خواہشِ تخت و تاج کا الزام نہیں لگنے دیا۔

ایسا لگتا ہے ۲۸ رجب کو اپنی روانگی سے پہلے امام مظلومؑ کو جناب علی اصغرؑ کے دنیا میں آنے کا اعتقاد تھا کیونکہ اس ننھے مجاہد کا نام بھی سرفہرستِ اسلام میں شامل تھا۔

کب دیکھا کا گرچہ فقط ہے دم پہ دم — لیکن امامؑ کیسے بڑھائیں ابھی قدم
لشکر میں پہنچے ہم بجز کے بین رقم — مقصود سب ہیں ایک مجاہد مگر ہے کم

گر یہ نہیں تو جنگ کا حاصل نہیں کوئی
پھر حملہ کا مدِ مقابل نہیں کوئی

(مولانا سید حسن امداد مجتہد الاعاظم ممتاز الافاضل غازی پوری)

جناب علی اصغرؑ کی ولادت پر تاریخ کا موقف واضح ہے اس ضمن میں منقول معصوم ہے اور نہ کسی ذمہ دار راوی کی روایت۔ البتہ اشتہار ہے کی ولادت ۱۰ رجب ۶۰ ہجری ہے۔ مدینہ سے امام کی روانگی کے حالات میں جھولے کا اور آپ کی جناب صغریٰ سے رخصت کا ذکر ضرور پایا جاتا ہے۔

ایک خوشگوار اتفاق یہ ہے کہ حضرت علیؑ کی تاریخ ولادت ۱۳ رجب ہے۔ یقیناً اس سال امام حسینؑ کے گھر میں باپ کی ولادت کی نسبت سے خوشی کا اہتمام ہو رہا ہوگا ہونے پر سہاگہ اسی تاریخ میں باپ کا ننھا سا بچہ بھی دنیا میں تشریف لے آیا۔

جناب شہربانو (والدہ امامِ چہارم حضرت علی ابن الحسین زین العابدینؑ) اور جناب امِ لیلیٰ (والدہ شہزادہ علی اکبرؑ) کے بعد امام عالی مقام نے جناب رباب بنت امرء القیس بن عدی کلبیہ سے عقد فرمایا جن سے جناب سکینہؑ اور جناب علی اصغرؑ تولد ہوئے۔ جناب ربابؑ میں خاندانی عزت اور ذاتی شرافت کے علاوہ اطاعت اور وفا کا وہ خاص جوہر تھا جس کی وجہ سے عقل گستر امامؑ کی نظر میں انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا کہ امام کے

حوالے سے جو اشعار بیان کئے جاتے ہیں ان کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

"وہ قسم ہے کہ میں اس گھر کو دوست رکھتا ہوں جس میں سکینہؑ اور ربابؑ کا قیام ہو۔ میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں اور اپنے مال کے بڑے حصّہ کو صرف کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس بارے میں کسی شکوہ و نارضامندی کی پروا نہیں کرتا"۔

نیک اور سعید اولادیں کسی بھی موقعہ پر ماں باپ کو فراموش نہیں کرتیں۔ چنانچہ امام مظلومؑ نے اپنے بیٹوں کے نام باپ کے نام پر علیؑ اور بیٹیوں کے نام ماں کے نام پر فاطمہؑ رکھے۔ چنانچہ اس شہزادے کا نام علیؑ رکھا۔ جو سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے علی اصغرؑ مشہور ہوا۔ آپ کا ایک اور نام عبداللہ بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے سبب امام مظلومؑ کو ابا عبداللہ بھی کہا جاتا ہے اور اسی نام سے آپ کی زیارت پڑھی جاتی ہے۔

واقعہ کربلا تاریخی انسانیت کا وہ باب ہے جس کی نظیر نہ اس کے وقوع پزیر ہونے سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد آج تک اور نہ قیامت تک ملنے کا احتمال ہے۔ واقعہ کربلا میں تمام شہداء میں جناب علی اصغرؑ کی شہادت بھی بے نظیر ہے۔

زبدۃ العلماء سید آغا مہدی صاحب لکھنوی اعلی اللہ مقامہٗ نے تاریخی حوالوں سے ایک لاجواب کتاب "تاریخِ شہزادہ علی اصغرؑ" تصنیف فرمائی ہے جس میں انہوں نے ایک باب قائم کیا ہے "علی اصغرؑ کمالات انبیاء کا نمونہ تھے"۔ اس باب میں انہوں نے شہزادہ کا تقابل انبیائے کرام و اولیا اللہ اور ائمہ سے کیا ہے۔ اس میں سے چند نکات پیشِ خدمت ہیں:

آدمؑ فراق بہشت میں روئے اور مدتوں اپنی پہلی جائے قیام کو یاد کر کے روتے رہے مگر علی اصغرؑ ماں کی گود سے جو بچہ کے لئے فردوس سے کم نہیں ہوتی، جدا ہو کر نہیں روئے۔

نوحؑ نے نو سو پچاس برس کی تبلیغ میں صرف چند نفوس کے دلوں میں گھر کیا۔ ان کے

ساتھ بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے۔ لیکن اصغر نے چند منٹ کی خاموش تبلیغ سے یزید کی ٹڈی دل فوج میں تلاطم برپا کر دیا۔ ان کی بے زبانی اور مظلومیت کا اثر کائنات سے ابد تک نہ جائیگا۔

ابراہیمؑ نمرود کی آگ میں ڈالے گئے۔ امتحان کی منزل پر پہنچنے میں وہ لطف ملا کہ فرماتے تھے، مجھے کبھی ایسا عیش نصیب نہیں ہوا۔ علی اصغرؑ کربلا کے تپتے ہوئے دشت اور لو دھوپ میں تیر کھا کر مسکرائے مگر زبان ہوتی تو کہتے کہ جام شہادت میں شیر مادر سے زیادہ شیرینی ہے۔ وہ خلیل یہ ذبیح، وہ نبی یہ شہید، وہ مہاجر یہ غریب، وہ سقیم یہ قتیل۔

اسماعیلؑ کا بھی کم سنی میں پیاس سے امتحان ہوا مگر تشنگی حدِ آب زمزم تک پہنچ کر ختم ہو گئی۔ علی اصغرؑ کا امتحان ایسا سخت تھا کہ حوض کوثر پر پہنچے بغیر پیاس نہ بجھی۔ اسماعیلؑ کے ماحول میں کہیں کنواں نہ تھا تو قدرت نے زمین سے چشمہ ظاہر کر دیا۔ یہاں دریائے فرات سامنے لہریں مار رہا ہے۔ مگر دشمنوں نے پہرے بٹھا دیے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی پامردی یہ تھی کہ ذبح پر تیار ہو گئے۔ خدا نے نیت دیکھ کر ذبیح کا لقب دیا لیکن ان کا عمل زبانی وعدہ رہا۔ اصغرؑ نے ذبح ہو کر دکھا دیا۔

موسیٰؑ نے فرعون کے شر سے نجات پائی مگر جناب علی اصغرؑ یزید کے دست تعدی سے نہ بچے۔ ان پر دودھ پلانے والی عورت کا دودھ حرام کر دیا گیا اسی وقت تک جب تک ماں کے پاس نہ پہنچے۔ آغوش مادر میں پہنچ کر امتحان ختم ہو گیا۔ علی اصغرؑ کی دودھ بڑھائی تیر سے ہوئی زندگی کی آخری گھڑیوں میں بھی لب تر نہ ہوئے۔

عیسیٰؑ کا نام عبداللہ تو علی اصغرؑ بھی عبداللہ۔ عیسیٰؑ جناب مریم کے بیٹے، علی اصغرؑ فاطمہ کے لال۔ وہ گہوارہ میں ماں کی پاکدامنی کے گواہ بنے، انہوں نے گہوارے سے نکل کر ناموسِ اسلام کی حفاظت کی۔

حضرت علی اصغرؑ کے جہاد کی تصویر کچھ نماز سے ملتی ہوئی ہے۔ باپ کا استغاثہ=

اذان۔ عورتوں کا نالہ و فریاد = اقامت۔ ہاتھوں پر بلند ہونا = قیام۔ اتمام حجت میں چشم و ابرو کا اشارہ = قرأت۔ تیر سے مخاطب ہونا = رکوع۔ قبر میں سونا = سجدہ۔ (تاریخ شہزادہ علی اصغرؑ۔ علامہ سید آغا مہدی لکھنوی)۔

حشر تک سوچ عمل انسانی صرف اصغرؑ کا خوں بہا کیا ہے

جناب علی اصغرؑ واقعہ کربلا کا ایک ایسا کردار ہیں جس کے اسرار پر جتنا غور کیا جائے اتنے ہی نکات غیب سے ذہن میں اجاگر ہوتے ہیں۔ میرے خیال سے شہدائے کربلا میں سید الشہداءؑ کے بعد جتنا کچھ جناب علی اصغرؑ پر لکھا اور کہا گیا ہے اتنا کسی اور پر نہیں۔ خاص طور پر شعرائے اکرام نے شہزادے کو اتنی جہتوں سے نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے جس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

اس سلسلے میں کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے چاہا کریں سوال، پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا، تھرا کے رہ گئے چادر پسر کے چہرے سے سرکار کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغرؑ تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں مرزا دبیرؔ

جناب سید علی مہدی ایڈووکیٹ بلرام پوری نے جناب علی اصغرؑ کے حوالے سے ایک مرثیہ میں بیان کیا ہے کہ اگر شہزادے کو زبان مل جاتی تو ان کا رجز کیا ہوتا۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

تو جواں ہونے پہ میں بھی اکبرؑ ہوتا اور جواں ہوتا تو عباس دلاورؑ ہوتا
اور کچھ بڑھتا تو پھر حمزہؑ و جعفرؑ ہوتا بڑھتے بڑھتے میں یونہی فاتح خیبرؑ ہوتا
فضل خالق سے وہی زور مجھے مل جاتا
وہ کوفہ وہ خیبر کی طرح مل جاتا

-----☆☆☆-----

نظر لگ جائے نہ اصغرؑ کو مولا — تمھارا لاڈلا ہنستا بہت ہے
(نیر سرسوی)

اصغرؑ کہ جس نے پاؤں نہ رکھا زمین پر — اسلام کو سکھا دیا چلنا زمین پر
(شکیل اترولوی)

اصغرؑ شہید ہو گئے اسلام کے لیے — اتنی سی جان اتنے بڑے کام کے لیے
(اعجاز رحمانی)

گردن پہ تیر، لب پہ ہنسی، باپ پر نظر — اصغرؑ پدر سے طالب داد تبرد تھا
(ہوش لکھنوی)

ظلم سا ظلم ہے اصغرؑ کو نہ پانی دینا — بچہ چھ ماہ کا پیتا بھی تو کتنا پانی
(نامعلوم)

بے شیر کا مزار نہیں حدِ صبر ہے — تلوار سے گھڑی ہے سپاہی کی قبر ہے
(صبا اکبر آبادی)

ایک تبسم بن گیا باطل کا سامانِ شکست — تیر قاتل پر زبانِ بے زباں لکھی گئی
(شاداں دہلوی)

بانو کے گلبدن نے ہنسی میں اڑا دیا — بے کار کر دیا ہنر کاہل کا فن تمام
(علی محمد رضوی سپچے)

ہم ہنسی میں غمِ دوراں کو اڑا دیتے ہیں — ظلم کو ضربِ تبسم سے مٹا دیتے ہیں
(عاصی کرنالی)

مسکرا کر تو نے جو کھایا تھا اے روشن ضمیر — آج تک پیوست ہے انسان کے دل میں وہ تیر
(نامعلوم)

رلوا آج ہاتھوں سے سر پیٹ کے اصغرؑ کو رباب
کل کو تنی سے بندھے ہاتھ تمہارے ہوں گے
(وصی فیض آبادی)

مانگا بے شیرؑ نے جو تشنہ کی زبانی پانی
شرم سے آب رواں ہو گیا پانی پانی
(سالک لکھنوی)

اس طرف سے حرملہ کا تیر آتا ہے ادھر
اب ادھر سے مسکراہٹ کے جوابی تیر چل
(منور نقوی شارب)

بابا میرے گلے کو ذرا تھام لیجئے
میں حرملہ کے تیر سے کرتا ہوں گفتگو
(نامعلوم)

نظر آتی نہیں لیکن رگ روپے میں اترتی ہے
عجب تلوار ہے جو اصغرؑ بے شیر رکھتے ہیں
(عقیل عباس جعفری)

حرملہ اپنے ہاتھ سے خود پہ
دائمی ایک عذاب اتار لیا
ایک بچے پہ وار کر کے لعیں
کون سا تیر تو نے مار لیا
(نامعلوم)

تری یہ شانِ تکلم نہ کہا کوئی بھی لفظ
پھر بھی ہونٹوں سے معانی کے سمندر نکلے
(کوثر نقوی)

یوں تو نہ حق پرست نہ سچا ہے حرملہ
جنگ و جدل کے فن میں بھی کچا ہے حرملہ
اس سمت اک ہنسی تو ادھر تھرتھراتے ہاتھ
اصغرؑ کے سامنے ابھی بچہ ہے حرملہ
(مصدق لاکھانی)

لعیں گھبرایا جو اصغرؑ کو دیکھا
کماں لب کو نظر کو تیر کرتے
(عدنان نکس)

میں نے دیکھے ہیں بچوں کے سوکھے گلے، مجھ کو روز جزا رب روز جزا
داہنے ہاتھ میں ایک شمشیر بائیں میں گردن حرملہ چاہیے
(عرفان صدیقی)

مجسّم صبر و رضا
جناب سکینہ سلام اللہ علیہا

جناب سکینہؑ واقعۂ کربلا کا ایک روشن کردار ہیں۔ سبھی جانتے ہیں ان کے باپ جوانانِ جنت کے سردار، جنہیں اشرف الانبیاءؐ کے لعابِ دہن کی گھٹی ملی اور جو شجیعِ عرب مولائے متقیان علی ابنِ ابی طالبؑ اور سیدۃ نساء العالمین جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے نورِ نظر ہیں تو والدۂ ماجدہ جناب ربابؑ ایک صالحہ، دیں دار، پرہیزگار، عبادت گزار، سلیقہ شعار اور رحم دل خاتون۔ ان کی حق پرستی وحق آگہی، فرماں برداری وجاں نثاری، ایثار و قربانی، صداقت ومحبت، ضبط وتحمل مثالی تھی۔

حضرت امام حسینؑ فرماتے تھے "اے جانِ پدر میں نے تجھے اپنے اللہ سے نمازِ شب کی دعاؤں میں مانگا ہے۔" امام مظلومؑ اپنی اس چہیتی بیٹی کو ذرا دیر کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ کا یہ قول بھی تاریخ میں محفوظ ہے کہ "جس گھر میں ربابؑ وسکینہؑ نہ ہوں وہ گھر مجھے پسند نہیں۔"

کتابوں میں ملتا ہے کہ جس طرح حضرت امام حسینؑ کی پہلی غذا پیغمبر اکرمؐ کا لعابِ دہن تھا اسی طرح جنابِ سکینہؑ کو امام عالی مقامؑ نے ولادت کے بعد اپنی زبان سے پہلی غذا فراہم کی۔ امام حسینؑ کو یہ بچی اتنی عزیز تھی کہ ولادت کے بعد سے شبِ عاشور تک اسے اپنے سینہ پر سلاتے رہے۔ جنابِ سکینہؑ کو باپ کے سینے کے علاوہ کہیں نیند ہی نہیں آتی تھی۔

جنابِ سکینہؑ گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھیں۔ جنابِ سیدِ سجادؑ، جنابِ علی اکبرؑ جیسے بھائی،

جناب فاطمہ کبریٰؑ اور جناب فاطمہ صغراؑ جیسی چاہنے والی بہنوں کے درمیان پلنے بڑھنے والی بچی کے لئے کتنے بڑے بڑے مصائب پیش آنے والے تھے۔ جس طرح جناب رسالت مآبؐ شہزادی فاطمہ زہراؑ سے اور جس طرح حضرت علیؑ اپنی بچی جناب زینب کبریٰؑ سے محبت فرماتے تھے اسی طرح امام مظلومؑ اپنی اس بچی سے انسیت رکھتے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ اور مولائے کائنات کی نظریں اپنی بیٹیوں پر پیش آنے والے مصائب سے آگاہ تھیں بالکل اسی طرح امامؑ حسینؑ کی نظریں بھی سکینہؑ کا مستقبل اور اس پر آ کر ٹوٹ پڑنے والے آلام سے آشنا تھیں، شاید یہ محبتیں اسی وجہ کی بنا پر ہوں۔

ان تمام بیٹیوں میں جناب سکینہؑ سب سے لاڈلی تھیں کیونکہ یہ سب سے کم سن تھیں۔ چار سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کوئی صاحب دل ہی اندازہ کر سکتا ہے کہ عصر عاشورہ رخصت آخر میں امام حسینؑ کے دل پر اس بچی سے جدا ہوتے ہوئے کیا گزری ہوگی اور اس معصومہؑ نے کس دل سے باپ کو رخصت کیا ہوگا۔

عام مشاہدہ ہے کہ جن لوگوں کا بچپن مشکلات میں گزرے ان میں حساسیت، ذمہ داری اور سمجھداری زیادہ ہوتی ہے وہ مسائل کا ادراک زیادہ بہتر کرتے ہیں۔ بیشتر بڑے لوگوں کا بچپن سختیوں میں گزرا ہے۔ شاید یہ اس لئے بھی ہے کہ سونا تپ کر ہی کندن بنتا ہے زندگی کے الجھے مسائل ہر طرف سے آزمائش ہوتے ہیں۔ ان امتحانات میں پورا اترنے والوں کو خدا اپنے انعامات سے نوازتا ہے اسی لئے جناب سکینہؑ کی پیاس اور صبر کا امتحان بے مثال بن گیا اور علم عباسؑ علم حق کے ساتھ ان کا تعلق ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ پانی نہ پا کر بھی بچوں کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔

جناب یوسف علیہ السلام کا واقعہ کسے یاد نہ ہوگا جب آپ کے بھائیوں نے انہیں کنویں میں ڈالا تو آپ اس کنویں میں اگ آنے والے ایک پودے میں اٹک گئے اور پانی

تک نہیں پہنچے۔ جان کا خوف، بھائیوں کے ظلم کا ڈر، سادہ عمر، وہ کنویں کا ڈراؤنا ماحول اور پھر آپ کی کم سنی۔ ایسے میں جب آپ نے تضرع کیا تو اللہ کو آپ کا یہ تضرع اتنا پسند آیا کہ اسی وقت فرشتے نے آکر انہیں نبوت کی نوید دی۔ اسی طرح وہ کمسنی میں جب آزمائش کی کسوٹی پر پورا اترے تو انعام کے مستحق قرار پائے۔

یہ بات ہمیں جناب سکینہؑ کے حالات زندگی دیکھنے سے بھی سمجھ میں آتی ہے۔ انتہائی کم وقت میں پلی ہوئی بچی جب ہوش سنبھالنے کی مرحلے میں اچھی طرح قدم بھی نہ رکھنے پائی تھی کہ بے پناہ مصائب کی چکی میں پس کر رہ گئی۔ یہی بات ہمیں جناب فاطمۃ الزہراؑ کی حیات طیبہ میں بھی نظر آتی ہے۔ آیئے ایک نظر دونوں بی بیوں کی زندگیوں کی مماثلت پر ڈالتے ہیں:

۱۔ جناب سیدہؑ ایک معصوم پیغمبر کی دعاؤں کا ثمر تھیں اور جناب سکینہؑ ایک امام معصوم کی دعاؤں کا نتیجہ۔

۲۔ جناب سیدہؑ کو جناب خدیجہؑ جیسی عالی نسب والدہ ملیں اور جناب سکینہؑ کو جناب رباب جیسی صالحہ، دیندار، پرہیزگار، عبادت و اطاعت گزار ماں ملیں۔

۳۔ جناب زہراؑ بچپن میں شفیق ماں کے سائے سے محروم ہو گئیں تو جناب سکینہؑ بھی کم سنی میں بے پناہ چاہنے والے باپ کے سایۂ عاطفت سے ظالمانہ حالات میں جدا کر دی گئیں۔

۴۔ جناب فاطمہؑ نے اپنے پدر بزرگوارؐ کے کام کو آگے بڑھایا یعنی جیسے جناب رسالت مآبؐ مردوں کے لئے نمونۂ عمل تھے جناب فاطمہؑ خواتین کے لئے عمل کا نمونہ بن گئیں۔ جناب سکینہؑ نے بابا کے مشن کو ماں، پھوپھی، بہنوں کے ساتھ شانہ بشانہ آگے بڑھایا اور باپ کے کردار کو دنیا کے سامنے پیش کیا جسے دشمن چھپانا چاہتا تھا۔ وہ اس موقع پر صبر، شکر اور استقامت کی روشن مثال بن گئیں۔

۵۔ جناب سیدہؑ کو دربار میں جا کر خطبہ دینا پڑا اور جناب سکینہؑ نے بھی درباروں کا سامنا کیا اور اپنے صبر سے دل دہلا دیئے۔

۶۔ جناب فاطمہؑ نے پہلوئے شکستہ کا دکھ جھیلا اور جناب سکینہؑ نے بھی طمانچے کھائے اور کانوں کے دُر چھینے جانے کی اذیت کا سامنا کیا۔

۷۔ جناب فاطمہؑ نے گھر کا دروازہ جلتے دیکھا اور جناب سکینہؑ نے بھی خیموں میں آگ لگتے دیکھی۔

۸۔ جناب سیدہؑ کی آخری عمر روتے روتے گزری اور جناب سکینہؑ نے بھی تادمِ مرگ گریہ فرمایا۔ دونوں بابا کو روتے روتے کچھ ہی دنوں بعد اپنے بابا سے جا ملیں۔

۹۔ جناب فاطمہؑ کا جنازہ رات کی تاریکی میں خاموشی سے اٹھا اور صرف چند افراد نے مشایعت جنازہ کی اور جناب سکینہؑ کی میت تو سوائے جناب سید سجادؑ کے اٹھانے والا کوئی اور نہ تھا۔

۱۰۔ شہزادی فاطمہؑ کی تجہیز، تکفین، تلقین اور تدفین امام وقت نے کی اور چھوٹی شہزادی کی تدفین بھی امام وقت نے کی۔ ان کو تو کفن بھی نہ ملا اور اپنے پیرہن میں ہی دفن کردی گئیں۔

بے گور و کفن باپ تھا بے پردہ تھی بیٹی
دادی کی طرح باپ کے ماتم میں قضا کی

۱۱۔ شہزادی کونینؑ نے قرآن اور احادیث سے ثابت کر دیا کہ ان کے مخالفین مسئلہ خلافت تو کیا ایک معمولی سے وراثت کے مقدمے کا منصفانہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تو جناب سکینہؑ نے دنیا کو بتا دیا کہ اتنی بڑی ملوکیت کے دعوے دار طاقت کے زور پر عورتوں، بیماروں اور بچوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بناتے ہیں اور حق و صداقت و دین داری سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ اسلام تو دور کی بات ہے یہ لوگ دائرۂ انسانیت سے بھی خارج ہیں۔

۱۲۔ سیدہ کونین تین سال (دو سال سے پانچ سال تک کی عمر میں) شعب ابو طالبؑ میں محصور و مقید رہیں جب کہ شہزادی سکینہؑ عصر عاشور سے تادم مرگ زندان شام میں مقید رہیں اور جان دے کر ہی قید خانۂ یزید ملعون اور قفس زیست سے رہائی پائی۔

جنابِ فضہ سلامُ اللہ علیہا

اس کنیزی پہ شاہیاں قرباں

جنابِ فضہ جناب فاطمہ زہراؑ کی کنیز تھیں۔ آپ کا اصل نام میمونہ تھا۔ اہلِ بیت اطہارؑ کے پاس آپ کے آنے کی مختلف روایات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حبشہ (یا ہندوستان) کی شہزادی تھیں۔ اور انہیں اعزازی طور پر حضورِ اکرمؐ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ انہیں مولائے کائنات خرید کر لائے تھے۔ تیسری روایت جناب محمد احسان بی اے کی کتاب ''دُرِّ یتیم'' (جو بعد میں ''ننھے حضورؐ'' کے نام سے چھاپی گئی) میں ملتا ہے کہ جناب خدیجہؓ کو ایک کنیز کی ضرورت تھی۔ وہ اس جگہ گئیں جہاں غلام اور کنیزیں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں کنیز یا غلام کو بڑے بڑے پنجروں میں بند کر کے رکھا جاتا تھا۔ جناب خدیجہؓ نے ایک کنیز خرید لی۔ جب اسے لے کر چلیں تو دیکھا کہ کنیز بہت بے چین ہے۔ روتی جاتی ہے اور پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتی جاتی ہے۔ جناب خدیجہؓ نے پوچھا! ''کیا بات ہے، تمھارے اضطراب کا کیا سبب ہے۔'' کنیز نے عرض کی کہ ''اے ملیکۃ العرب، میری ایک بچی ہے جو علیحدہ پنجرے میں رکھی گئی ہے۔ اب میں اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہوں، وہ جانے کہاں جائے۔ علم نہیں آج کے بعد اسے دیکھ سکوں گی یا نہیں۔'' جناب خدیجہؓ جو بے حد مال دار ہونے کے باوجود بے حد نرم دل تھیں۔ کنیز کے اس بیان سے تڑپ گئیں۔ فوراً قیمت ادا کر کے اس بچی کو لے لیا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ جناب سیدہؑ کے پاس رہ جانے والی ماں بیٹیوں میں

سے کون فضہ ہے۔

حضرت علیؑ کے گھر میں جناب فضہؓ سے کنیزوں والا کوئی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جناب امیرؑ نے ان کا عقد ثعلبیہ نامی ایک شخص سے کر دیا۔ مگر نکاح کے صرف چند سال بعد ہی ثعلبیہ چل بسے۔ ان کے انتقال کے چند دن بعد ہی ایک شخص سلیک نے پیغام نکاح دیا، جسے جناب فضہؓ نے فقہی بنیاد پر یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ابھی وہ عدت میں ہیں اور اس دوران دوسرا عقد نہیں ہو سکتا۔ (کتاب الانساب، ابن حجر عسقلانی، بحوالہ "جناب فضہؓ" مولف راحت حسین ناصری)۔

جناب فضہ کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ واقعۂ کربلا کی عینی شاہد ہیں۔ کربلا کی ایک ایک تکلیف میں یہ اہلِ بیتِ اطہار کے ساتھ رہیں۔ بلکہ اسیرانِ حرم کے ساتھ آپ بھی اسیر رہیں اور سفر اور زندان کی ہر تکلیف برداشت کی۔ اہلِ حرم کے ساتھ دربارِ یزید میں بھی موجود رہیں اور یزید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اس ظلم شدید پر شرمندہ کیا۔ خدمت گاروں کے ایسے کارناموں کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ روایتوں میں ہے کہ شہدائے کربلا میں ان کے بیٹے بھی شامل ہیں۔ جو واقعہ کربلا کے وقت کوفہ میں حضرت امام حسینؑ کی حمایت کے الزام پر قیدی بنا لیے گئے تھے۔ بعد میں انہیں بھی شہید کر دیا گیا۔ (واللہ اعلم)

ذکر اس بی بی کا شامل ہو گیا تفسیر میں
کیا در زہراؑ پہ فضہؓ نے کھلائیں روٹیاں

سورۂ دہر (یا سورۂ انسان یا سورۂ ھل اتیٰ) کی آیت ۷ تا ۱۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوگی۔ اور اس (اللہ) کی محبت میں محتاج اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور

کہتے ہیں کہ ہم تو بس خالص اللہ کے لئے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلے کے خواستگار ہیں اور نہ شکر گزاری کے۔ ہم کو تو اپنے پروردگار سے اس دن کا ڈر ہے جس میں منہ بن جائیں گے اور چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوں گی۔ تو خدا انہیں اس دن کی تکلیف سے بچالے گا اور ان کو تازگی اور خوش دلی عطا فرمائے گا۔"

تفاسیر میں ان آیات کی شان نزول میں یہ روایت درج ہے:

"ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حسن اور حسین علیہما السلام بیمار ہوئے تو حضرت رسولؐ کچھ لوگوں کے ساتھ عیادت کو تشریف لائے اور جناب امیرؑ سے فرمایا کہ بہتر ہوتا اگر تم اپنے لڑکوں کی صحت کے واسطے نذر کرتے۔ یہ سنتے ہی جناب امیرؑ، جناب فاطمہ زہراؑ اور جناب فضہؓ نے تین تین روزوں کی نذر کی۔ غرض جب دونوں صاحبزادے اچھے ہوئے اور نذر کے پورا کرنے کا وقت آیا تو ان تینوں کے ساتھ حضرات حسنینؑ نے بھی روزے رکھ لیے۔ گھر میں کچھ نہیں تھا۔ جناب امیرؑ نے شمعون یہودی سے تین صاع جو قرض لئے۔ جناب سیدہؑ نے ایک صاع جو پیسا اور پانچ روٹیاں پکائیں۔ شام کو کھانا ہی چاہتے تھے کہ ایک سائل نے آواز دی "السلام علیک یا اہل بیت محمدؐ، میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا دو، خدا تمہیں جنت کے خوان عطا کرے گا"۔ یہ سنتے ہی سب نے اپنے اپنے آگے کی روٹیاں دے دیں اور فقط پانی پی کر سو رہے اور دوسرے دن پھر روزہ رکھا۔ حسب دستور جناب سیدہؑ نے پھر پانچ روٹیاں پکائیں اور کھانے بیٹھے کہ ایک یتیم نے آواز دی اور سب نے اپنی اپنی روٹی اس کو دے دی اور صرف پانی سے افطار کیا۔ تیسرے روز پھر روزہ افطار کرنے بیٹھے تھے کہ ایک قیدی نے آواز دی اور تیسرے دن پھر سب بزرگواروں نے اپنی اپنی روٹی دے دی۔ چوتھے دن صبح کو جناب امیرؑ نے صاحبزادوں کے ہاتھ پکڑے اور حضرت رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب رسول اللہ کی نظر پڑی کہ بھوک کی شدت

سے کانپ رہے ہیں تو فرمایا میں تم لوگوں کو کس قدر تکلیف کی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر خود اٹھے اور ان کے ساتھ جناب سیدہؑ کے مکان میں آئے تو فاطمہ زہراؑ کو محراب عبادت میں دیکھا کہ ان کی پیٹھ پیٹ سے مل گئی ہے اور آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر آنحضرت کو بہت رنج ہوا۔ یکایک حضرت جبریلؑ نازل ہوئے اور کہا لیجیے یا رسول اللہ آپ کو مبارک ہو کہ خدا نے یہ سورہ آپؐ کے اہل بیتؑ کی شان میں نازل فرمایا ہے اور سورۂ دہر کی تلاوت فرمائی (تفسیر کشاف جلد سوم، ص ۲۳۹ سطر ۲۹ مطبوعہ مصر) اور اس روایت کو بیضاوی وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔"

آپ کے ہاتھوں کو فضہ ہے فرشتوں کا سلام
ایک مدت پنجتنؑ کے گھر پکائیں روٹیاں

کہنے کو یہ اک کنیز تھیں لیکن اہل بیتؑ کے گھر میں انہیں وہ مقام ملا جو شاہیوں کے سروں کو جھکا دے۔ یہاں وہ اتنی تکریم کے ساتھ رہیں جیسے کوئی اسی گھر کا فرد ہے۔ گھر کا کھانا پکانا ہو یا کپڑے دھونے ہوں یا صفائی ستھرائی کا کام ہو، شہزادی فاطمہؑ تمام کاموں میں برابر کی شریک رہتیں۔ جناب رسالت مآبؐ اور جناب امیرؑ نے انہیں چند دعائیں تعلیم کر دی تھیں، جنہیں وہ دہراتی رہتی تھیں۔ ایک روز جناب سیدہ نے ان سے پوچھا: "آٹا گوندھیے گا یا روٹی پکائیے گا؟" جناب فضہ نے فرمایا: "آٹا گوندھوں گی اور لکڑیاں لاؤں گی۔" آپ نے رسولؐ اکرم کی تعلیم کردہ دعا پڑھی۔ اسی اثناء میں ایک عربی مسافر آگیا۔ اس کی مدد سے لکڑیاں جناب سیدہؑ کے گھر آگئیں۔

حیاتِ فاطمۃ الزہراؑ کے دوران جناب فضہؑ ان کے ساتھ رہیں اور خدمات انجام دیتی رہیں۔ شہزادی فاطمہؑ کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ اور بچے بھی ان سے حسن سلوک روا رکھتے۔ وہ بھی سب سے والہانہ محبت اور شفقت فرماتیں۔ جب جناب سیدہؑ دنیا سے

رخصت ہوگئیں تو جناب فضہؑ جناب زینبؑ و امِ کلثومؑ کی خدمت فرماتی رہیں۔

ایک دن آپ کسی کام سے جناب سیدہؑ کے گھر سے روانہ ہوئیں۔ راستے میں صحابیِ رسولؐ ابنِ مسعودؓ مل گئے۔ انہوں نے آپ کو سلام کیا۔ جناب فضہؑ نے جواب سلام دیا۔ ابن مسعودؓ نے جناب فضہؑ کو مخاطب کیا "فضہؑ آپ نے اتنی بڑی کمائی کی ہے کہ جنت حاصل کر لی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔" یہ سن کر جناب فضہؑ نے کہا "کیسی جنت؟" اس پر جناب ابن مسعودؓ گویا ہوئے: "فضہؑ کیسی باتیں کر رہی ہیں، کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جنت کیا ہے؟ وہی جنت جس میں باغات ہوں گے، نہریں ہوں گی۔" یہ سن کر جناب فضہؑ نے کہا "اے ابن مسعودؓ آپ کو حضرت رسول اللہ کی خدمت میں عرصہ گزر گیا مگر معرفت حاصل نہ کر سکے۔" اس پر جناب ابن مسعودؓ نے کہا "فضہؑ میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی کہ آپ مجھے بے معرفت فرما رہی ہیں؟ جناب فضہؑ نے کہا: "اے ابن مسعود! جسے آپ جنت کہتے ہیں، میں اسے حاصل کر کے کیا کروں گی، اس لیے کہ میری جنت تو یہ در ہے جس میں میری شہزادی اور میرے شہزادے رہتے ہیں، جن کی میں خدمت گزار ہوں۔" (کنز العمال)۔

ابوالقاسم قشیری کہتے ہیں، حج کے سفر میں، میں کارواں سے چھوٹ گیا۔ بیاباں کے بیچ میں مجھے ایک کنیز نظر آئی۔ میں نے پوچھا: تم کون ہو؟

کہا: "**فَقُل سلام ...... فسوف تعلمون**" (**الانعام ۵۴ ...... الاعراف ۱۲۳**)

(پہلے سلام کرو، عنقریب معلوم ہو جائے گا)۔

میں نے انہیں سلام کیا اور کہا: "یہاں آپ کا کیا کام ہے؟"

کہا: "**وَمَن یھد اللّٰہ فَمَا لَهُ من مُضِلٍّ**" (**الزمر، آیت ۳۷**)

(جس کی ہدایت اللہ کرتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا)۔

میں نے پوچھا: ''تم جن ہو یا انسان؟''

کہا: ''یبنی آدمؑ خذوازینتکم ''(اعراف، آیت ۳۱)

(یا بنی آدم کے بیٹو! زینت اختیار کرو)۔

میں نے کہا: ''کہاں سے آرہی ہیں؟''

کہا: ''ینا دون من مکان بعید'' (حٰمٓ السجدہ، آیت ۴۴).

(انہیں دور سے بلایا گیا ہے)

میں نے کہا: ''کہاں جائیں گی؟''

کہا: ''وَ للہِ علی الناس حج البیت''(آل عمران ۹۷)

(لوگوں پر اللہ کے لیے حج کرنا واجب ہے)

میں نے کہا: ''کھانا چاہیے؟''

کہا: ''وما جعلنھم جسداً لا یا کلون الطعام'' (الانبیاء آیت ۸)

(ہم نے انہیں ایسے جسم نہیں دیے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں)۔

میں نے انہیں کھانا دے دیا اور کہا: ''جلد کرو!''

کہا: ''لا یکلف اللہ نفساً الّا وسعھا'' (البقرہ، آیت ۲۸۶)

(اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔

میں نے کہا: ''میرے پیچھے بیٹھ جایئے''

کہا: ''لَوْ کَانَ فِیھِمَآ الھۃ الّا اللہُ لَفَسَدَ تا'' (الانبیآء، آیت ۲۲)

(اگر آسمانوں اور زمین پر اللہ کے سوا دو اللہ ہوتے، زمین و آسمان دونوں تباہ ہو جاتے)۔

میں سواری سے اتر گیا اور انہیں سوار کیا۔

کہا: '......سُبحٰن الذی سخرلنا ھذا......'' (الزخرف ۱۳)

(پاک ہے وہ رب جس نے اس (سواری) کو ہمارے تابع کیا)۔

جب قافلہ کے نزدیک پہنچ گئے تو میں نے کہا: ''قافلہ میں آپ کا کوئی ہے؟''

کہا: ''یٰداوُدُ انّا جعلنٰک خلیفۃً فی الارض ...... و ما محمدٌ الّا رسولاً، یا یحییٰ خذالکتاب یا موسیٰ انی انا اللّٰہ'' (صٓ آیت ۲۶ ..... و دیگر)

(اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، محمد صرف اللہ کے رسول ہیں، اے یحییٰ کتاب کو لے لیجیے، اے موسیٰ میں اللہ ہوں)۔

میں سمجھ گیا کہ قافلہ میں چار آدمی داؤدؑ، محمدؐ، یحییٰؑ اور موسیٰؑ ہیں۔ پھر دیکھا کہ چاروں ہماری طرف آرہے ہیں۔

میں نے کہا: ''انہیں آپ سے کیا نسبت ہے؟''

کہا: '' المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا ......'' (الکہف، آیت ۴۶)

(مال و اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں)۔

میں سمجھ گیا کہ یہ چاروں ان کے بیٹے ہیں۔

جوان ہمارے پاس پہنچے تو کہا: ''یا ابت استاجرہ انّ خیر من استاجرت القوی الامین''. (القصص، آیت ۲۶)۔

(بابا! انہیں اجیر بنا لیجیے کہ یہ طاقت ور اور امین ہیں)۔

جوانوں نے مجھے کچھ چیزیں دیں۔

عورت نے کہا: '' واللہ یضاعف لمن یشاء'' (البقرہ، آیت ۲۶۱)

جس کے لیے اللہ چاہتا ہے اضافہ کر دیتا ہے۔

انہوں نے مجھے کچھ اور چیزیں دیں۔

میں نے ان سے معلوم کیا کہ یہ کون ہیں؟

کہا: یہ جناب فاطمہ زہرا کی کنیز فضہ ہیں۔ بیس سال سے قرآن کی زبان میں گفتگو کرتی ہیں۔

خادمہ زہراؑ کی فضہؓ ہیں وہ عالی مرتبت
گفتگو تا عمر جو کرتی رہی قرآن سے

جناب فضہؓ نے علمی مقام پر فائز ہونے، حفظ قرآن اور اخلاقی فضائل پر احاطہ کے علاوہ اہلِ بیت کی مستورات، خصوصاً جناب زینب کبریٰؑ کی مانند بہت سے مصائب برداشت کیے۔

جناب فضہؓ کی شخصیت وعظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وفات جناب فاطمہ زہراؑ کے سانحہ میں جو معدود چند مرد وعورت حاضر تھیں، ان میں سے ایک فضہؓ ہیں۔ شرکاء میں عورتوں میں جناب فضہ، امّ سلمیٰ، ام ایمن اور مردوں میں امام حسنؑ وامام حسینؑ، عبداللہ بن عباسؓ، سلمان فارسیؓ، عمار یاسرؓ، مقدادؓ، حذیفہؓ اور ابوذرؓ تھے۔

جب حضرت امیر المومنینؑ جناب فاطمہؑ کو کفن دے چکے تو بند کفن باندھنے سے پہلے آواز دی: ''زینبؑ، امّ کلثومؑ، فضہؓ، حسنؑ وحسینؑ آؤ اپنی ماں کا آخری دیدار کرلو، اس خطاب کی رو سے حضرت فضہ، جناب فاطمہ زہرؑا کے بچوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ یہ بہت اہم بات ہے۔

ماخذ:۔ ''مثالی خواتین'' از ڈاکٹر احمد بہشتی۔ مترجم: جناب نثار احمد زین پوری۔

جناب ہندؓ

تاریخ میں ملتا ہے کہ ایک خاتون جن کا نام ہند بنت عبداللہ بنت بن عامر تھا، اپنے والد کے قتل کے بعد حضرت امیر المومنینؑ کے گھر آ گئیں اور وہاں ایک عرصے تک خدمت کرنے کے لئے امامؑ کے گھر رہیں۔ وہ بہت خوب صورت اور نیک سیرت تھیں۔ جب امیر المومنینؑ کا قتل ہوا تو وہ امام حسنؑ کے گھر منتقل ہو گئیں۔ وہاں بھی امامؑ کی خدمت کی۔ جب معاویہ نے ان کے بارے میں سنا تو بلا کر اپنے بیٹے یزید کے ساتھ ان کی شادی کر دی۔ پھر یزید کے گھر رہیں۔ اور وہ ہمیشہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں باخبر رہیں اور کوشش کرتیں رہیں کہ مدینہ سے آنے والوں سے ان کے بارے میں خبریں سنیں۔

جب امام حسینؑ کی شہادت ہوئی تو جناب ہندؓ اس خبر سے لاعلم تھیں۔ عاشور کے سانحہ کے بعد جب امام حسینؑ کا خاندان شام پہنچا تو کچھ عورتیں جناب ہندؓ کے پاس قیدیوں کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے آئیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ کون ہیں۔ بس اتنا اندازہ تھا کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کے لوگ ہیں اور بہت مظلوم و مقہور دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ کسی طرح ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور ان کی مدد کی جائے۔

جناب ہندؓ اٹھیں اور فاخرہ لباس زیب تن کیا اور اپنا حجاب پہنا اور خادمہ کو حکم دیا ان کے ساتھ رہے اور کرسی لیکر چلے تا کہ وہ مٹی پر نہ بیٹھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ محل سے نکلتے وقت اچانک یزید سامنے آ گیا۔ جناب ہندؓ نے قیدیوں سے ملاقات کے لئے

اجازت مانگی۔ یزید کا رنگ فق ہو گیا اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اس لئے کہ وہ آنے والی ملاقات کے ردعمل سے خائف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی طویل عرصے تک اہل بیتؑ کے گھر میں خادمہ رہی ہے۔ وہ اہلِ بیت اطہارؑ کے اوصاف حمیدہ، اعلیٰ اخلاق، انسانیت اور ہمدردی کی عینی شاہد ہے جو کہ یزید میں ناپید تھا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتی ہے۔

یزید تذبذب میں پڑ گیا کہ ملاقات کے لئے رضامندی ظاہر کروں یا انکار کردوں؟ لیکن ایسا لگتا ہے کہ جناب ہندؓ کی شخصیت بہت قوی تھی۔ اپنی خواہش یزید پر عائد کردی۔ اس نے انھیں بس اتنی اجازت دی کہ مغرب کے بعد ملاقات کریں اس لئے کہ اس وقت زمین پر تاریکی ہو جاتی ہے۔

شام کے وقت جناب ہندؓ خادمہ کے ساتھ جو روشنی کی قندیلیں راستے کے لئے اٹھائے ہوئے تھی گئیں۔ جب جناب سیدہ زینبؑ نے دیکھا تو حضرت امّ کلثومؑ سے آہستگی سے گفتگو کی اے بہن تم جانتی ہو اس کو جو ہمارے قریب ہے۔ انھوں نے کہا بخدا نہیں۔ حضرت زینبؑ نے فرمایا کہ یہ ہماری خادمہ ہند بنت عبداللہ ہے۔ امّ کلثوم خاموش ہو گئیں اور سر کو جھکا لیا۔ پس حضرت زینبؑ نے بھی اپنا سر جھکا لیا۔ جناب ہندؓ آئیں اور کرسی پر سیدہ زینبؑ کے قریب بیٹھیں۔ قافلہ کی لیڈر ہونے کی حیثیت سے۔ اور کہا کہ اے بہن میں دیکھتی ہوں کہ تمہارا سر جھکا ہوا ہے۔ حضرت زینبؑ خاموش رہیں، اور جواب نہیں دیا۔ پھر جناب ہندؓ نے کہا کہ اے بہن تم کس ملک کی ہو، حضرت زینبؑ نے کہا کہ مدینہ کی۔ جب جناب ہندؓ نے مدینہ کے بارے میں سنا، کرسی سے اتریں اور کہا کہ وہاں کے باشندوں پر بہترین سلام ہو۔ پھر حضرت زینبؑ نے اپنا سر موڑا اور فرمایا کہ میں دیکھتی ہوں کہ تم کرسی سے اتر گئی ہو۔ جناب ہندؓ نے احترام و عزت سے کہا کہ مدینہ میں کہاں گھر ہے۔ بی بی نے فرمایا حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے گھر۔ جناب ہند حضرت علیؑ کے نام پر

چونکیں تو جناب زینبؑ نے کہا کہ کیا تم علیؑ ابن ابی طالبؑ کے گھر کو جانتی ہو؟ جناب ہندؓ نے گریہ کیا اور کہا کہ میں ان کے پاس خادمہ تھی۔ سیدہ زینبؑ نے کہا کہ کچھ اور پوچھنا ہے؟ جناب ہندؓ نے کہا میں آپ سے حسینؑ ان کے بھائیوں لڑکوں اور باقی اولاد علیؑ کے بارے میں پوچھتی ہوں۔ سیدہ زینبؑ اور ان کی بہن ام کلثومؑ کے بارے میں اور باقی فاطمہ زہراؑ کی پردہ نشین خواتین کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ یہ سن کر جناب زینبؑ نے شدید گریہ کیا اور کہا، اے ہند جہاں تک تعلق ہے تمہارے سوال کا علیؑ ابن ابی طالبؑ کے گھر کے بارے میں تو اس گھر کے افراد میں صرف ہم رہ گئے ہیں۔ باقی سب گھر والے مر چکے ہیں۔ اور حسینؑ کے بارے میں پوچھتی ہو تو ان کا سر یزید کے پاس ہے۔ اور جو تم نے عباسؑ و بقیہ اولاد علیؑ کے بارے میں پوچھا تو سنو ہم ان کو کربلا کی سرزمین پر دھوپ میں بلا سروں کے چھوڑ کر آئے ہیں۔ اور تم نے زین العابدینؑ کے بارے میں پوچھا تو وہ تمہارے سامنے ہیں۔ بہت بیمار اور کمزور ہیں۔ اس وجہ سے وہ کھڑے نہیں ہو پاتے اور گر جاتے ہیں۔ تم نے زینبؑ کے بارے میں پوچھا تو میں زینب بنت علیؑ ہوں، یہ ام کلثوم ہے اور وہ سب بقیہ فاطمہ زہراؑ کی پردہ نشین ہیں۔ پھر جب جناب ہندؓ نے سیدہ زینبؑ کا کلام سنا تو گریہ کیا، چلائیں، واااماہ، وسیداہ۔ واحسیناہ۔ کاش کہ آج کے دن سے پہلے میں اندھی ہوتی اور نہ دیکھتی فاطمہ زہراؑ کی بیٹیوں کو اس حالت میں۔ پھر اپنے سر پر پتھر مارا۔ خون ان کے چہرے اور حجاب پر آ گیا اور ان پر غشی طاری ہو گئی۔ غشی سے جب افاقہ ہوا تو سیدہ زینبؑ اس کے پاس آئیں اور فرمایا اب اٹھو اور اپنے گھر جاؤ اس لئے کہ مجھے تمہارے شوہر یزید کی طرف سے خوف ہے۔ جناب ہندؓ نے کہا کہ اللہ کی قسم میں نہیں جاؤں گی حتیٰ کہ سیدی و مولائی ابی عبداللہ پر نوحہ نہ کروں اور یہاں تک کہ ساری ہاشمی خواتین میرے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوں۔

جناب ہندؓ تھیں اور اپنے سر پر حسرت کی اور پھر یزید کی طرف روانہ ہوئی وہ اس وقت عام لوگوں کے درمیان میں تھا اور کہا کہ تیرے حکم پر حسینؑ کے سر کو نیزے پر گھر کے دروازے کے سامنے لٹکایا گیا ہے۔ فاطمہ بنت رسول اللہؐ کے بیٹے کا سر میرے صحن کے دروازے پر لٹکایا ہے۔ اس وقت یزید یاقوت وجواہر نفیسہ کا تاج اپنے سر پر لگائے بیٹھا تھا اور جب اس نے زوجہ کو اس حالت میں دیکھا تو چھلانگ لگا کر اس کے پاس آیا اور اپنی عبا سے اسے ڈھانپ دیا۔ پھر کہا ہاں اور گریہ کر و رسول اللہ کی دختر کے فرزند پر اور قریش کے غم پر۔ لعنت ہو ابن زیاد پر، جلد لعنت ہو، اللہ اسے قتل کرے۔ پھر جب جناب ہندؓ نے دیکھا کہ یزید نے اسے ڈھانپ لیا ہے تو کہا کہ افسوس تجھ پر۔ تو نے مجھے غیرت کی وجہ سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جناب فاطمہ کی بیٹیوں کی بے پردگی پر تجھے غیرت کیوں نہیں آئی؟ ان کی بے حرمتی کیوں کی؟ ان کے چہروں کو نامحرموں کو کیوں دکھایا اور ان کو قید خانے میں کیوں رکھا؟ اللہ کی قسم تمہارے گھر میں داخل نہ ہوں گی جب تک کہ وہ سب میرے ساتھ داخل نہ ہوں۔ پھر یزید نے حکم دیا ان سب کو اس کے گھر میں ٹھہرایا جائے اور وہ خصوصی کمروں میں رہیں۔ جب اہل بیت کی خواتین گھر میں داخل ہوئیں تو یزید کے گھر میں آل ابی سفیان کی عورتوں نے ان کا استقبال کیا اور وہ تیزی سے رسول اللہ کی بیٹیوں کے ہاتھوں اور پیروں کے بوسے لینے لگیں۔ پھر کہا ہم حسینؑ پر گریہ کریں گے اور ان سے لوٹے ہوئے زیورات جو ان کے پاس ہیں واپس کریں گے اور تین دن تک عزاوماتم کریں گے۔

ماخذ: ''زینب الکبریٰ۔ من المھد الی اللحد'' بقلم سماحۃ العلامۃ الخطیب السید محمد کاظم القزوینی (قدس سرہ)

عم رسولؐ حضرت حمزہؓ

آں حضرتؐ کے اجداد کے بارے میں یہ بات طے ہے کہ وہ سب مومن تھے۔ ان کے ایمان پر بہت بحثیں ہو چکی ہیں، کتابیں لکھی جا چکی ہیں، خاص کر حضرت ابو طالبؑ کے ایمان لانے کے بارے میں۔ ہمارا (مکتب امامیہ کا) نقطۂ نظر اس سلسلے میں واضح اور غیر مبہم ہے۔ حضور اکرمؐ کے اعلانِ نبوت سے پہلے اجدادِ نبیؐ مشرک یا کافر نہیں تھے۔ ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے کچھ حضرات اعلانیہ اپنے ایمان کا اعلان کر چکے تھے جب کہ دیگر اس اعلان کو غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لیے اب یہ بحث فضول ہے۔

جنابِ عبدالمطلبؑ کا معمول تھا کہ وہ روزانہ بیت اللہ کے سامنے ایک مسند بچھا کر بیٹھے رہتے تھے۔ اس مسند پر کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مکہ کا ایک بااثر شخص بدی بن نوفل تھا۔ ایک دن اس نے یہ چاہا کہ وہ ان کے پاس اس مسند پر بیٹھ جائے۔ مگر جناب عبدالمطلبؑ نے اسے اس مسند پر بیٹھنے سے روک دیا اور کہا کہ یہ جگہ صاحبان اکرام کے لیے ہے۔ بدی نے اسے اپنی توہین سمجھا اور کہا کہ میرے پاس تم سے زیادہ دولت ہے، اولاد ہے۔ جناب عبدالمطلبؑ نے فرمایا کہ اس کا تعلق نہ دولت سے ہے نہ کثرت اولاد سے، بس یہ اللہ کا کرم ہے۔ اس پر بدی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ آپ نے اسی وقت طواف فرمایا اور منت مانی کہ اگر اللہ مجھے دس یا اس سے زیادہ فرزند عطا کرے گا تو میں ایک اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ نے چار عقد کیے۔ آپ نے محسوس کیا کہ وہ نور جوان کی پیشانی پر ہے، ابھی تک اسی طرح سے چمک رہا ہے۔ پھر آپ نے

ایک شادی ہالہ بنتِ وہب سے کی جن سے حضرت حمزہؓ پیدا ہوئے مگر وہ نور منتقل نہ ہوا۔ یہ نور تو جناب عبداللہ کی پیشانی میں آنا تھا۔

جناب حمزہؓ نے جو کہ پیدائشی مومن تھے، اعلانِ رسالت کے چھٹے سال اپنے ایمان کا اعلان کیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسا انہوں نے ابو جہل سے تکرار کے دوران کیا۔ آنحضرتؐ کے چچاؤں میں حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی۔ وہ آپؐ سے دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کھیلے تھے یعنی بچپن کے ساتھی تھے۔ انہوں نے مصلحتاً اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا محبوب مشغلہ سپہ گری اور شکار کرنا تھا۔ معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے۔ شکار پر جانے سے پہلے خانۂ کعبہ کا طواف کر لیتے تھے۔ تمام دن شکار کھیلنے میں مصروف رہتے شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے طواف فرماتے۔ قریش کے روسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے۔ آپ مردانِ قریش میں معزز اور ممتاز شمار ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے۔ اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

جناب حمزہؓ کے اسلام لانے اور ان سے مشرف باایمان ہونے کے خاص اسباب وہی محبت واخلاص کے جذبات تھے۔ ابن ہشام اصل حقیقت کا انکشاف اس طرح کیا ہے۔

ایک بار ابو جہل نے جناب رسالت مآب کو کوہِ صفا پر دیکھا۔ اس بدبخت نے آپؐ کو ایذا دی اور سخت کلامی کی۔ بعض کہتے ہیں کہ دشمنِ اسلام کی عیب جوئی کی۔ جناب رسالت مآبؐ نے اس کی بدزبانی کا کوئی جواب نہ دیا اور بالکل خاموش رہے۔ (حضور اکرمؐ کی سیرت کا یہ پہلو کتنا حسین ہے کہ صبر و ضبط سے ہر طرح کے فتنہ و فساد سے گریز کیا)۔ عبداللہ بن جدعان کی لونڈی جس کا گھر قریب تھا یہ تمام واقعات دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد

ابو جہل واپس آیا اور حسب معمول رؤسائے قریش کے ساتھ کعبہ میں بیٹھ گیا۔

اس واقعے کے بعد ایک دن عبداللہ بن جدعان کی لونڈی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اتفاقاً حضرت حمزہؓ کے گھر آئی۔ جناب رسالت مآبؐ وہیں موجود تھے۔ اس کنیز نے حضرت حمزہؓ کو مخاطب کر کے کہا "اے ابو عمارہ (یہ حضرت حمزہؓ کی کنیت ہے)۔ کیا تمہیں معلوم نہیں جو ابو الحکم بن ہشام (ابو جہل کی کنیت) نے تمہارے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ کیا کیا ہے۔ پوچھ لو، وہ یہیں تو بیٹھے ہیں۔ اس نے ان کو ایذا دی اور سخت گالیاں دیں۔ اور جو کچھ نہیں کہنا چاہیے وہ کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا لیکن محمدؐ نے اس کا جواب تک نہ دیا۔ یہ سن کر حضرت حمزہؓ کو سخت غصہ آیا اور یہی غصہ ان کے لیے کرامت ایزدی کا باعث ہوا۔ حضرت حمزہؓ نہایت تیزی سے گھر سے نکلے اور راہ میں کہیں نہ ٹھہرے اور داخل کعبہ ہوئے۔ ابو جہل کو دیکھا قوم کے لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ آپ اسی غیض کی حالت میں آگے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ اس کے سر کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی آہنی کمان اٹھا کر اس کے ضرب شدید لگائی اور مارنے کے بعد اس سے کہا کہ جس مذہب کو تو برا کہتا ہے میں اسی دین میں داخل ہو گیا۔ اب اگر تیری مجال ہو تو مجھے اس دین میں داخل ہونے سے باز رکھ لے۔ یہ سن کر بنی مخزوم کا ایک شخص ابو جہل کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ابو جہل نے یہ کہہ کر اسے فوراً روک دیا کہ ابو عمارہ سے تعرض نہ کرو، ان کو چھوڑ دو۔ قصور میرا ہے، میں نے حقیقتاً ان کے بھتیجے کے ساتھ بد سلوکی کی۔

اس واقعے کی تفصیل نے جتلا دیا کہ جناب رسالت مآبؐ کے سکوت و صبر سے حضرت حمزہؓ کے جذبات قرابت و یگانگی میں ایسا مفید اور شدید اثر پیدا کر دیا جو حضرت حمزہؓ کے لئے رشد و ہدایت کا باعث ہوا اور بد بخت ابو جہل کے لئے اس کی سزا و عقوبت کا سبب بنا۔

اپنا پھر اپنا ہے کیسا ہی اختلاف ہو اور کتنی ہی مخالفت، جب ایسے ناگزیر موقع آ جاتے ہیں تو تعلقات قلبی میں اور جذبات دل میں غیر متحمل تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ مخالفت

کو حقیقی مواصلت کی صورت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جناب حمزہؓ بھی ابو لہب جیسے شقی اور سنگ دل ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اپنی مصلحت خاص دکھلا دینی ضروری تھی کہ اسی گھر میں ابو طالبؑ، حمزہؓ، اور عباسؓ جیسے خیر خواہانِ رسول بھی موجود تھے اور ابولہب جیسا بدخواہ اور دشمن جاں بھی۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت:

جنگِ اُحد میں قتل علمداران کے بعد ہی حضرت حمزہؓ، حضرت علیؑ، اور حضرت ابو دجانہ غنیم کی صفوں میں دھنس گئے تھے۔ اور تلواروں سے ان کی گھنی صفوں کی صفائی کر رہے تھے۔ حضرت حمزہؓ اپنی شجاعت اور دلیری میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور جناب شبلی نعمانی کے بیان کے مطابق فوج کفار میں دونوں طرف دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے۔ اور جس طرف بڑھتے تھے صفوں کی صفیں صاف ہو جاتیں تھیں۔ اسی حالت میں صباغ نیشانی سامنے آ گیا۔ یہ پکارے کہ او ختانۃ النساء کے بچے کہاں جاتا ہے۔ یہ کہہ کر تلوار ماری وہ خاک پر ڈھیر تھا۔ وحشی یہ جو ایک غلام تھا اور جبیر بن مطعم اس کا آقا تھا، نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے، پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔ (سیرت النبی، صفحہ ۳۷۴، باسناد صحیح بخاری۔ باب قتل حمزہؓ)۔

لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی ہے جو میرے چچا حمزہؓ کی خبر لائے۔ ایک صحابی اٹھے اور کہا کہ میں جانتا ہوں جہاں وہ پڑے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے پاس گئے اور ان کی خستہ حالت دیکھی، تو حضورؐ سے کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ پھر آپؐ نے امیر المومنینؑ کو بھیجا۔ ان کی بھی حضورؐ سے جناب حمزہؓ کی حالت بتانے کی ہمت نہ

ہوئی۔ آخرش حضورؐ خود جناب حمزہؓ کی لاش پر آئے اور ان کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔ فرمایا اللہ کی قسم کبھی ایسے مقام پر مجھے کھڑے ہونے کا اتفاق نہیں ہوا، جہاں اس سے زیادہ مجھے غم و غصہ لاحق ہوا ہو۔ اگر اللہ نے مجھے قریش پر اختیار اور قابو دیا اور تو ان کے ستر اشخاص کو اسی طرح حمزہؓ کے عوض قتل کر کے ان کے اعضا جدا کروں گا۔ اس وقت حضرت جبرئیل امیں نازل ہوئے اور یہ آیت لائے: سورۂ نحل، آیت ۱۲۶: ترجمہ: اگر زخم پہونچاؤ تو اتنا ہی جتنا تمہیں زخم پہنچا ہے، اور اگر صبر کرو تو وہ بے شک صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا "میں صبر ہی کروں گا اور انتقام نہ لوں گا۔" پھر حضرتؐ نے بردیمنی (چادر) سے، جو آپؐ کے دوش مبارک پر تھی کو جناب حمزہؓ کے جسم پر ڈال دیا، جو ان کے جسم مبارک کو نہ ڈھانپ سکی۔ اگر سر تک کھینچ کر چھپاتے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور اگر پاؤں تک کھینچتے تو سر کھل جاتا تھا۔ آخر حضرتؐ نے چادر سے سر تک پورے جسم کو اور پیروں کو گھاس پھونس سے چھپا دیا۔ اس طرح حضورؐ نے جناب حمزہؓ کو ان ہی کے کپڑوں میں دفن فرمایا اور اپنی چادر کا اضافہ فرما دیا۔ نمازِ جنازہ میں ان پر ستر تکبیریں کہیں اور ستر دعائیں پڑھیں۔

جب آں حضرتؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو اشہل اور بنوظفر کے گھروں سے رونے کی آوازیں سنیں۔ آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آنسو رخسار مبارک پر بہنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا، افسوس! آج کوئی نہیں ہے جو حمزہؓ پر روئے۔ سعد بن معاذؓ اور اُسید بن حضیرؓ نے یہ سنا تو کہا کہ انصار کی کوئی عورت اپنے کشتوں پر گریہ نہ کرے، جب تک جناب فاطمہؑ سلام اللہ علیہا کے ساتھ جناب حمزہؓ کا ماتم نہ کر لے۔ پھر ان کی عورتیں جناب فاطمہؑ کے پاس آ کر جناب حمزہؓ کا پرسہ دینے لگیں اور گریہ وزاری کرنے لگیں۔ حضرت صفیہ (حضور اکرمؐ کی پھوپھی) کو بھائی کی خبر شہادت مل چکی تھی۔ بھائی کے درد سے بے چین ہو کر دوڑی چلی آئیں۔ آنحضرتؐ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ زبیرؓ کے صاحبزادے پاس

کھڑے تھے حکم دیا کہ ان کو جا کر راستے میں روک لو۔ بھائی کی لاش کو اس حالت خراب سے دیکھنے کی تاب نہ لاسکیں گی۔ زبیر ابن العوام دوڑے۔ ماں کو روکنا چاہا لیکن وہ نہ رک سکیں۔ بیٹے سے اتنا کہا کہ میں کچھ بھی نہ کروں گی، صرف بھائی کو آخری بار دیکھ کر چلی آؤں گی۔ چنانچہ یہ معظمہ بھائی کی لاش پر آئیں اور جو کہا تھا وہی کیا۔ بھائی کی لاش صد چاک کو نگاہِ حسرت آلود سے دیکھا اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر ہٹ آئیں۔ ہٹنا تھا کہ غم والم وصدمہ وملال کا دل پر ہجوم ہوا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اور ان کے ساتھ جناب سیدہؓ اور دیگر خواتین ہاشمیہ فریادوزاری کرنے لگیں۔ اب رسول اللہؐ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اس نوحہ خواں گروہ کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت صفیہؓ سے خطاب کر کے صدائے غم آلود کے ساتھ فرمانے لگے۔ "اب آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا مصیبت زدہ نہ ہو گا" اس کے بعد آپؐ نے شان رسالت سے بار دیگر فرمایا۔ "اے صفیہؓ، اے فاطمہؓ تم کو بشارت ہو کہ جبرائیلؑ نے آکر مجھے یہ مژدہ دیا ہے کہ ملائکۂ ملاءِ اعلیٰ نے حمزہؓ کو اسد اللہ واسد رسولہ کے القاب خاص سے مشہور ومرقوم کیا ہے۔" (روضۃ الاحباب)۔

ہندہ جگر خوارہ کے مظالم:

اس واقعہ کی پوری تفصیل وحشی کی زبانی محدث شیرازی نے نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یوں ہے:

وحشی کا بیان ہے کہ علاوہ اس کے کہ مکہ میں ہندہ اور میرے درمیان قتل حمزہؓ کی نسبت وعدہ وعید ہو چکے تھے، مکہ سے احد کی طرف آتے وقت راستے بھر جہاں جہاں مجھے ہندہ سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا وہ مجھ کو اس امر کا خیال دلاتی جاتی تھی اور تاکید کرتی جاتی تھی، یہاں تک کہ جب احد کے دن میں حمزہؓ کا کام تمام کر چکا تو ان کی لاش سے کچھ دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ جب یہ بالکل ٹھنڈے ہو جائیں تو میں یہاں سے

ہٹوں۔ اتنے میں کچھ مسلمان ان کی لاش کے پاس آگئے اور انہیں ان کی کنیت ابوعمارہ کہہ کر پکارا، لیکن وہ ختم ہو چکے تھے اور کچھ نہ بولے میں دور سے دیکھ رہا تھا۔ بس پکارنے پر بھی ان کے نہ بولنے سے سمجھ گیا کہ یہ بالکل ٹھنڈے ہو گئے۔ اس اثناء میں لوگ ان کی لاش کے پاس سے چلے گئے تو میں پھر پہنچا اور میں نے اپنا حربہ ان کے جسم کو چیر کر نکالا۔ پھر اس سے ان کے سینے کو چاک کیا، جگر کو نکالا اور وہ جگر خوں چکاں لئے ہوئے سیدھا ہندہ کے پاس چلا آیا۔ اور کہا، لے یہ تیرے باپ کے قاتل کا جگر خون آلود ہے۔ ہندہ کی خوشیوں کی حد نہ تھی، اس نے بڑے شوق سے اس جگر کو لیا اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا گئی لیکن کفار کی کالی مائی سے یہ خون ناحق ہضم نہ ہو سکا فوراً الٹی ہوئی اور جگر کے ٹکڑے منہ سے نکل آئے۔ اس شریر النفس نے ان کو اٹھا کر دھویا اور ہار بنا کر گلے میں پہن لیا۔

وحشی کا بیان ہے کہ اس وحشیانہ حرکت کے بعد ہندہ نے بڑی کشادہ دلی سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اور اس خدمت کے صلہ میں ایک جوڑا کپڑا اور اپنے زیور مجھے دیے۔ اور وعدہ کیا کہ مکہ پہنچ کر دس ہزار دینار سرخ تجھے مزید دوں گی۔ لیکن اب میری غایت تمنا یہ ہے کہ تو مجھے حمزہؓ کی لاش پر لے کر چل تو جو کچھ آرزو دل میں باقی ہے وہ بھی نکال لوں۔ غرض میں اس کو حمزہؓ کی لاش پر لے آیا اس بے رحم نے آپؓ کے مردہ بدن کی ناک کاٹی اور پھر دونوں کان کاٹ لئے اور نہایت احتیاط سے اپنے ہمراہ مکہ لے گئی۔ (روضۃ الاحباب صفحہ ۴۲۸)۔

شبلی نے ہندہ کی ان خوں خواریوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

خاندانِ قریش نے انتقام خون کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلا لیا، ان کی ناک کان کاٹے۔ ہندہ، امیر معاویہ کی ماں نے ان کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے نہ اتر سکا اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہندہ کا لقب جگر خوارہ اسی بناء پر لکھا جاتا ہے۔ ہندہ فتح

مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح وہ ایمان لائی عبرت خیز ہے (سیرت النبیؐ)۔

اسی واقعہ کی جانب دربار یزید میں جناب زینب الکبریٰ سلام اللہ علیہا نے اپنے خطبے میں اشارہ دیا: ''(اے یزید!) تجھ سے کیا توقع رکھی جائے، کہ جو کلیجہ چبانے والی کی نسل سے ہے، جس کی ڈاڑھی شہداء کے خون سے سیراب ہوئی۔''

مدینہ میں داخلہ شہداء کا ماتم:

حضور اکرمؐ جملہ امور سے فراغت پا کر مدینہ میں تشریف لائے تو شہر بھر میں کہرام مچا تھا۔ ہر گھر سے صدائے ماتم بلند تھی لیکن حضرت حمزہؓ پر رونے والا کوئی معلوم نہ ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ کی خاطر مبارک میں قیامت کا یہ پر حسرت خیال آیا کہ تمام گھروں سے شہیدوں کے عزیزوں کی صدائے ماتم آرہی ہے لیکن حمزہؓ کا کون رونے والا ہے۔ ان خیالات کا اظہار زبان مبارک سے ان الفاظ میں کیا گیا۔ ''لیکن حمزہؓ پر رونے والا کوئی نہیں''۔ انصار و حاضرین نے یہ الفاظ سنے تو بے تاب ہو گئے۔ گھروں کی طرف دوڑے اور اپنی نوحہ خواں عورتوں کو دولت سرائے رسالت کی طرف بھیج دیا کہ رسول اللہؐ کے عم محترم کا ماتم کریں۔ خوش عقیدہ اور اخلاق مند خواتین انصار اپنے مردوں کی صف ماتم چھوڑ کر فوراً عصمت سرائے نبوت میں حاضر ہوئیں اور اپنے عزیزوں سے زیادہ حضرت حمزہؓ پر نوحہ و گریہ وزاری کرنے لگیں۔ ان کی زاریاں سن کر بالنفس النفیس آپ عصمت سرا کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ خواتین انصار کو خدمت ماتم داری کے لیے دعائے خیر سے یاد و شاد فرمایا۔ شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ عرب میں دستور تھا کہ سال کے سال، خاص ایام میں عورتیں اپنے عزیز مقتولین کا ماتم کرتیں تھیں۔ اس واقعے کے بعد مدتوں یہ معمول رہا کہ جب کسی کا ماتم کیا جاتا تو یہ داستان حضرت حمزہؓ سے شروع کی جاتی۔ یہ پابندی رسم نہ تھی بلکہ حضرت امیر حمزہؓ سے حقیقی محبت تھی۔ (سیرت النبیؐ)۔

خاک تربت سے سجدہ گاہ بنانے کی بنیاد حدیث پیغمبرؐ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے فلح! سجدے کی حالت میں اپنی پیشانی کو مٹی پر رکھا کرو۔ (امام شوکانی کی نیل الاوطار جلد۲ص ۱۸)۔

دوسری حدیث: جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا: ''سجدہ کرنے کے لیے سب سے بہترین چیز زمین ہے یا وہ چیز (پتا، لکڑی وغیرہ) جو زمین سے پیدا ہو۔ (امام شوکانی کی نیل الاوطار جلد۲ص ۱۸)۔

جناب حمزہؓ کی شہادت کے بعد جناب سیدہ سلام اللہ علیہا پابندی سے ہر پیر کو ان کی قبر مبارک پر فاتحہ خوانی کے لیے جاتی تھیں۔ وہاں سے تربت کی مٹی لا کر سجدہ گاہ اور تسبیح بناتیں اور ہر نماز میں حضور کی ہدایت کے مطابق اسی تسبیح پر تسبیح پڑھتیں اور اسی مٹی سے بنی سجدہ گاہ پر پیشانی رکھتیں۔

دوسرے لوگوں نے بھی جناب سیدہؑ کی پیروی کرتے ہوئے تربت حضرت امیر حمزہؓ سے تسبیح اور سجدہ گاہ بنائیں۔ اور جب واقعہ کربلا رونما ہوا تو یہ سنت یوں تبدیل ہوگئی کہ لوگ حضرت امام حسینؑ کی قبر کی مٹی سے تسبیح اور سجدہ گاہ بنانے لگے۔

چند باتیں کتاب ''لاقانی اجسام'' سے:

ایک واقعہ واقدی سے نقل کیا گیا ہے کہ جب معاویہ نے مدینہ میں ایک نہر نکالنی چاہی تو کدال ایک مرد کے پیروں پر پڑی اور وہاں سے خون جاری ہوگیا۔ یہاں لفظ ''ایک مرد'' اس لیے استعمال کیا گیا کہ یہ واقعہ عہدِ معاویہ کا تھا اور بیان کرنے والے بھی اسی دور کے تھے تو کیسے ممکن تھا کہ وہ حضرت حمزہؓ کا نام لیتے جنہیں معاویہ کی ماں ''ہندِ جگر خورہ'' نے مثلہ کیا تھا، ان کا جگر نکال کر چبایا تھا اور دوسرے اعضا کاٹ کر گلے میں لٹکائے تھے۔ تحقیق کے بعد یہ عقدہ سمہودی ابنِ جوزی کی ایک تحریر سے کھلا۔

سمہودی لکھتے ہیں: ''نہر کھودتے ہوئے کدال جناب حمزہؓ ابنِ عبدالمطلبؑ کے پاؤں پر پڑی اور وہاں سے خون جاری ہوگیا۔'' جب جناب ابوسعید خدریؓ نے یہ واقعہ دیکھا تو

کہا: ''جب جناب رسالت مآبؐ نے اپنے چچا کا مثلہ شدہ جسم دیکھا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ آسمان سے ان کے لیے تسلی نازل ہوئی اور کہا گیا: ''اے مرے حبیبؐ! حمزہؓ ساتوں آسمانوں میں شیرِ خدا اور شیرِ رسولؐ خدا کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں۔'' (السیرۃ النبویہ)۔

نہر کھودنے کا واقعہ یہ ہے کہ معاویہ نے اپنے دور میں چاہا کہ ایک نہر اُحد کے میدان سے گزاری جائے، لہٰذا حکم دیا اور اعلان کردیا کہ اُحد کے مقتولین کے متعلقین یہ نہر کھودنے میں شریک ہوں۔

اس وقت چھیالیس سال جنگ اُحد کو گزر چکے تھے، مگر شہداء کے جو طیب و طاہر اجسام ظاہر ہوئے سب تر و تازہ تھے۔

صحابیِ رسولؐ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں: ''شہدا کے اجسام بالکل تر و تازہ تھے۔''

آج بھی شہدائے اُحد کی قبریں گریہ کناں ہیں کہ انہیں بھی جنت البقیع (مدینۂ منورہ) اور جنت المعلیٰ (مکہ معظمہ) کے ساتھ ساتھ ''خادمین حرمین شریفین'' نے ۱۹۲۶ء میں بلڈوز کردیا۔ انسانی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں، کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک میں، کہ مشاہیر کی قبروں کو کھود پھینکا جائے۔ ہاں بنی امیہ اور بنی عباس کے ادوار میں ایسا ہوا کہ دشمن کے زخمی سپاہیوں کے جسموں پر دسترخوان بچھا کر دعوتوں کا اہتمام کیا گیا۔

مآخذ

(۱) ''اسوۃ الرسولؐ'' از مرحوم و مغفور سید اولاد حیدر بلگرامی۔

(۲) ''لافانی اجسام'' ترجمہ ''اجسادِ جاوداں'' تالیف علی اکبر مہدی پور، ترجمہ جناب سید فیضیاب علی رضوی، پبلشر: الکسا پبلشرز، کراچی۔

(۳) ''حی علی الصلوٰۃ الرسولؐ'' از جناب مسعو نوازش۔

(۴) ''تسبیح زہراؑ کی فضیلتیں'' از جناب علی رضا رجالی تہرانی، مترجم جناب نصیر الرضا صفدر۔

''فارسِ میدان تہور''

جناب حُر علیہ السلام

حسینی قافلہ منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

ابتدا میں یہ قافلہ ۲۸ رجب کو مدینہ سے حج کے لیے مکہ روانہ ہوا تھا۔ مگر امامِ مظلومؑ کو حج کا موقع نہ مل سکا۔ چنانچہ آپؑ نے حج کو عمرے میں تبدیل کیا اور بہ حسرت و یاس مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔

مختلف منازل سے گزرتے ہوئے آپؑ بطن عقبہ پہنچے۔ عقبہ کے بعد کوفہ کا راستہ واقصہ سے گزرتا ہے لیکن امامؑ نے شراف کو اس لیے منتخب فرمایا کہ وہاں پانی اور دیگر وسائل سفر بہتر تھے۔ منزلِ شراف میں شب بسری کے بعد صبح کے وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے جوانوں کو حکم دیا کہ پانی کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے ساتھ لے لیں۔ پھر سفر جاری رہا۔ (تاریخ طبری ج ۴، ص ۳۰۲)۔ امام مظلوم کا ارادہ تھا کہ منزلِ قرعا پر جا کر قیام فرمائیں اور اس کے بعد مغیثہ (حجاز کی آخری منزل) میں قیام کرتے ہوئے قادسیہ (عراق کا پہلا شہر) کی طرف چلے جائیں۔

ابن زیاد ملعون کو جیسے ہی امام حسینؑ کے سفر کی خبر ملی، اس نے پولس کے سربراہ حصین بن تمیم کو قادسیہ کی طرف روانہ کیا۔ اس نے قادسیہ پہنچ کر قادسیہ سے خفان تک اور قطقطانیہ سے لعلع تک اور واقصہ سے بصرہ اور کوفہ کی شاہراہوں تک فوجوں کی ناکہ بندی کر دی تا کہ آنے جانے والوں کی مکمل تفتیش و تحقیق کی جا سکے۔ امامِ مظلومؑ سے سفر کے دوران

کچھ عربوں کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے ان سے سوال کیا تو انہوں نے کہا ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ نہ ہم عراق سے نکل سکتے ہیں اور نہ داخل ہو سکتے ہیں۔ امامؑ نے اسی راستے پر سفر کو جاری رکھا۔ ایک قول کے مطابق حصین چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ مامور ہوا تھا اور انہیں میں حر بن یزید ریاحی بھی تھا جو ایک ہزار کے دستہ کے ساتھ تھا۔

سفر جاری تھا کہ ایک شخص نے آواز بلند کی، اللہ اکبر! امامؑ نے بھی تکبیر کہی اور اس کے تکبیر کہنے کی وجہ پوچھی۔ جواب ملا کہ اس نے کھجوروں کے درخت دیکھے ہیں۔ مقامی لوگوں نے کہا کہ اس علاقے میں کھجوروں کے درخت نہیں ہیں۔ امامؑ نے پوچھا، تمہارے خیال میں یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کسی فوج کے سپاہیوں اور ان کے گھوڑوں کی گردنیں نظر آرہی ہیں۔ امامؑ نے سوال کیا کہ اس علاقہ میں کوئی ایسا محفوظ مقام ہے کہ ہم اسے پشت پر رکھ کر ان سے روبرو ہوں، تاکہ اگر مقابلہ ہو تو فقط ایک رخ سے ہو۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں بائیں طرف ذوحسم نام کی ایک منزل ہے۔ امامؑ نے بائیں جانب مڑ کر ذوحسم کا رخ کیا۔ دشمن کی فوج بھی اسی طرف چلی لیکن امامؑ کا قافلہ ان سے پہلے پہنچ گیا۔

ذوحسم ایک پہاڑ تھا جہاں حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کی شکارگاہ تھی۔ حر اپنے ہزار سواروں کے ساتھ پہنچ گئے اور حسینی قافلہ کے پہلو میں قیام کیا۔ امامؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان لوگوں کو پانی پلاؤ اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیراب کرو۔ علی بن طعان محاربی کہتا ہے کہ میں حرؔ کے لشکر کا آخری آدمی تھا۔ جب میں پہنچا تو امامؑ نے میری پیاس دیکھ کر کہا کہ راویہ کو بٹھا دو۔ راویہ عراقی زبان میں مشک کو کہتے ہیں، لہٰذا علی بن طعان جملے کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ پھر آپ نے فرمایا، اونٹ کو بٹھا دو۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے اس اونٹ کو جس پر فوج کے لیے مشکیزوں میں پانی بار کیا جاتا ہے بٹھا دیا، امامؑ نے فرمایا پانی پیو۔ جب میں نے پانی پینا چاہا تو پیاس کی شدت سے مشک کا دہانہ صحیح طرح پکڑ نہ سکا اور پانی پی نہ سکا۔

امامؑ نے فرمایا، مشک کے دہانے کو چھوٹا کرلو۔ جب میں کامیاب نہ ہوا تو آپؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے پاس آ کر دہانے کو موڑ کر مجھے اور میرے گھوڑے کو پانی پلایا۔

اتنے میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا۔ امامؑ نے حجاج بن مسروق کو اذان دینے کا حکم دیا۔ اقامت کے وقت امام حسینؑ اپنے دوش پر عبا ڈال کر باہر آئے اور حمد وثنائے الٰہی اور نعت رسولؐ کے بعد فرمایا "اے لوگو! میں اللہ کو گواہ بنا کر تمھارے سامنے اپنے آنے کا سبب بیان کرتا ہوں۔ میں تو اس صورت میں آیا ہوں کہ تمھارے خطوط میرے پاس آئے اور تمھارے فرستادے آئے کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیں، ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید اللہ آپ کے ذریعے ہم سب کو ہدایت پر مجتمع کردے۔ میں تو آ گیا ہوں۔ اب اگر تم اپنے قول پر قائم ہو تو مجھے مطمئن کرو اور اپنے عہد و میثاق کو پورا کرو۔ اور اگر ایسا نہ کرو اور تمھیں اپنے خطوط و وفود پر ندامت ہو یا میرے آنے کو ناپسند کرتے ہو تو پھر میں یہاں سے وہیں پلٹ جاتا ہوں جہاں سے آیا ہوں۔ حُر کے لشکر سے جواب میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ امامؑ نے اقامت کہے جانے کا حکم دیا۔ پھر آپؑ نے حُر سے کہا "اگر چاہتے ہو تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ الگ نماز پڑھو۔" حُر نے کہا "ہم سب آپؑ کے ساتھ ہی نماز پڑھیں گے۔" سب نے امامؑ کے ساتھ ہی نماز پڑھی۔ (تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۲۔۲۰۳)۔ امالی صدوقؒ کے مطابق نماز کے بعد حُر اپنی جگہ سے اٹھے اور امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا۔ آپؑ نے سلام کا جواب دیا۔ فرمایا: "اے اللہ کے بندے تم کون ہو؟" انھوں نے کہا: "میں حُر بن یزید ہوں۔" آپؑ نے فرمایا: "یعنی تم ہم سے لڑنے آئے ہو یا ہماری نصرت کرنے آئے ہو؟" انھوں نے کہا "فرزندِ رسولؐ! مجھے تو آپؑ سے لڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے، لیکن میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ قیامت میں اپنی قبر سے اس حالت میں اٹھوں کہ میری پیشانی میرے پاؤں سے بندھی ہوئی ہو اور میرے ہاتھ میری گردن سے

بندھے ہوئے ہوں اور منھ کے بل دوزخ میں پھینک دیا جاؤں"۔ اس کے بعد عرض کی "فرزند رسول آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اپنے جد کے مدینے واپس جائیں ورنہ قتل کر دیے جائیں گے۔" امامؑ نے تین اشعار پڑھے۔ (جن کا مفہوم یہ ہے):

"میں چلتا رہوں گا اور موت اس شخص کے لیے ننگ و عار نہیں ہے جو اللہ اور اسلام کے لیے جہاد کرے اور جو نیک اور صالح افراد کے لیے مواسات کرے۔ جب وہ دنیا سے جائے تو لوگ اس کا غم کریں اور دشمن اس کی مخالفت کریں۔ لہٰذا اگر میں مر جاؤں تو جائے ندامت نہیں ہے اور اگر زندہ رہوں تو جائے ملامت نہیں ہے۔ ذلت تو تمھارے لیے ہے کہ مر جاؤ اور اپنے مقصد و مراد تک نہ پہنچو۔"

شیخ مفیدؒ کی روایت کے مطابق نماز عصر بھی سب نے ایک ساتھ پڑھی۔ نماز کے بعد امامؑ نے پھر خطبہ ارشاد فرمایا: "اے لوگو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور حق دار کو پہچان کر حق اسے دے دو تو یہ اللہ کی بہترین پسندیدگی اور خوشنودی کا سبب ہوگا۔ ہم محمدؐ کے اہل بیت ہیں۔ لہٰذا ہم جھوٹے دعوے داروں کے مقابلے میں ولایت کے بہترین حق دار ہیں، اس لیے کہ یہ ولایت تو دوسروں کا حق ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ تمہارے ساتھ ظلم و جور کا سلوک کرتے ہیں۔ تم نے خطوط بھیجے اور میرے پاس اپنے آدمی بھیجے اب اگر مجھ سے روگرداں ہو گئے ہو تو میں واپس جاتا ہوں"۔ حُر نے جواب دیا کہ "اللہ کی قسم مجھے آپؑ کو بھیجے جانے والے خطوط کا کوئی علم نہیں ہے۔" امامؑ نے عقبہ بن سمعان کو بلا کر فرمایا کہ خطوط کی تھیلیاں لاؤ۔ عقبہ دو بھری ہوئی تھیلیاں لایا اور انہیں حُر کے سامنے لا کر الٹ دیا۔ حُر نے جواب دیا کہ میں ان لکھنے والوں میں نہیں ہوں۔ میں تو اس بات پر مامور ہوں کہ آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں یہاں تک کہ آپ کو عبداللہ ابن زیاد کے پاس لے جاؤں۔ امام حسینؑ کو جلال آ گیا۔ آپؑ نے جواب میں حُر سے فرمایا: "تمھارے اس ارادے کے مقابلے میں تمہاری

موت تم سے زیادہ نزدیک ہے۔ پھر آپؑ نے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اٹھو اور کوچ کی تیاری کرو۔ جب قافلہ آمادۂ سفر ہوا تو حر نے امام حسینؑ کو روکنا چاہا، اس پر امام نے فرمایا "تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے، تو آخر چاہتا کیا ہے؟" حُر نے کہا "اگر آپؑ کے علاوہ کسی نے میری ماں کا نام لیا ہوتا تو میں بھی اس کی ماں کا نام لیتا، لیکن اللہ کی قسم آپ کی والدہ کا اسم گرامی تو احترام کے بغیر لیا ہی نہیں جا سکتا۔" امامؑ نے فرمایا کہ تم اپنے دل کی بات بتلاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟ اس نے کہا کہ میں آپ کو ابن زیاد کے پاس کوفہ لے جانا چاہتا ہوں۔ آپؑ نے فرمایا ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ حر نے کہا پھر میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ آپ کو جانے نہ دوں گا۔ دو تین بار ان جملوں کی تکرار ہوئی۔ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے۔ اتنے میں حر نے کہا، میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوں لیکن میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ کو میری بات قبول نہیں ہے تو آپ اپنے لیے ایسا راستہ منتخب فرمائیں جو نہ کوفے کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف تاکہ آپ کے اور میرے درمیان انصاف ہو جائے۔ میں یہ باتیں ابن زیاد تک پہنچاؤں گا۔ شاید اللہ تعالیٰ انجام کار میں عافیت عطا فرمائے اور ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ (ارشاد مفید ج ۲ ص ۷۹۔ ۸۰)۔ جب گفتگو میں تکرار ہوئی تو حر نے عرض کی "یا ابا عبداللہ! مجھے آپ کے قتل کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ مجھے تو یہ حکم ہے کہ میں آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں۔ اللہ کی قسم میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اللہ آپ کے باب میں مجھ سے ناراض ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس امت کا ہر شخص قیامت کے دن آپ کے جد کی شفاعت کا محتاج ہوگا۔ میں ڈرتا ہوں کہ آپ سے قتال کر کے کہیں میری دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو جائیں۔" (الفتوح ج ۵ ص ۷۹)۔

منزل ذو حسم پر امامؑ نے اپنے انصار سے خطاب کرتے ہوئے حالات کی نزاکت

سے آگاہ کیا۔ اس پر تمام انصارانِ باوفا نے آپؑ کا ہر قیمت پر ساتھ دینے کا اعادہ کیا۔

مقام بیضہ پر بھی امام مظلومؑ نے اپنے اور حر کی فوج کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں انہوں نے حاکمان کوفہ وشام کی بدعہدیوں کا اور اپنی منزلت اور مقام سے آگاہ فرمایا اور اپنی فکر اور ارادہ سے مطلع کیا۔

بیضہ سے چل کر آپ رہیمہ اور پھر وہاں سے عذیب الہجانات (قادسیہ ومغیثہ کے درمیان ایک آبی ذخیرہ) پہنچے تو کوفہ سے آنے والے چند افراد طرماح بن عدی کی رہنمائی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ نافع بن ہلال کے کامل نامی گھوڑے کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں طرماح کے علاوہ چار افراد اور تھے۔ امام نے ان سب کا خیر مقدم کیا۔ آگے چل کر یہ سب بھی انصاران حسینؑ میں شامل ہو گئے۔

اس دوران حر نے آکر انہیں امامؑ کے قافلے میں شامل ہونے سے روکنا چاہا اور امامؑ سے کہا کہ یہ لوگ اہلِ کوفہ ہیں اور آپ کے ساتھ آنے والوں میں شامل نہیں ہیں۔ میں انہیں روک کر کوفہ بھیج رہا ہوں۔ اس پر امام حسینؑ نے ان کی حمایت میں فرمایا کہ یہ لوگ میرے دوست ہیں اور میں ان کا دفاع بھی اسی طرح کروں گا جس طرح اپنا کرتا ہوں۔ بحث وتکرار کے بعد حر نے انہیں چھوڑ دیا۔

قصہ مختصر، حسینی قافلہ مختلف منزلوں سے گزرتا رہا۔ اس دوران حر اور اس کا لشکر بھی امامؑ کے قافلے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ اپنی منزلِ خاص کربلا پہنچ گیا۔ حر اور اس کے لشکر نے امامؑ کو آگے جانے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ آپ یہیں پڑاؤ ڈالیں۔ یہاں سے فرات قریب ہے۔ امامؑ نے پوچھا کہ اس جگہ کا نام کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ "کربلا" ہے۔ آپؑ نے فرمایا: "یہ زمین کرب وبلا (کرب وابتلاء) کی سرزمین ہے۔ صفین کی طرف جاتے ہوئے میرے والد اس مقام سے گزرے تو آپ یہاں ٹھہر گئے۔ میں ساتھ

تھا۔ انہوں نے اس مقام کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے اس جگہ کا نام بتایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہاں ان کی سواریاں اتر جائیں گی اور یہاں ان کا خون بہایا جائے گا۔ لوگوں نے آپ کے اس بیان کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ آلِ محمدؐ کے ثقل (گراں قدر افراد) یہاں پڑاؤ ڈالیں گے۔

اب وہ دن آپہنچا جسے عاشور کہتے ہیں۔

جب دونوں طرف جنگ کی کارروائی مکمل ہوگئی اور لشکر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوگئے تو حر بن یزید ریاحی یہ دیکھ کر کہ اب جنگ یقینی ہے عمر ابن سعد کے پاس آئے اور سوال کیا کہ کیا تم واقعاً اس مرد سے جنگ کروگے؟ اس نے جواب دیا، ہاں ایسی جنگ کروں گا کہ سر اور ہاتھ کٹ کٹ کر گریں گے۔ اس پر حر نے پوچھا کہ فرزند رسولؐ نے جو شرائط تمہارے سامنے رکھی تھیں کیا وہ قابل قبول نہیں تھیں؟ ابن سعد نے کہا اگر یہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں قبول کر لیتا لیکن تمہارا امیر (ابن زیاد) اسے قبول نہیں کرتا۔ حر یہ جواب سن کر لشکر سے ہٹ کر اپنے ہم قبیلہ اور ساتھی قرہ بن قیس کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ آج تم نے اپنے گھوڑے کو پانی پلایا ہے؟ قرہ کہتا ہے کہ میں یہ سمجھ گیا کہ حر لشکر کو چھوڑنا چاہتا ہے اور یہ نہیں چاہتا کہ میں اسے لشکر چھوڑتے ہوئے دیکھوں۔ لہٰذا میں نے کہا کہ ابھی گھوڑے کو پانی نہیں پلایا ہے، اب جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت وہاں سے چلا گیا۔ اللہ کی قسم، اگر حر مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیتا تو میں بھی امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ (یہ محض کہنے کی بات تھی، ورنہ حر نے آنے سے پہلے قرہ کو بھی امامؑ کے پاس چلنے کو کہا تھا جس پر اس نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں)۔

امام مظلومؑ کے پاس آنے سے پہلے حر اپنے بیٹے کے پاس آیا اور کہا: ''اے فرزند! میں جہنم کی آگ برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، نہ اللہ کا غضب برداشت کر سکتا

ہوں اور نہ اس کی طاقت رکھتا ہوں کہ کل قیامت میں نبی اکرمؐ سے میری دشمنی ہو۔ تم نے فرزند رسول کا استغاثہ سنا؟ کوئی ان کا حامی و ناصر نہیں۔ آؤ میرے ساتھ تا کہ حسینؑ کی خدمت میں جائیں۔" بیٹے نے کہا "بابا! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔"

اب دونوں باپ بیٹے آہستہ آہستہ امام حسینؑ کی طرف چلے۔ ابن سعد کا ایک سپاہی مہاجر بن اوس یہ دیکھ کر بولا کہ اے حر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا حملہ کا خیال ہے؟ لیکن حر نے کوئی جواب نہ دیا اور کانپنے لگا۔ مہاجر نے کہا کہ تمہارا یہ حال مجھے شک میں ڈال رہا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے تمہیں کسی جنگ میں اس حال میں نہیں دیکھا۔ اگر لوگ مجھ سے پوچھتے کہ کوفہ کا بہادر ترین انسان کون ہے تو میں تمہارا نام لیتا۔ لیکن اس وقت تمہاری کیا حالت ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ حر نے جواب میں کہا "اللہ گواہ ہے اس وقت میں اپنے آپ کو جنت اور جہنم کے درمیان پا رہا ہوں۔ اللہ ہی گواہ ہے کہ میں جنت کے بدلے کسی چیز کو اختیار نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے ٹکڑے کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ یہ کہہ کر حر نے گھوڑے کو ایسی ایڑ لگائی کہ گھوڑا ہوا میں اڑنے لگا۔

جناب حر نے سر پر ہاتھ رکھے اور حالت زار و گریہ میں عجز و نیاز سے کہہ رہے تھے: "پروردگارا! میں تیری طرف لوٹ آیا ہوں، میری توبہ قبول کر، میرے گناہ معاف فرما کیونکہ میں نے تیرے پیاروں کو ڈرایا ہے اور پیغمبر کی بیٹی کی اولاد کو پریشان کیا ہے۔ آج ان کی یہ حالت دیکھ کر شرمندہ ہوں۔"

حر اسی طرح نوحہ کناں امامؑ کے اصحاب کی صف کے قریب پہنچے۔ اصحابؓ نے راستہ دیا۔ اس مرد دیں دار کی نظر جمال پر ملال حسینی پر پڑی تو دل سے فریاد کی اور خود کو گھوڑے سے گرا دیا۔ چہرے پر خاک ملی اور امامؑ کے قدموں پر گر کے ان قدموں کے بوسے لیے اور زار و قطار روتے ہوئے عرض کی: "اے فرزند رسولؐ میری خطا معاف

فرمادیں۔ یا ابن رسول اللہ میں وہی ہوں جس نے آپ کو وطن واپس جانے سے روکا اور میں آپ کے ساتھ رہا یہاں تک کہ میں آپ کو اس سرزمین پر لایا۔" اور پھر بلند آواز سے روئے۔" امام حسینؑ نے فرمایا: "اے بزرگوار! اپنا سر بلند فرمائیں۔" یہ کہہ کر امام مظلوم خود جھکے اور حر کا سر خود خاک سے اٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے حر کے چہرے پر لگی خاک کو صاف فرمایا۔ اس کے بعد انہیں گھوڑے پر سوار کر کے باقاعدہ ہراول دستہ (فوج میں سب سے آگے کا حصہ) میں شامل کر لیا۔

اس اثناء میں دشمن نے پے در پے دو حملے کیے جس میں حسینی لشکر کے بیشتر سپاہی شہید ہو گئے۔ دوسرے حملے کے بعد دونوں لشکروں نے اپنی صفوں کو پھر مرتب کیا تو حر اپنے گھوڑے سے اترے اور مرکب کی لگام کھینچی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح سوار ہوئے اور جلدی سے امامؑ کی خدمت میں آ کر عرض کی: "قربان جاؤں، میں ایک شرمندہ اور روسیاہ بندہ ہوں کہ سب سے پہلے آپ کا راستہ میں نے روکا، بیابانوں میں غیر معروف راستوں پر آپ کو چلنے پر مجبور کیا اور کئی مقامات پر سختی کی کہ یہاں رکیں۔ اب میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں۔ اللہ کی قسم مجھے اندازہ نہ تھا کہ آپ کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا۔ اب مجھے میدان میں جانے کی اجازت دے دیں۔"

امامؑ نے فرمایا "اے حر! تم ہمارے مہمان ہو، ابھی تمہاری تھکان بھی دور نہیں ہوئی ہوگی۔ گھوڑے سے اتر آؤ اور آرام کرو۔" حر نے عرض کیا "قربان جاؤں، مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ کاش میرا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا اور یہ عمل مجھ سے سرزد نہ ہوا ہوتا۔ مجھے اب اجازت دیں کہ ابھی میدان میں جاؤں۔" جناب حر کے بار بار التماس اور خواہش کرنے کے بعد حضرت امام حسینؑ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور روتی آنکھوں سے حر کو اجازت دی۔

جب جناب حر کو پیش قدمی کی اجازت مل گئی تو خوشی سے سرشار ہو گئے۔ تیزی سے میدان میں آئے اور اپنے گھوڑے کو مہمیز کیا۔ دونوں اطراف کے لشکر حیرت اور استعجاب سے حر کو دیکھ رہے تھے کہ اس شیر دلاور نے دل کی گہرائیوں سے ایک گرج دار نعرہ بلند کیا۔ اپنے نام و نسب کا تعارف کرایا۔ بار بار زور زور سے کہتے تھے "میرا امیر تو صرف اور صرف حسینؑ ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جناب حر کا دل پہلی ملاقات میں حسینؑ کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ بعد میں انہوں نے جو کیا اس کے انجام کا انہیں صحیح اندازہ نہیں تھا۔ مزید یہ کہ ابن زیاد کی اس وقت کی حکم عدولی، ان کی جان کے زیاں اور حضرت امام حسینؑ کے لیے خطرات کے بڑھ جانے کا پیش خیمہ ہوتی۔ سو جناب حر کو جب امامؑ سے معافی مل گئی تو ان کی دلی آرزو بر آئی، توفیقات میں بے بہا اضافہ ہوا جو اس جوش و ولولہ کا سبب بنا اور انہوں نے اپنے ہی ساتھیوں کو، جو اب ان کے اور ان کے امامؑ کے دشمن تھے، پوری قوت سے للکارا۔ فرمایا:

"اے اہلِ کوفہ و شام! تمہاری مائیں تمہارے سوگ میں بیٹھیں اور ان کی آنکھیں ہمیشہ آنسو بہاتی رہیں۔ اے لعینو! تم نے اس نیک، صالح، شائستہ بزرگ کو پہلے دعوت دی اور جب وہ اس علاقے میں آ گئے تو ان کو تنہا چھوڑ دیا۔ جب کہ تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم آپ پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ اب یہ کیسا انصاف ہے کہ لشکر لے کر آ گئے اور ان کو گھیر کر قتل کرنا چاہتے ہو۔ نہ انہیں وطن واپس جانے دیتے ہو نہ کہیں اور۔ اے قومِ بے وفا! کیسا ظلم ہے کہ یہود و مجوسی اور حیوان تک سیراب ہو رہے ہیں اور مالک کوثر و تسنیم اور اس کے اہلِ خانہ پر پانی بند ہے۔ اس پر ستم یہ کہ اب اولادِ رسول کا خون بہانا چاہتے ہو۔ تم سخت غلطی پر ہو۔ اللہ تمہیں قیامت میں سیراب نہ کرے۔"

جناب حر کے کلام کے جواب میں ابن سعد کے لشکر نے تیروں کی بارش کر دی۔

آپ نے امامؑ مظلوم اور ان کی پیاس پر اونچی آواز سے گریہ کیا اور اپنے نیزے کو ہاتھ میں لے کر گھوڑے کو وہ تازیانہ لگایا کہ وہ قلب لشکر میں جا گھسا۔ اسی دوران جناب حر کے بھائی مصعب بن یزید بھی لشکر شام سے نکلے اور گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے جناب حر کے پاس آ پہنچے۔ لشکرِ کفر نے سمجھا کہ مصعب جناب حر سے لڑنے جا رہے ہیں لہٰذا سب گردنیں اٹھا اٹھا کر غور سے دیکھنے لگے۔ جناب حر حیران ہو گئے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا میرا بھائی مجھ سے لڑے گا۔ لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ مصعب جناب حر کے سامنے آئے، گھوڑے سے اتر کر بھائی کے پاؤں کا بوسہ دیا اور کہا: ''اے بھائی! آپ دونوں جہانوں میں سرفراز ہو کر نہ صرف میری ہدایت کا باعث بن گئے بلکہ مجھے بھی سیدھے راستے پر لانے کا سبب بن گئے۔ اور پھر یہ کہ آپ کی وجہ سے میں لشکر الٰہی میں شامل ہو گیا۔ واللہ اب اگر زمین و آسمان سے مجھ پر تیر و شمشیر برسیں، آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔''

جنابِ حر خوش ہو گئے۔ بھائی کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: ''اب ہم اور تم مل کر اس بے حیا لشکر سے جہاد کریں گے۔ ان کافروں سے جہاد اور اس راہ میں شہید ہو جانا باعثِ سعادت ہے۔''

مصعب نے کہا ''آپ جو کہیں گے کروں گا، بس میرا دل چاہتا ہے کہ شہادت سے پہلے جمالِ حسینی کا دیدار کر لوں۔ مجھے ان کے پاس لے چلیے تاکہ قدم بوسی کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لوں۔ جناب حر انہیں امام مظلومؑ کے پاس لے آئے۔ جیسے ہی مصعب کی نظر امامؑ پر پڑی، خود کو گھوڑے سے گرا دیا۔ دوڑ کر حضرتؑ کے قدموں کے بوسے لیے۔ جناب حر نے اپنے بھائی کی تقصیر کی معافی مانگی۔

سخی ابن سخی امامؑ نے حر کی تعریف کی اور مصعب کو معافی عطا کی۔ دونوں کے لیے حق کی طرف آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ جناب حر کا یہ کارنامہ تھا کہ ایک اور فرد کو راہ حق پر لے آئے۔

جناب حر کا اپنے بیٹے کو میدان میں بھیجنا اور اس کی شہادت:

جب جناب حر کو جہاد کی اجازت ملی تو جناب حر نے اپنے بیٹے علی سے فرمایا:

''اے فرزند! ان ظالموں پر حملہ کرو اور اپنی جان حسینؑ ابن علیؑ پر قربان کر دو۔''

علی نے حکم کی تعمیل کی۔ نیزہ لے کر مرکب پر سوار ہوئے اور لشکرِ شام پر حملہ آور ہوئے۔ جناب حر اپنے بیٹے کی جنگ دیکھتے رہے۔ ان کا بیٹا شیر کی طرح لشکر باطل پر حملہ آور ہوا۔ کبھی مخالف لشکر کے میمنہ پر اور کبھی میسرہ پر، جدھر بھی رخ کرتا کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔ جو بھی سامنے آتا ڈھیر ہو جاتا۔ پہلے حملہ میں اس شیر دل جوان نے ایک روایت کے مطابق چوبیس اور دوسری روایت کے مطابق ستر افراد کو واصل جہنم کیا۔

جب مزید لوگ ان کے سامنے آنے سے گھبرانے لگے تو آپ امامؑ کے حضور آئے اور عرض کی ''مولا کیا آپ ہم سے راضی ہیں؟'' امامؑ نے فرمایا: ''اللہ تم سے راضی ہے۔'' پھر دعا فرمائی: ''اے اللہ! ان باپ اور بیٹے سے راضی ہو جا، میں ان سے راضی ہوں۔''

اب جناب حر نے اپنے بیٹے کو پھر حملہ کرنے کا حکم دیا اور خود بھی اس کے ساتھ حملے کیے۔ دونوں نے اپنے آپ کو قلب لشکر میں ڈال دیا اور اسے تتر بتر کر دیا۔ میمنہ پر حملہ کیا اور وہاں کھلبلی مچا دی، میسرہ میں گھسے تو افراتفری بپا کر دی۔ تھوڑی سی دیر میں دو سو افراد کو جہنم رسید کر دیا۔

علی بن حر حملہ کرتے وقت یہ رجز پڑھ رہے تھے: ''میں علی ہوں اور حر کا بیٹا ہوں۔ ہر مشکل اور تکلیف کے باوجود حسینؑ پر جان قربان کر دوں گا۔ اس کے بدلے قیامت میں کامیابی ملے گی اور نبی اکرمؐ و امامِ برحقؑ کا ساتھ نصیب ہوگا۔'' یہ کہہ کر علی نے پھر حملہ کیا اور لشکر میں گھس کر پچاس یزیدیوں کو واصلِ جہنم کیا۔ لشکر اس کے آگے سے بھاگنے لگا۔ یہ واپس آنے لگا تو حر نے کہا کہ کہاں جاتے ہو، واپس آؤ اور سعادت ابدی حاصل کرو۔

علی نے پھر حملہ کیا، یہاں تک کہ تھک گیا۔ پیاس اور بھوک نے مزید جنگ سے روک دیا۔ جب لشکر کفر نے دیکھا کہ وہ تھک چکا ہے اور پیاس و بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے تو سب نے یک بارگی مل کر اس پر حملہ کیا۔ ہر شخص نے وار کیا، کسی نے نیزے سے کسی نے تلوار سے، کسی نے گرز اور عمود سے۔ غرض کہ علی پر اس قدر ضربیں لگیں کہ بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ علی نے چاہا کہ اپنے آپ کو باپ تک پہنچا دے مگر گھراؤ اتنا شدید تھا کہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ باپ کو آواز دی کہ میں دشمنوں میں گھر چکا ہوں، بابا میری مدد فرمائیں۔ آواز سن کر جناب حر اور دیگر انصار نے علی کے پاس جانا چاہا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی دشمنوں نے علی کے بدن کو چھلنی کر کے اور سر کاٹ کے نیزے پر بلند کر دیا۔ جب جناب حر نے بیٹے کا سر نوک نیزہ پر دیکھا تو کہا: ''اللہ کا شکر ہے کہ تم دنیا سے بے دین اور جاہل نہیں گئے بلکہ امام حسینؑ کے سامنے شہادت کی منزل پر فائز ہوئے۔''

جناب حر کی شہادت:

اپنے بیٹے کی شہادت کے بعد جناب حر، امام مظلومؑ پاس سر جھکائے ہوئے آئے اور اذن جہاد مانگا۔ امامؑ سے اجازت لے کر میدان کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر شجاعت کے بے مثال جوہر دکھائے۔ جناب حر بڑے شجیع تھے اور تنہا ایک ہزار گھڑ سواروں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اب جو لشکر یزید پر حملہ آور ہوئے تو ان کے ہوش اڑ گئے۔

اس دوران ابن سعد نے صفوان بن حنظلہ سے کہا کہ حر کو نرمی سے نصیحت کر کے واپس اپنے لشکر میں لے آؤ۔ مگر یہاں تو جناب حر کا دل حبِّ آلِ محمدؐ سے سرشار ہو چکا تھا۔ کافی گفت وشنید کے بعد بھی جناب حر کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو غصہ سے صفوان نے ان پر نیزہ سے وار کیا۔ جواب میں جناب حر نے بھی ایسا نیزہ صفوان کے سینے پر مارا کہ نیزہ ایک گز اس کی پشت سے باہر نکل گیا۔ چکرا کر گرا اور اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔

اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے صفوان کے تین بھائیوں نے جناب حر پر حملہ کیا۔ جناب حر نے تینوں کا دلیری سے مقابلہ کیا اور سب کو واصل جہنم کیا۔

اب جناب حر نے امامِ مظلومؑ سے بلند آواز میں عرض کی: "میرے آقا! کیا آپ نے مجھے بخش دیا؟ کیا آپ مجھ سے راضی ہیں؟" امامؑ نے فرمایا: "ہاں میں راضی ہوں، تم ویسے ہی حر ہو جیسا تمہاری ماں نے تمہارا نام رکھا ہے۔ تم جہنم کے عذاب سے آزاد ہو۔"

جناب حر یہ بشارت سن کر بہت خوش ہوئے۔ ساری تھکان دور ہو گئی۔ تازہ دم ہو کر پھر حملہ آور ہوئے۔ جس طرف حملہ کرتے، لاشوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ اس اثنا میں ایک پیادہ نے جناب حر کے گھوڑے کو زخمی کر کے گرا دیا۔ انہوں نے پاپیادہ جنگ شروع کر دی۔ امام مظلومؑ نے صورت حال دیکھ کر تازہ گھوڑا بھیجا، جس پر سوار ہو کر جناب حر نے پھر تیز رفتاری سے حملے شروع کر دیے۔ لشکر یزید میں گھس کر اس قدر جنگ کی کہ نیزہ ٹوٹ گیا۔ اب جناب حر نے تلوار چلائی۔ جس پر بھی چلی اس کا حشر نشر کر دیا۔ لڑتے لڑتے ابن سعد کے سر پر پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر شمر ملعون نے لشکر کو آواز دی کہ سب مل کر جناب حر کو گھیر لیں اور سب بہ یک وقت حملہ کریں۔ سب نے یکبارگی حملہ کیا مگر جناب حر داد شجاعت دیتے رہے۔ اچانک قسورہ بن کنانہ نے چھپ کر جناب حر کے سینے پر نیزہ مارا جس سے انہیں کاری زخم آیا۔ اپنے زخم کی پروا نہ کرتے ہوئے انہوں نے قسورہ کے سینہ پر جوابی نیزہ مارا جس سے وہ زمین پر گرا اور واصل جہنم ہو گیا۔ اب جناب حر نے محسوس کیا کہ ان پر ہونے والا نیزہ کا وار کاری تھا چنانچہ گھوڑے پر ٹھہرا نہ گیا اور زین سے زمین پر نعرہ لگاتے ہوئے آ گئے: "اے فرزندِ رسولؐ مدد فرمایئے۔"

جناب امام حسینؑ دل تھام کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور جناب حر کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر اپنے لشکر میں لے آئے۔ گھوڑے سے اترے اور زمین پر بیٹھ گئے۔

جناب حر کا سر اپنی گود میں لیا۔ چہرے سے گرد و غبار کو آستین سے صاف کیا۔ اس وقت تک جناب حر میں رمقِ جان باقی تھی۔ آنکھیں کھولیں تو اپنے سر کو امامؑ کی گود میں دیکھا۔ مسکرا کر عرض کی: ''اے فرزندِ رسولؐ! کیا آپ مجھ سے راضی ہیں؟'' امامؑ نے فرمایا: ''میں راضی ہوں اور اللہ بھی راضی ہے۔''

جناب حر اس بشارت سے خوش ہوئے اور اسی خوشی میں روح پرواز کر گئی۔ امام مظلومؑ نے جناب حر کی شہادت پر آنسو بہائے اور انصار بھی روتے رہے۔ امامؑ نے یہ مرثیہ پڑھا: ''حر ہو تو حر بن ریاح کی طرح کہ جو ہر مصیبت پر صابر تھا۔'' پھر فرمایا: ''قسم اللہ کی، تیری ماں نے تیرا نام صحیح رکھا ہے۔ تو دنیا و آخرت میں آزاد ہے۔ جناب حر کس قدر اچھے جوان تھے۔ میرے اللہ! جناب حر کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرما اور حوروں کو ان کا خدمت گزار بنا دے۔''

جب جناب امام حسین علیہ السلام کی نمر خیر جناب حر کی پیشانی پر پڑی کہ چاند کے قرص کی طرح شگافتہ ہے تو حضرت کو بہت دکھ ہوا۔ آپ نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور حر کے سر پر باندھ دیا۔'' (یہ رومال جناب زہراؑ کا تھا)۔

صاحب معالی السبطین نے لکھا ہے کہ شاہ اسماعیل صفوی نے حر کی قبر کھودنے کا حکم دیا تا کہ جو رومال امام حسینؑ نے باندھا تھا وہ بطور تبرک کھول لیا جائے اور خزانہ میں محفوظ رکھا جائے اور جنگوں میں کامیابی کے لیے اس سے مدد لی جائے۔ جیسے ہی وہ رومال جناب حر کے ماتھے سے کھولا گیا، تازہ خون جاری ہو گیا۔ شاہ اسماعیل نے حکم دیا کہ کوئی اور رومال باندھا جائے تا کہ خون بند ہو جائے لیکن خون بند نہ ہوا۔ کافی رومال بدل بدل کر باندھے گئے لیکن بات وہی رہی۔ مجبوراً وہی رومال جناب حر کی پیشانی پر باندھ دیا گیا۔ خون بہنا فوراً بند ہو گیا۔

جناب حر کے بھائی جناب مصعب بن یزید ریاحی اور غلام عروہ کی شہادت:

جناب حر کی شہادت کے بعد جناب مصعب نے امامؑ سے اجازت لی اور میدان میں گئے۔ لشکر یزید پر حملہ کیا۔ بہادری سے لڑتے رہے اور کثیر دشمنوں کو واصل جہنم کر کے جام شہادت نوش کیا۔

جناب مصعب کے بعد جناب حر کے غلام جناب عروہ جذباتی ہو کر میدان میں پہنچے اور جنگ کی، ملعونوں کو فی النار اور اپنے سرداروں کی شہادت کا بدلہ لیا۔ پھر میدان سے واپس آئے اور امامؑ کے پاس آ کر ان کے قدموں پر گر پڑے اور عرض کیا "مولا مجھے معاف کر دیں، میں آپ سے اجازت لیے بغیر میدان جہاد میں چلا گیا۔ اپنے سرداروں کی شہادتوں نے مجھے بے اختیار کر دیا، میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اب میں آپ سے معافی اور اجازت جنگ چاہتا ہوں۔"

امامؑ سے اجازت ملنے پر اس نے ایڑ لگائی اور لشکر یزید میں جا گھسا۔ ابن سعد نے حکم دیا کہ اس کو گھیر لو اور چاروں طرف سے وار کرو اور اس کے بدن کے ٹکڑے کر دو۔ اس طرح جناب حر کا یہ غلام بھی منزل شہادت پر فائز ہوا۔

ماخذ

۱۔ "حدیث کربلا" علامہ طالب جوہری مدظلہٗ العالی۔

۲۔ "مدینہ سے مدینہ تک" آیت اللہ سید محمد جواد ذہنی تہرانی، مترجم: علامہ ناصر مہدی جاڑا۔

"جناب زعفر جن"

جنات اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جو جناب آدمؑ کی خلقت سے پہلے موجود تھی اور اب بھی موجود ہے۔ یہ ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ لیکن کبھی کبھی دکھائی بھی دے جاتے ہیں، کبھی انسان کی شکل میں اور کبھی حیوانات کی شکل میں۔ انسانوں کی طرح یہ بھی نیک اور برے دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں صاحبان ایمان بھی ہیں اور کافر بھی۔ آج بھی شہروں میں اکثر مکانات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جناتوں کے تصرف میں ہیں۔ بہت سے عاملوں اور روحانیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جناتوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ کئی بزرگان دین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ان سے رابطہ میں رہتے ہیں۔ جناتوں کے وجود سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کیوں کہ ان کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے بلکہ ایک سورہ کا نام ہی سورۂ جن ہے۔ مکہ معظمہ میں آج بھی مسجد جن موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سورۂ جن یہاں نازل ہوا تھا۔ سورۂ رحمٰن جسے قرآن مجید کی دلہن کہا جاتا ہے اس میں انسانوں اور جناتوں دونوں کو بار بار مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ "تم دونوں" اللہ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

واقعۂ کربلا سے جنوں کا خاص ربط ہے۔ ہندوستان میں کئی جناتوں کی مسجدیں ہیں جہاں سے راتوں کو ماتم کی آوازیں آتی ہیں۔ بعض کربلاؤں اور عزاخانوں میں جناتوں کا نوحہ و ماتم سنا جاتا ہے۔ (برصغیر پاک و ہند میں "کربلا" ہر شہر کے اس مقام کو بھی کہا جاتا ہے جہاں جلوس کے بعد تعزیے اور علم ٹھنڈے کیے یا بڑھائے جاتے ہیں)۔ بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں جناب زعفر نامی جن سے اپنی ملاقات کا حال بتایا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت امام حسینؑ کے ماتم دار تھے۔

حضرت علیؑ نے جب جنوں کے لشکر کو شکست دی تو جن اجنہ نے اسلام قبول کرلیا

ان میں سے راحیل کو جنوں کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ راحیل کے بعد ان کا بیٹا زعفر جنوں کا بادشاہ ہوا۔ کربلا کا واقعہ اسی زعفر جن کے دور میں پیش آیا۔

روایات کے مطابق ایک دن زعفر جن اپنے دربار میں جشن منا رہے تھے کہ انہیں خبر ملی کہ کربلا میں جنگ ہو رہی ہے اور حضرت امام حسین علیہ السلام دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی زعفر نے جشن کو موقوف کر دیا اور جناتوں کا لشکر لے کر کربلا پہنچ گئے۔ آپ نے امام مظلومؑ سے درخواست کی کہ انہیں جنگ کی اجازت دے دیں تاکہ وہ سارے دشمنوں کو فنا کر دیں۔ لیکن امامِ مظلومؑ نے ان کے اصرار کے باوجود مدد قبول نہیں کی۔ زعفر کو دعائیں دیں اور کہا کہ میرا ماتم کیا کرنا۔ زعفر روتے پیٹتے واپس چلے گئے۔ ان کی والدہ کو جب امام مظلومؑ کا احوال معلوم ہوا تو انہوں نے زعفر کو پھر کربلا بھیجا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ امام مظلومؑ شہید ہو چکے تھے۔

زعفر جن کا حال اردو کے کئی مرثیہ نگاروں نے نظم کیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ میر انیسؔ نے جناب زعفر جن کا واقعہ اپنے مرثیہ: ”جب باغِ حسینی پہ خزاں آ گئی دن میں“ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عصرِ عاشور جب حضرت امام حسین علیہ السلام زخموں سے چور چور ہو چکے تو اس وقت جناب زعفر جن، گرد و غبار کے پیچھے سے حاضر ہوئے۔ پورا میدانِ کربلا گرد کے طوفان سے پیلا پڑ گیا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ مقتل کے پاس پہنچ کر جب گرد و غبار چھٹا تو امامِ مظلومؑ نے دیکھا کچھ گھڑ سوار چلے آ رہے ہیں۔ گھوڑوں پر ساز و سامان اور ہتھیار سجے ہوئے ہیں۔ تعداد میں بے شمار ہیں۔ کچھ فوج زمین پر ہے اور کچھ ہوا کے دوش پر۔ اک سیلِ بے پناہ ہے۔ جب میدانِ کارزار جناتوں کے لشکر سے بھر گیا تو سردار نے آواز دی: ”ٹھہرو! اب آگے نہ بڑھو، ہم اپنے آقا کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے آقا و مولا یہیں ہیں۔ اور جو لاشیں یہاں نظر آ رہی ہیں اس میں جناب سیدہؑ کے کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔“ یہ سن کر تمام لشکر ٹھہر گیا۔ جناب زعفر گھوڑے سے نیچے تشریف لائے۔ امامِ مظلومؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ غلاموں کی طرح جھک کر سلام پیش کیا۔ آنکھوں سے امامؑ کے قدموں کو چوم لیا۔ امامؑ نے جب دیکھا کہ کوئی ان کا

جاں نثار آیا ہے تو شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ جناب زعفر نے ہاتھوں کو جوڑ کر پوچھا: "یا امامؑ! آپ نے مجھے پہچانا؟" امامؑ نے فرمایا: "ہر چند کہ اس وقت میری نگاہیں بہت کمزور ہو گئی ہیں لیکن میں نے تجھے پہچان لیا ہے بلکہ میں تیرے باپ دادا کو بھی جانتا ہوں۔ ہم اپنے دوستوں کو جانتے ہیں۔ تو زعفرِ جن ہے ہم تجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔

اب جناب زعفر امامؑ سے درخواست کرتے ہیں کہ یا امامؑ ہمیں اپنی نصرت کی اجازت دیجیے۔ حضرت امام حسینؑ زعفر کو جنگ کی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں اب تم ہماری جنگ دیکھو۔ جناب زینبؑ کو جن زعفر کے آنے کی خبر ملتی ہے تو وہ زعفر کے لیے دعا فرماتی ہیں اور کہتی ہیں کے ہمارے غم خوار تو اگر اس وقت نہ آتے تو کون میرے ماں جائے کو بچاتا۔ دشمن میرے ماں جائے کے خون کا پیاسا ہے۔ یہ سن کر جناب زعفر اپنا سر پیٹ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے امامؑ میں آپؑ کے صبر کو دیکھ رہا ہوں، آپؑ کی شجاعت بھی میرے سامنے ہے۔ کاش آپؑ مجھے اپنی نصرت کی اجازت دے دیتے۔ جناب امام حسینؑ نے فرمایا، "اب تیرا واپس چلے جانا ہی بہتر ہے۔ بس میری غربت کو یاد کرنا اور جب پانی پینا تو میری پیاس کو یاد کر لینا، یہ تیرے بہت کام آئے گا۔"

جناب زعفر شکستہ دلی کے ساتھ واپس چلے جاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر اپنی ماں کو پوری تفصیل بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں جناب امام حسینؑ کو ظالموں کے نرغے میں چھوڑ آیا ہوں۔ اس وقت علیؑ و فاطمہؑ کا جگر گوشہ تلواروں میں گھرا ہوا ہے۔ اس پر ماں جناب زعفر کو حکم دیتی ہے کہ فوراً واپس امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو۔ لیکن جب جناب زعفر واپس کربلا پہنچتے ہیں تو اس وقت امام مظلومؑ کا سر تن سے جدا ہو چکا تھا۔ جسمِ مبارک ریت پر تڑپ رہا تھا اور سر نوکِ نیزہ پہ بلند کیا جا چکا تھا۔ ظالم اب خیموں کو لوٹنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

۲۔ مرزا دبیر: "اے مومنو شبیرؑ دو عالم کے شرف ہیں۔"

زعفر اپنے لشکر کے ساتھ کربلا میں پہنچتے ہیں۔ جناب زینبؑ اسے دشمنوں کی کوئی نئی فوج سمجھ کر گھبرا جاتی ہیں مگر امام حسینؑ ان کو تسلی دیتے ہیں:

شہ نے کہا گھبراؤ نہ اے خواہرِ غم خوار — ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ہو لشکرِ کفار
ہر ایک کا نعرہ ہے کہ یا حیدرِ کرار — اغلب ہے کہ یہ لوگ ہوں سب مومن و دیندار

شان ان کی نہیں ملتی ہے طرزِ بشری سے
کیا اس کا عجب ہوئیں جو یہ جن و پری سے

اس فوجِ ظفر موج کی شوکت کو جو دیکھا — لشکر میں لعینوں کے تلاطم ہوا برپا
سردار عجب شکل سے اس فوج کا نکلا — سر ننگے گریبان دریدہ کیے اپنا

رونے میں یہ آواز تھی اس اہلِ وفا کی
زندہ ہیں کہ رحلت ہوئی شاہِ شہدا کی

اب زعفر امام مظلومؑ کو بتاتے ہیں کہ:

''زعفر'' ہوں میں اک بندۂ ناچیز تمہارا۔ اس وقت سنا حال جو حضرت کا قضارا۔
امداد کو حاضر ہوا لشکر لیے سارا۔

۳۔ میر مونسؒ نے بھی جناب زعفر جن کے کربلا پہنچنے اور امامِ مظلوم کو اپنی مدد کی پیشکش کرنے کو مرثیہ میں نظم کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ عصرِ عاشور ایک جن کربلا کے علاقے سے گزر رہا تھا کہ اسے مقتل نظر آیا۔ وہ فوراً زمین پر اتر آیا۔ لشکر یزید کے لوگوں سے جب اس نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نواسہ اس وقت ہزاروں کے لشکر میں گھرا ہوا ہے تو وہ روتا ہوا جناب زعفر کی خدمت میں حاضر ہوا اور پورا ماجرا ان کے گوش گزار کیا۔ جناب زعفر چونکہ مومن تھے فوراً لشکر لے کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اپنی نصرت کی پیشکش کی۔

امامِ مظلومؑ نے جناب زعفر کی مدد قبول نہیں کی۔ آپؑ امام وقت تھے۔ مصلحت بین تھے۔ جناب زعفر کو لشکر کے طور پر وصیت کی کہ اگر تمہیں شہادت کا مقام نہیں مل سکا ہے تو غم نہ کرو ہم محشر میں تمہاری شفاعت کا وعدہ کرتے ہیں۔ جب محرم کا مہینہ آیا کرے تو تم ہمارا ماتم کیا کرنا۔ آنسو بہا بہا کر ہماری مظلومیت بیان کیا کرنا۔ ہمارے نام کی سبیلیں رکھا کرنا۔ القصہ جناب زعفر دل گرفتہ کربلا سے واپس چلے گئے اور امام مظلوم کی شہادت واقع ہو گئی۔

سب سے زیادہ تفصیل سے جناب زعفر جن کا احوال میر حسین میرزا عشق نے اپنے مرثیے "عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو" میں بیان کیا ہے۔ یہ مرثیہ ترتیب واقعات، بیانیے، زبان اور مکالموں کے لحاظ سے اردو کے بہترین مرثیوں میں سے ایک ہے اور جناب زعفر جن کے حال میں اردو کا بہترین مرثیہ ہے۔ اس مرثیے کی انفرادی خصوصیت اس میں راویوں کا پیچیدہ نظام ہے۔ میر عشق نے آٹھ راویوں کی مدد سے مرثیے کی استخواں بندی کی ہے۔ یہ راوی حسب ذیل ہیں:

پہلے اور دوسرے راوی بالترتیب حضرت امام حسین اور حضرت امام زین العابدین علیہم السلام، جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔

تیسرے راوی: مرثیہ نگار (میر عشق): مناجات، کربلا کا منظر۔

یہ مرثیہ مناجاتِ الٰہی سے شروع ہوتا ہے۔ حمد و ثنا کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی کربلا آمد کا بیان ہے۔ اس کے بعد جناب زعفر جن کی میدانِ کربلا میں آنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی امام مظلومؑ سے التجا اور اپنی مدد کی پیش کش کا حال بیان کرنے اور اس کے بعد امامؑ کے مدد قبول نہ کرنے کے واقعہ کو رقم کیا گیا ہے۔

چوتھے راوی: ایک عالمِ متبحر، جو بتاتے ہیں کہ انہیں خراسان کے کتب خانۂ امام رضاؑ میں ایک کتاب ملی جس میں جناب زعفر جن کا حال لکھا تھا۔

پانچویں راوی: اس کتاب کے مصنف جو لکھتے ہیں کہ:

"محبِ حسینؑ کا تھا کوئی عاقبت اندیش۔ نئے طریق سے ناقل ہے وہ صداقت کیش۔"

چھٹے راوی: وہ محبِ حسینؑ جو اپنے سمندری سفر اور ویران جزیرے میں پہنچنے اور زعفر سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔ کتاب کے مصنف لکھتے ہیں کہ ایک محبِ حسینؑ دریا کا سفر کر رہے تھے۔ ناگہاں ان کا سفینہ طوفان سے دوچار ہو گیا۔ کشتی تباہ ہو گئی اور تمام ساتھی دریا میں ڈوب گئے۔ یہ تن تنہا ایک تختہ کے سہارے بہتے بہتے کنارے آ لگے۔ تختہ سے اتر کے دیکھا تو وہ جگہ ایک جزیرہ تھی۔ اس خطۂ زمین پر نہ کوئی درخت تھا نہ آدم نہ آدم زاد۔ حیران و پریشان یہ ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر ایک عجیب و غریب شخص

پر پڑی جو زمین پر بیٹھا تھا اور بہت مغموم و افسردہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ڈرتے ڈرتے اس کی پشت پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ زمین پر انگلی سے "حسین" لکھتا ہے اور زار و قطار روتا ہے۔

ساتویں راوی: جنوں کی جماعت جو زعفر کو معرکہ کربلا کی خبر دیتی ہے۔

جناب زعفر بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے گھر میں ایک جشن کی خوشیوں میں مشغول تھا: "کہ ناگہاں کئی جن آئے بے قرار وہاں" انہوں نے بتایا کہ: "چلی حسین علیہ السلام سے تلوار" "وہ صبح سے لاشے اٹھا کے لاتے ہیں اور "لڑے حسینؑ بہتر لڑائیاں اب تک۔" "اس وقت حال یہ ہے کہ اہلِ حرم کے نالے بلند ہیں، سامنے گود کے پالوں کے لاشے پڑے ہیں اور "خطر ہے دشتِ مصیبت میں دن کے ڈھلنے کا ا سوئے حسینؑ یہ موقع ہے سر سے چلنے کا۔"

آٹھویں راوی: جناب زعفر جن خود جو محب حسینؑ کے اصرار پر اپنا حال اور کربلا کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ جناب زعفر جن کو راوی نے نہیں پہچانا۔ البتہ یہ اندازا ہوا کہ یہ کوئی عاشقِ حسینؑ ہیں۔ سلام کے بعد انہوں نے اُن کا نام و وطن دریافت کیا تو انہوں نے حیرانی سے اِن کا نام و وطن پوچھا کہ اس خطہ میں تو کوئی اللہ کا بندہ موجود نہیں تھا۔ آپ کہاں سے آ گئے؟ راوی نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور ان کا احوال پھر دریافت کیا۔ جناب زعفر نے فرمایا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا تمام جن و بشر کو صدمہ ہے۔ میں بھی ان کا عزادار ہوں۔ میں نے روز عاشور امامِ مظلومؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مدد پیش کی تھی مگر آقا نے میری مدد قبول نہ کی۔ میں نے جس مظلومی میں امامؑ کو دیکھا ہے وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ تب سے میں گریاں و پریشاں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

"جو اشک تھمتے ہیں تو بے قرار ہوتا ہوں اِیہ نام اس لیے لکھتا ہوں اور روتا ہوں۔"

ماخذ:

کتاب، "منتخب مضامین" از جناب نیّر مسعود صاحب مرحوم ساکن لکھنؤ، یو۔ پی۔ بھارت۔

اہم مضامین

حضرت علیؑ کی چاہت

انیس سو ستر کی دہائی کی بات ہے، جب پاکستان میں ٹی وی عام نہیں ہوا تھا البتہ ریڈیو پاکستان کی گونج چپہ چپہ پر تھی۔ اس زمانے میں ایک دھمال نشر ہوا کرتی تھی: "دمادم مست قلندر، علی دا پہلا نمبر، سخی شہباز قلندر۔" کچھ دنوں تک یہ ریڈیو سے متواتر نشر ہوتی رہی۔ پھر کچھ لوگوں کے کان کھڑے ہوئے کہ "علی دا پہلا نمبر" کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیا میں صرف ڈھائی قلندر گذرے ہیں، جس میں حضرت علیؑ پہلے ہیں اور دوسرے حضرت شہباز قلندرؒ۔ مگر یہ تفصیل عوام کو تو معلوم نہیں تھی۔ ارباب ریڈیو کے کان بھرے گئے کہ "علی دا پہلا نمبر" کہنے سے کسی کی ہورہی ہے۔ چنانچہ اور یجنل دھمال پر پابندی لگ گئی اور دو نمبر کی دھمال نشر ہونے لگی۔ جس میں "علی دا پہلا نمبر" والا فقرہ حذف کردیا گیا۔ آج اس واقعے کو سوچتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ کیا اس دھمال کے نشر پر پابندی سے علیؑ کا نمبر پیچھے چلا گیا؟ یا علیؑ کو رسولؐ کے بعد پہلا خلیفہ یا علیؑ کو سلسلہ امامت کا پہلا امام ماننے والوں کے عقیدے میں کوئی تبدیلی آگئی؟

مگر وہ بچ کیا جو سر چڑھ کر نہ بولے۔ ہم نے کتابیں کھنگالیں اور دیکھا کہ علیؑ کا کہاں کہاں پہلا نمبر ہے۔ قرآن ہمارے سامنے ہے۔ احادیث کی کتابیں لائبریریوں میں بھری پڑی ہیں۔ جب ان سے استنباط کیا تو معلوم ہوا کہ ہر جگہ علیؑ کا "پہلا نمبر" ہی ہے۔ کوئی جنگ ہو، اہلِ تصوف کا سلسلۂ چشتیہ ہو، کوئی خاص ایونٹ (مثلاً دعوتِ ذوالعشیرہ، اعلانِ غدیر، اعلانِ آیۂ برأۃ)، ولادت خانۂ کعبہ، نزولِ آیۂ ولایت، آیۂ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ، آیۂ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا... ہو، ان کا پہلا ہی نمبر ہے۔ ان کی چاہت کے قصے تاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔ آیئے! اس کے لئے ہم صرف استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ کی چند تقاریر پر مبنی ایک مختصری

کتاب "جاذبہ ودافعہ علیؑ" مطبوعہ دارالثقلین، کراچی سے استفادہ کرتے ہیں:

علیؑ دلوں کے محبوب اور انسانوں کے معشوق ہیں۔ کیوں؟ کس لحاظ سے؟ علیؑ میں کون سی غیر معمولی چیز ہے جو عشق کو ابھارتی ہے، دلوں کو اپنا شیدا بناتی ہے اور جس نے ابدیت کا رنگ اختیار کیا ہے اور ہمیشہ زندہ ہے؟

حضرت علیؑ اس لئے محبوب ہیں کہ آپ اللہ سے وابستہ ہیں۔ ہمارے دل لاشعوری طور پر اپنی گہرائیوں میں حق سے پیوستہ ہیں اور کیونکہ ہم علیؑ کو حق کی عظیم آیت اور صفات حق کا مظہر سمجھتے ہیں، اس لئے ان سے محبت کرتے ہیں۔ درحقیقت علیؑ سے عشق کا سبب حق کے ساتھ روح کا وہ رشتہ ہے جو ہمیشہ کے لئے فطرت میں ودیعت کردیا گیا ہے اور کیونکہ فطرتیں جاودانی ہیں لہٰذا علیؑ کی محبت بھی جاوداں ہے۔ حضرت علیؑ کے وجود میں بکثرت روشن پہلو پائے جاتے ہیں لیکن جس چیز نے انہیں ہمیشہ روشن اور پرنور بنا رکھا ہے وہ ان کا ایمان اور اخلاص ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے انہیں جذبۂ الٰہی عطا کیا ہے۔

حبِ علیؑ قرآن اور سنت کی روشنی میں:۔

قرآن مجید گزشتہ انبیا کی بات نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان سب (انبیا) نے کہا: "ہم لوگوں سے کوئی اجر نہیں چاہتے، ہمارا اجر صرف اللہ کے ذمے ہے۔" لیکن اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، سوائے اپنے قربیٰ سے محبت کے، اور جو شخص نیکی حاصل کرے گا ہم اس کے لئے اس کی خوبی میں اضافہ کردیں گے۔" سورۂ شوریٰ ۴۲۔ آیت ۲۳۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام پیغمبروں نے کسی اجر کا مطالبہ نہیں کیا، لیکن نبی اکرمؐ نے اپنی رسالت کے اجر کا مطالبہ کیا، اور لوگوں سے اپنے قربیٰ کی محبت بطور اجر رسالت طلب فرمائی؟

خود قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے:

"کہہ دیجئے کہ جو اجر میں نے مانگا ہے، اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے، میرا اجر صرف اللہ کے پاس ہے۔" (سورۂ سبا ۳۴، آیت ۴۷)۔ یعنی میں نے جو کچھ اجر رسالت

کے طور پر طلب کیا ہے، اس کا فائدہ تمہیں پہونچے گا، مجھے نہیں۔ یہ محبت خود تمہاری اصلاح اور تکامل کے لئے ایک کمند ہے۔ اس کا نام "اجر" ہے۔ لیکن درحقیقت ایسی بھلائی ہے جو میں خود تمہارے لئے تجویز کر رہا ہوں۔ اس اعتبار سے کہ اہلِ بیت اور پیغمبرؐ کے قربیٰ وہ لوگ ہیں جو آلودگی کے نزدیک نہیں جاتے اور جن کا دامن پاک و پاکیزہ ہے۔ جو طہارت و پاکیزگی کا خزینہ ہیں۔ ان کے ساتھ عشق و محبت سے حق کی اطاعت اور فضائل کی پیروی کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، اور ان کی محبت ہی ہے جو اکسیر کی طرح ماہیت تبدیل کرتی اور کامل بناتی ہے۔

"قربیٰ" سے مراد جو بھی ہو، یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس کا واضح ترین مصداق جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

"زمخشری نے کشاف میں روایت کی ہے: "جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا: یا رسول اللہؐ وہ قرابت دار کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: علیؑ و فاطمہؑ اور ان کی اولاد۔"

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چار افراد پیغمبرؐ کے "قربیٰ" ہیں اور لوگوں کے لئے ان سے محبت اور ان کا احترام واجب ہے۔ اس بارے میں مختلف پہلوؤں سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرم حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور فرماتے تھے: "فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، جو اسے آزار پہنچائے وہ مجھے آزار پہونچاتا ہے۔" اور علیؑ و حسنینؑ سے بھی محبت فرماتے تھے، جیسے کہ اس بارے میں کثرت سے اور متواتر روایات آئی ہیں۔ پس ان کی محبت ساری امت پر فرض ہے۔ پیغمبرؐ کی ان سے محبت شخصی اور ذاتی پہلو نہیں رکھتی۔ یعنی صرف اس لئے نہیں ہے کہ مثلاً آپ کی اولاد یا اولاد کی اولاد ہیں۔ اور یہ کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو آپؐ ان سے محبت کرتے۔ بلکہ پیغمبرؐ اس لئے ان سے محبت

کرتے تھے کہ وہ مثالی افراد تھے اور اللہ ان کو پسند کرتا تھا، ورنہ پیغمبرؐ کی اور بھی اولادیں تھیں جن سے نہ خود آپ کو اس طرح کی محبت تھی اور نہ ہی امت پر ان کی محبت اس طرح فرض کی گئی۔ قرآن فرماتا ہے: "پیغمبرؐ کی پیروی کرو شاید ہدایت پا جاؤ۔" (اعراف ۷۔ آیت ۱۵۸) اور پھر فرماتا ہے: "تمہارے لئے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔" (احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱)۔ یہ سب آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ تمام مسلمانوں پر آلِ محمدؐ، جو علیؑ و فاطمہؑ اور حسنین علیہم السلام ہیں، کی محبت واجب ہے۔ (تفسیر کبیر فخر الدین رازی۔ ج ۲۷ ص ۱۲۶۔ طبع مصر)۔

ابنِ اثیر نقل کرتے ہیں: پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا: "اے علیؑ! اللہ نے تمہیں ایسی چیزوں سے زینت دی ہے کہ اس کے بندوں کے نزدیک ان سے زیادہ محبوب اور کوئی زینت نہیں ہے۔ تمہارے لئے اس طرح دنیا سے کنارہ کشی قرار دی کہ نہ تم دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اٹھاؤ اور نہ دنیا تم سے فائدہ اٹھا سکے، تمہیں مساکین کی محبت سے نوازا، وہ تمہاری امامت سے خوش ہیں اور تم ان کی اطاعت و پیروی پر راضی۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ شخص جو تم سے محبت کرتا ہے اور تمہاری محبت میں سچا ہے اور وائے ہو اس پر جو تم سے دشمنی رکھتا ہے اور تمہارے خلاف جھوٹ بولتا ہے۔" (اسد الغابہ۔ ج ۴ ص ۲۳)۔

سیوطی نے روایت کی ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: "علیؑ کی دوستی ایمان ہے اور ان سے دشمنی نفاق۔" (کنز العمال۔ جمع الجوامع سیوطی۔ ج ۶۔ ص ۱۵۶)

ابو نعیم سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

"کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز سے آگاہ کروں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے فرمایا: "یہ علیؑ ہیں، ان سے محبت کرو جس طرح مجھ سے محبت کرتے ہو اور ان کا احترام کرو جیسے میرا احترام کرتے ہو، کیوں کہ اللہ نے جبرئیل کے ذریعے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہ بات تمہیں بتا دوں۔" (حلیۃ الاولیاء۔ ج ۱۔ ص ۶۳)۔

محب طبری حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "میں نے اپنے

والد کو دیکھا کہ وہ کثرت سے علیؑ کے چہرے کی طرف دیکھا کرتے ہیں، میں نے کہا: باباجان! میں دیکھتی ہوں کہ آپ علیؑ کے چہرے کی طرف بہت زیادہ دیکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: اے بیٹی! میں نے پیغمبرؐ سے سنا ہے کہ: "علیؑ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔"

(الریاض النضرہ۔ ج ۲ص ۲۱۹)

ابن حجر حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: "میرے بھائیوں میں بہترین بھائی علیؑ ہے اور چچاؤں میں بہترین چچا حمزہؓ ہیں۔ علیؑ کا ذکر اور ان کے بارے میں گفتگو عبادت ہے۔" (صواعق محرقہ۔ ص ۷۴)۔

حضرت علیؑ خدا اور رسولؐ کے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب فرد تھے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ محبوبوں میں سے بہترین محبوب تھے۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں: "ہر روز انصار کی اولاد میں سے ایک شخص پیغمبرؐ کے کاموں کو انجام دیا کرتا تھا۔ ایک دن میری باری تھی۔ امِ ایمن نے ایک بُھنا ہوا پرندہ پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ میں نے خود اس پرندے کو پکڑا ہے اور آپ کی خاطر پکایا ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا: خدایا! اپنے محبوب ترین بندے کو بھیج جو اس غذا میں میرے ساتھ شریک ہو۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: انسؓ دروازہ کھولو۔ میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ خدا کرے کوئی انصاری ہو، لیکن دیکھا کہ علیؑ ہیں۔ میں نے ان سے کہا: پیغمبرؐ مصروف ہیں اور واپس آکر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: دروازہ کھولو۔ میں پھر دعا کر رہا تھا کہ کوئی انصاری ہو۔ میں نے دروازہ کھولا تو دوبارا علیؑ تھے۔ میں نے پھر ان سے کہا کہ پیغمبرؐ مصروف ہیں اور اپنی جگہ واپس آگیا۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: انسؓ دروازہ کھولو اور انہیں گھر میں لے آؤ، تم پہلے شخص نہیں ہو جسے اپنی قوم سے محبت ہے، آنے والا انصاری نہیں ہے۔ میں گیا اور علیؑ کو گھر میں لے آیا اور انہوں نے پیغمبرؐ کے ساتھ بھنا ہوا پرندہ تناول کیا۔" (مستدرک صحیحین۔ ج ۳ص ۱۳۱)۔

یہاں صرف چند حوالے دیئے گئے ہیں ورنہ آیات قرآنی اور متفق علیہ احادیث کی

ایک طویل فہرست ہے جن سے حضرت علیؑ کی اولیت ثابت ہے۔ آیئے اب ان عشاقِ علیؑ کے واقعات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں جنھوں نے جانوں پر کھیل کر علیؑ کی چاہت کا ثبوت پیش کیا۔

۱۔ شخصیات کی موت کے ساتھ ہی ان سے متعلق ساری چیزیں مرجاتی ہیں اور ان کے جسم کے ساتھ زمین میں دفن ہوجاتی ہیں۔ جب کہ مردانِ حق خود مرجاتے ہیں لیکن ان کا مکتب اور ان کا پیدا کردہ عشق زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ پر رونق ہوتا چلا جاتا ہے۔ حضرت علیؑ کے عاشقوں میں سے ایک میثم تمار بھی تھے جو مولا کی شہادت کے بیس برس بعد سولی پر آپؑ کے فضائل اور بلند انسانی اوصاف بیان کرتے ہیں۔ ان دنوں میں جب کہ پوری اسلامی دنیا گھٹن کا شکار تھی، تمام آزادیاں سلب اور سانسیں سینوں میں گھونٹ دی گئی تھیں، وحشتناک سکوت، غبارِ موت کی مانند ہر سو پھیلا ہوا تھا، وہ تختۂ دار سے پکارتے ہیں کہ آؤ میں تمھیں علیؑ کے بارے میں بتاؤں! لوگ ان کی باتیں سننے کے لئے چاروں طرف سے امنڈ پڑتے ہیں۔ بنی امیہ کی زرہ پوش حکومت اپنے مفاد کو خطرے میں دیکھ کر حکم صادر کرتی ہے کہ میثم کا منہ بند کر دیا جائے اور وہ چند دنوں کے بعد میثم کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

۲۔ "ابن سکیت" نامی ایک شخص ہے جس کا شمار عربی ادب کے نامور علما میں ہوتا ہے اور آج بھی عربی ادب کے صاحبِ نظر افراد میں "سیبویہ" جیسے لوگوں کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا ہے۔ ابن سکیت عباسی خلیفہ متوکل کے زمانے میں ہوا کرتے تھے (حضرت علیؑ کی شہادت کے تقریباً دو سو سال بعد) متوکل کے دربار میں وہ شیعہ ہونے کے حوالے سے متہم تھے، لیکن چونکہ نہایت قابل اور ممتاز عالم تھے، اس لئے متوکل نے انہیں اپنے بچوں کو پڑھانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ ایک دن جب متوکل کے بچے اس کے پاس آئے تو اس موقع پر ابن سکیت کی کارکردگی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یا شاید اس نے پہلے سے ان کے بارے میں جو سن رکھا تھا کہ وہ شیعیت کی طرف مائل ہیں، اس بنا پر ابن سکیت سے پوچھا کہ میرے دونوں بچے تمھارے نزدیک زیادہ محبوب ہیں یا علیؑ کے فرزند حسنؑ اور

حسینؑ؟ اس جملے اور اس موازنے پر ابن سکیت کو جوش آ گیا اور ان کا خون کھولنے لگا۔ وہ سوچنے لگے کہ اس شخص کا غرور اس درجے تک پہونچ گیا ہے کہ یہ اپنے بچوں کا حسنؑ اور حسینؑ کے ساتھ موازنہ کرتا ہے؟ یہ میرا قصور ہے کہ میں نے ان کی تعلیم کے ذمہ داری قبول کی۔ انہوں نے متوکل کے جواب میں کہا: ''خدا کی قسم علیؑ کا غلام قنبرؓ میرے نزدیک ان دونوں بچوں اور ان کے باپ سے کہیں زیادہ محبوب ہے۔'' یہ سن کر متوکل نے فی الفور حکم دیا کہ ابن سکیت کی زبان پشت گردن سے کھینچ لی جائے۔

۳۔ امیر المومنین حضرت علیؑ کے چاہنے والوں میں ایک با فضیلت اور با ایمان شخص تھا، افسوس کہ اس سے ایک لغزش سرزد ہو گئی اور اس پر حد جاری کرنا ضروری ہو گیا۔ امیر المومنینؑ نے اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس نے اس (کٹے ہوئے ہاتھ) کو بائیں ہاتھ سے پکڑا، اس سے خون ٹپک رہا تھا اور وہ اسے لئے جا رہا تھا کہ سرکش خارجی ابن الکواء نے اس موقع سے اپنے گروہ کے حق میں اور علیؑ کے خلاف فائدہ اٹھانا چاہا، لہٰذا ہمدردانہ شکل بنا کر اس کے سامنے گیا اور کہنے لگا: تمہارا ہاتھ کس نے قطع کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: ''میرا ہاتھ پیغمبروں کے جانشینوں کے سردار، قیامت کے دن سرخرو ہونے والوں کے پیشوا، مومنوں پر سب سے زیادہ حق رکھنے والے علی ابن ابی طالبؑ، ہدایت کے امام، نعمت والی جنتوں کی طرف پہل کرنے والے، بہادروں کا مقابلہ کرنے والے، جاہلوں سے انتقام لینے والے، زکات ادا کرنے والے۔۔۔۔ رشد و کمال کا راستہ دکھانے والے، سچ بات کہنے والے، مکہ کے شجاع اور بزرگوار باوفا نے قطع کیا ہے۔۔۔۔ ابن الکواء نے کہا: افسوس ہے تم پر! انہوں نے تمہارا ہاتھ کاٹ دیا اور تم ان کی اس طرح تعریفیں بیان کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا ''میں کیوں نہ ان کی تعریف کروں؟ جب کہ ان کی محبت میرے گوشت اور خون میں گندھ چکی ہے! قسم اللہ کی انہوں نے میرا ہاتھ اللہ کے مقرر کردہ قانون کے تحت قطع کیا ہے۔''

۴۔ حضرت علیؑ کی ایک فداکار اور محبّ خاتون ''سودہ ہمدانی'' نے معاویہ کے سامنے حضرت علیؑ پر درود بھیجا اور ان کی شان میں کہا: ''اللہ کی رحمت ہو اس وجود پر جسے مٹی نے

ڈھانپ لیا اور اس کے ساتھ ہی عدل بھی دفن ہو گیا۔ اس نے حق کے ساتھ عہد کیا تھا کہ وہ (حق کے سوا) کسی چیز کو نہیں اپنائے گا، پس وہ حق اور ایمان کے قریب ہوا۔"

۵۔ صعصہ بن صوحان عبدی بھی حضرت علیؑ کے عاشقوں میں سے ایک تھے۔ وہ ان چند لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے اس رات علیؑ کی تدفین میں شرکت کی تھی۔ حضرتؑ کو دفن کرنے اور ان کے جسم مبارک کو خاک تلے چھپانے کے بعد صعصہ نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر مارا اور دوسرے ہاتھ سے سر پر خاک ڈالتے ہوئے کہا: "آپ کو موت مبارک ہو! آپ کی جائے ولادت پاک تھی، آپ کا صبر قوی اور جہاد عظیم تھا۔ آپ نے سوچ پر غلبہ پایا اور آپ کی تجارت نفع بخش رہی۔ آپ اپنے خالق سے جا ملے اور اس نے آپ کو بخوشی قبول کیا اور اس کے فرشتے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ کو پیغمبرؐ کی ہمسائگی نصیب ہوئی اور اللہ نے آپ کو اپنے قرب میں جگہ عطا فرمائی، اور آپ اپنے بھائی محمد مصطفیٰؐ کے جوار میں پہونچے اور ان کے بھرے ہوئے جام سے سیراب ہوئے۔ ہم اللہ سے چاہتے ہیں کہ آپ کی پیروی کریں اور آپ کے طریقوں پر عمل کریں، آپ کے دوستوں سے دوستی کریں اور آپ کے دشمنوں سے دشمنی رکھیں اور آپ کے دوستوں کے ساتھ محشور ہوں۔

آپ نے وہ پا لیا جو دوسرے نہ پا سکے اور وہاں پہونچے جہاں دوسرے نہ پہونچ سکے۔ آپ نے اپنے بھائی پیغمبرؐ کے ہمراہ جہاد کیا اور اللہ کے دین کے لئے شایان شان طریقے سے قیام کیا۔ آپ نے سنتوں کو قائم کیا، خرابیوں کی اصلاح کی، یہاں تک کہ ایمان و اسلام منظم ہو گئے۔ آپ پر بہترین درود ہوں۔ آپ کے ذریعہ سے مومنوں کی پشت مضبوط ہوئی، راہیں روشن اور سنتیں قائم ہوئیں۔ کوئی بھی اپنے اندر آپ جیسی رفعتوں اور فضیلتوں کو اکٹھا نہ کر سکا۔ آپ نے پیغمبرؐ کی صدا پر لبیک کہا اور اس میں دوسروں پر سبقت حاصل کی۔ آپ ان کی نصرت کے لئے لپکے اور اپنی جان سے ان کی حفاظت کی۔ خوف و خطر کے موقعوں پر اپنی شمشیر ذوالفقار سے حملے کئے اور ظالموں کی کمر توڑ ڈالی۔ کفر اور شرک کی بنیادوں کو مسمار کیا اور گمراہوں کو خاک و خون میں غلطاں کیا۔ پس مبارک ہو اے مومنوں

کے سردار۔ آپ لوگوں میں سب سے زیادہ پیغمبرؐ کے قریب تھے۔ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام اپنایا۔ آپ یقین سے سرشار، قوی دل اور سب سے زیادہ فداکار تھے۔ آپ کا حصہ نیکی میں زیادہ تھا۔ اللہ ہمیں آپ کی مصیبت کے اجر سے محروم نہ کرے اور آپ کے بعد ہمیں خوار نہ کرے۔

قسم اللہ کی آپ کی زندگی نیکیوں کی کنجی تھی اور شر کے لئے قفل۔ آپ کی موت ہر شر کے لئے چابی ہے اور ہر خیر کے لئے قفل۔ اگر لوگ آپ کو قبول کر لیتے تو ان پر زمین و آسمان سے نعمتوں کی بارش ہوتی۔ لیکن انہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو منتخب کیا۔"

حضرت علی علیہ السلام ایسے دوستوں اور محبت سے سرشار دیوانوں کے حوالے سے بے مثال ہیں جنہوں نے ان کی محبت اور ولا میں جان کی بازی لگائی اور جو سولی پر چڑھ گئے۔ ایسے لوگوں کے حیرت انگیز واقعات بیان کرنے پر تاریخ اسلام کے صفحات فخر کرتے ہیں۔ زیاد بن ابیہ، اس کا بیٹا عبید اللہ، حجاج ابن یوسف، متوکل عباسی اور سب سے بڑھ کر معاویہ ابن ابی سفیان جیسے لوگوں کے ہاتھ کہنیوں تک انسانیت کے ان اعلیٰ نمونوں کے خون سے آلودہ ہیں۔

تڑپانے والی باتیں

ماہِ محرم شروع ہوتے ہی درسِ حسینی کا سلسلہ گھر گھر، قریہ قریہ، شہر شہر پوری دنیا میں جاری ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ماہ میں حسینؑ کا غم کیوں منایا جاتا ہے، کیوں اتنی مجالس، جلسے، جلوس، عزاداری وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ کیا کسی ضد میں؟ کسی دشمنی میں؟ یا کسی کو دکھانے کے لئے ایسا کیا جاتا ہے؟ جواب نفی میں ہوگا۔ کیوں کہ یہ کام آج سے نہیں، چودہ سو سال سے جاری و ساری ہے۔ یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ غمِ حسینؑ صرف مسلمان یا ایک مکتبہ فکر کے لوگ ہی نہیں مناتے بلکہ بہت سے غیر مسلم بھی اس غم کو تزک و احتشام اور عقیدت سے مناتے ہیں۔ اگر یہ کام کسی ضد، دشمنی یا دکھاوے کے لئے ہوتا تو یقیناً کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ المیہ کربلا کی یاد منانے کا سلسلہ صدیوں سے نہ صرف جاری و ساری ہے بلکہ اس میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے تو یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیشتر انسانوں کو اور مسلمانوں کو بالخصوص دردمند دل سے نوازا ہے۔ صاحبانِ ایمان حضور اکرمؐ سے محبت کرتے ہیں، عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے کنبے اور ان کے متعلقین سے بھی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ حضور اکرم کی زندگی میں نہ صرف ان کے مشن میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے بلکہ ان کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی تن من دھن سے دین اسلام کی بقاء کے لئے جدوجہد کرتے رہے، قربانیاں دیتے رہے۔ ان لوگوں کو حضور اکرم کی ذات بابرکت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

امام حسینؑ کا معاملہ اس لئے بھی مختلف ہے کہ آپ نے ایسے حالات میں اپنی، اپنے اہلِ خانہ اور اپنے جاں نثاروں کی قربانی پیش کی جب کہ باطل پورے زور و شور سے دین اسلام کو مٹانے کے درپے تھا۔ صبر و ضبط، ایثار اور مظلومیت کی ایسی مثال تاریخ میں ناپید

ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ فرما رہا تھا "حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور حقیقت یہ ہے کہ باطل تو مٹنے ہی کے لئے ہوتا ہے" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۸۱) جب کہ دشمنان اسلام سمجھ رہے تھے کہ حضورؐ کے جانے کے بعد اسلام چلا جائے گا اور عہد جاہلیت یا باطل واپس آجائے گا۔ ظاہر ہے فتح اللہ کے فرمان ہی کی ہونی تھی، سو ہوئی اور اس کا ذریعہ حسینؑ کی عظیم قربانی بنی۔

امام حسینؑ پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اس مضمون میں صرف ان باتوں کا ذکر مقصود ہے جو حسینؑ کے حوالے سے دل کو بہت تڑپاتی ہیں۔ جب بھی انہیں سنا جائے، پڑھا جائے، سوچا جائے دل تڑپ تڑپ جاتا ہے، روح بے چین ہو جاتی ہے اور آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔

امام حسینؑ کی شہادت کی خبر نہ صرف ان کی ولادت سے قبل اور ان کی کم سنی میں حضور اکرم کو سب کے سامنے جناب جبرئیل امین نے دے دی تھی، جس سے آپؐ بہت رنجیدہ ہوئے اور اعلانیہ گریہ فرمایا۔ اس ضمن میں بہت سی روایات خود حضور اکرمؐ، جناب فاطمہؑ، حضرت علیؑ، جناب عائشہ اور بہت سے صحابہ اکرام سے منسوب ہیں۔ ان میں سے صرف ایک روایت:

جناب ام سلمٰی فرماتی ہیں کہ ایک دن حضور اکرمؐ میرے گھر میں تھے اور حسینؑ میرے پاس تھے۔ جب حسینؑ نے حضورؐ کے پاس جانا چاہا تو میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، اس پر حسینؑ رونے لگے تو میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ انہوں نے پھر رسول کی طرف جانا چاہا تو میں نے انہیں پھر روکنے کی کوشش کی اور وہ پھر رو پڑے۔ اب میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ اس پر جبرئیل نے حضورؐ سے پوچھا کہ کیا آپ اس بچے کو بہت چاہتے ہیں؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا تو جبرئیل نے کہا کہ آپ کی امت اسے قتل کرے گی اور اگر آپ چاہیں تو میں اس زمین کی مٹی آپ کو دکھلا دوں جس پر یہ قتل ہوگا۔ پھر جبرئیل نے اپنا بازو پھیلایا اور اس زمین کی مٹی آپ کو دکھلا دی، جس پر آپ نے گریہ فرمایا۔

حسینؑ کے نام پر تڑپا دینے والی یہ پہلی بات ہے۔ یعنی غمِ حسین پر آزردہ اور گریہ کناں ہونا سنت رسولؐ ہے۔

سب جانتے ہیں حضورؐ اپنی بیٹی جناب فاطمہؑ پر جان نچھاور کیا کرتے تھے۔ ان کو اپنا ٹکڑا کہتے تھے۔ ان کے بچوں کو ہر وقت اپنی نگاہِ شفقت میں رکھتے تھے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ سن ۱۱ ہجری میں جبکہ حسینؑ صرف سات آٹھ سال کے تھے، حضورؐ کی وفات پر کتنا مغموم ہوئے ہوں گے۔ غالباً حسینؑ کی زندگی میں یہ سب سے پہلا بڑا صدمہ تھا۔ ابھی نانا کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ شفیق ماں کچھ باپ کی جدائی کا غم کچھ لوگوں کے سلوک کی وجہ سے جہانِ فانی سے منہ موڑ گئی۔ یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو چند ہی ماہ کے وقفہ سے کم سن حسینؑ پر آن پڑا۔ امت نے حضورؐ کے فرمودات کو بھلا دیا اور اس کنبہ سے ایسی بے اعتنائی برتی جیسے کہ یہ حضورؐ کے کچھ نہیں لگتے تھے اور ان کے بارے میں نہ قرآن میں کچھ آیا ہے نہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔

باپ کی خلافت کے مختصر عرصہ میں بے شمار فتنے اٹھائے گئے، جنگیں مسلط کی گئیں اور بالآخر باپ کو بھی راستے سے ہٹانے کے لئے عین حالتِ نماز و روزہ میں مسجدِ کوفہ میں ضرب مسموم سے شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھائی کی امامت کا دور شروع ہوتے ہی اسے بھی یکہ و تنہا کر دیا گیا اور سازش کر کے گھر کے ہی ایک فرد کے ذریعہ زہر ہلاہل پلا کر شہید کروا دیا۔ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ نے خاموشی سے فرائض امامت یعنی دین کی حفاظت کا فریضہ سنبھالا۔ چونکہ امام وقت تھے اس لئے امت کے مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی ان کا ارادت مند تھا اس کی خاص طور پر اور امت کی عمومی طور پر اپنے تدبر اور حکمت سے رہبری کرتے رہے البتہ تخت وتاج وحکومت سے بے اعتنا رہے۔

صلح حسنؑ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جب یزید کو شام کا حاکم بنایا گیا تب بھی آپ نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن جب آپ کی خاموشی کو آپ کی کمزوری سمجھا جانے لگا اور یزید جیسے بدنہاد سے بیعت کا سوال کیا جانے لگا تو آپ نے للکار کے کہا:

......ہم اہل بیت نبوت ہیں، رسالت کا معدن ہیں، ہم فرودگاہ ملائکہ ہیں اور ہم

رحمت کے نزول کا محل ہیں۔ سلسلہ ہدایت کو اللہ نے ہم سے آغاز کیا اور ہم پر ہی اس کا اتمام کیا اور یزید ایک فاسق شرابی ہے، نفس محترم کا قاتل اور اعلانیہ فسق و فجور کرنے والا ہے۔ مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا.........

اس رات حسینؑ قبرِ رسولؐ پر آئے اور نانا سے امت کی شکایت کی۔ دسری رات پھر نانا کی قبرِ مبارک پر حاضری دی اور امت کے سلوک کا گلہ کیا۔ صبح کے قریب قبر مطہر پر سر رکھ دیا روتے روتے آپ کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں نانا کی زیارت کی جس میں انہوں نے تسلی و تشفی کے ساتھ عنقریب اپنے پاس آنے کی خبر دی۔ ۲۸ رجب کو حسینؑ مدینہ سے رخصت ہوئے۔ حسینؑ کی زندگی کا یہ بھی بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ مدینہ، جہاں آپؑ کا بچپن اور عہدِ شباب گزرا تھا۔ جہاں نانا، دادی، ماں اور بھائی کی قبریں تھیں، جہاں ہر طرف سے ان چاہنے والوں کی خوشبوئیں آتی تھیں۔

حسینؑ کی مظلومیت، بے چارگی اور دکھ کو محسوس کرتے ہوئے کون سا دردمند دل ہوگا جو اس بات پر نہیں تڑپے گا۔

مدینہ سے رخصت کے بعد آپ کے پیش نظر کوفہ تھا، جہاں سے لوگوں کے پے بہ پے خطوط آپ کو وہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ چونکہ حج کا موسم قریب تھا۔ آپ نے مکہ کا عزم کیا۔ قیام مکہ کے دوران کوفہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے امام حسینؑ نے جناب مسلم ابن عقیلؑ کو اپنا سفیر بنا کر وہاں بھیجا۔ لیکن انہیں ابن زیاد نے ظلم و طاقت و سازش سے محصور اور تنہا کر کے بے دردی سے شہید کر دیا۔ پیکرِ صبر و رضا امام حسینؑ نے یہ صدمہ بھی جھیل لیا۔ مکہ میں بھی دشمن نے آپ کو چین سے نہ رہنے دیا۔ حاجیوں کے بھیس میں قاتلوں کو بھیج دیا گیا کہ وہ حرم کعبہ میں نواسۂ رسول کا خون کر دیں۔ بھلا امام مظلومؑ کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ وہ حرم کے تقدس کو پامال ہونے کا ذریعہ بنیں چنانچہ آپؑ نے عین عرفہ سے قبل حج کا ارادہ ترک کر کے کوفہ کا عزم کیا۔ یہ بھی امام حسینؑ کا ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ عازمین حج اس دکھ اور کرب کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر عین حج کی تاریخوں میں جب کہ وہ مکہ میں موجود بھی ہو

اسے حج سے روک دیا جائے تو اس پر کیا گزرے گی۔ حسینؑ نے یہ صدمہ بھی جھیلا۔ چشم نم سے حرم مقدس کو مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے اور وادی تنعیم کی سمت بڑھتے جاتے تھے۔ والی مکہ کو جب اطلاع ملی کہ حسینؑ مکہ سے روانہ ہو رہے ہیں تو اپنے بھائی کو ایک دستے کے ساتھ بھیج کر قافلہ کو روکنے کی کوشش کی۔ دونوں طرف سے تازیانوں (کوڑوں) کا استعمال ہوا جس سے قافلہ کے کئی لوگ مجروح ہو گئے۔ مگر حسینؑ کا قافلہ چلتا رہا۔

مختلف منازل سے گزرتے ہوئے حسینؑ کے ساتھ بہت سے انصار و اصحاب ساتھ ہو لئے۔ صفاح کے مقام پر آ کر آپؑ کی ملاقات فرزدقؔ سے ہوئی۔ فرزدقؔ کا بیان ہے کہ میں اپنی والدہ کے ساتھ حج کے لئے مکہ جا رہا تھا۔ حرم کی حدود میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ حسینؑ بن علیؑ اپنے قافلے کے ساتھ مکہ سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے سلام کے بعد عرض کی کہ اللہ آپؑ کی خواہشوں کو پورا فرمائے، آپؑ کو ایسی کیا جلدی ہے کہ حج کو چھوڑ کر تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر جلدی نہ کرتا تو گرفتار ہو جاتا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں ایک عرب ہوں اور اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس سے زیادہ نہ پوچھئے۔ آپؑ نے فرمایا کہ جہاں سے آ رہے ہو وہاں کے لوگوں کے بارے میں کچھ تو بتلاؤ۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ سوال ایک باخبر شخص سے کیا ہے۔ لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ قضا و قدر اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ امامؑ نے فرمایا:

تم نے سچ کہا ہے۔ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور ہر دن اس کی ایک شان ہے اگر اللہ کا فیصلہ وہ ہوا جو ہم چاہتے ہیں اور جو ہماری مرضی کے مطابق ہے تو اس کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور وہی ادائے شکر کی طاقت کا عطا کرنے والا ہے۔ اور اگر اس کا فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو جس کی نیت حق ہو اور تقویٰ اس کا مزاج ہو وہ اپنی خواہشوں سے دور نہیں رہے گا۔ امامؑ نے اس موقع پر کچھ اشعار پڑھے جن کا ترجمہ ہے: اگر دنیا عمدہ اور نفیس شے شمار کی جاتی تو پھر وہ گھر جہاں اللہ سے اجر ملے گا اعلیٰ اور خوب تر ہے۔

اگر بدنوں کو موت ہی کے لئے بنایا گیا ہے تو انسان کا اللہ کی راہ میں تلوار سے قتل ہو جانا بہت برتر و افضل ہے۔ اگر لوگوں کے رزق تقدیر میں ہیں تو پھر انسان کا تلاش رزق میں کم کوشش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اگر اموال کی جمع آوری کے بعد اسے چھوڑ ہی کر جانا ہے تو جو چیز چھوڑی جانے والی ہو اس میں انسان بخل کیوں کرتا ہے۔ اے محمد مصطفیٰؐ کے خاندان والو تم پر اللہ کا سلام ہو۔ میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں کہ عنقریب تم سے رخصت ہو جاؤں گا۔

حسینؑ کا یہ موعظہ اور کلام دل ہلا دینے والا ہے۔ ان الفاظ کے پیچھے معانی اور عرفان کا سمندر ہے، قضاء وقدر کا پورا فلسفہ ہے۔

حسینؑ کوفہ جانا چاہتے تھے لیکن ان کے راستے میں رخنے ڈالے گئے اور مجبوراً انہیں کربلا کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں پہونچتے ہی انہیں احساس ہو گیا کہ یہی ان کی قتل گاہ ہے۔ چاہتے تھے کہ خیمے دریا کے کنارے نصب کئے جائیں لیکن انہیں ایسا نہیں کرنے دیا گیا۔ اللہ اللہ! حسینؑ کے پاس کتنا بڑا دل تھا۔ صبر وضبط کا کیسا جذبہ تھا۔ حج کو عمرہ سے تبدیل کرنا، کوفے کے راستے کو مسدود پا کر کربلا پہونچنا، دریا کے کنارے سے خیمے ہٹا کر دور نصب کرنا اور یہ سب کچھ آنے والے دنوں میں پیش آنے والے حالات کا علم رکھتے ہوئے برداشت کرنا اور بار بار صلح جوئی کا راستہ اختیار کرنا یہ حسینؑ ہی کا حصہ تھا۔ سورۂ والعصر میں خسارے میں نہ رہنے والوں کو چار صفات سے مزین بتایا گیا ہے۔ ایمان، عملِ صالح، حق اور صبر۔ دنیا "صبر" کی کوئی ایسی مثال نہیں پیش کر سکتی ہے جیسی کہ اختیار رکھتے ہوئے حسینؑ نے پیش کی!

صبر، امن اور صلح جوئی امام حسینؑ کو نانا سے ورثہ میں ملی تھی سو آپؑ نے کسی بھی موقعہ پر ان کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

سات محرم کو حسینؑ کے پاس ذخیرۂ آب ختم ہو گیا، دریا پر پہرے سخت کر دیے گئے۔ جانور پانی پی سکتے تھے مگر رسولؐ کے گھرانے والے نہیں۔ حتیٰ کہ نو محرم کا دن آ گیا اور لشکرِ یزید نے حملے کا ارادہ کر لیا۔ امام حسینؑ نے ایک رات کی مہلت دعا اور عبادات کے لئے

طلب کی جو انہیں بے دلی اور طعن و تشنیع کے ساتھ دی گئی۔ اس شب میں چراغوں کو بجھا دیا اور تمام انصار کو ایک مشورہ یہ کہہ کر دیا کہ دشمن صرف ان کے خون کا پیاسا ہے، کسی اور کا نہیں، لہٰذا جو چاہے انہیں چھوڑ کر چلا جائے۔ لیکن انہیں اللہ نے وہ عظیم اور وفادار ترین ناصر عطا کئے تھے کہ کسی نے بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

آپ کی صلح جوئی اور امت کی خیر خواہی کا اندازہ ان کے آخری خطبے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا:

"اے لوگو! میری بات سنو اور جلدی نہ کرو تا کہ میں تمہیں ایسی نصیحت کر دوں جو میرے اوپر تمہارا حق ہے اور میں تم پر اپنے اقدام کا سبب واضح کر دوں۔ اس کے بعد اگر تم نے میرے ساتھ انصاف کیا تو تم سعادت مند ہو اور اگر انصاف نہ کرو تو تم اپنی رائے پر مجتمع ہو کر غور تو کر لو کہ کہیں تمہارا یہ عمل تمہارے غم و اندوہ کا سبب نہ بن جائے۔ اس کے بعد تم میرے بارے میں فیصلہ کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میرا ولی وہ اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے اور وہی نیک افراد کا نگراں اور سرپرست ہے۔

اما بعد! تم میرے نسب پر غور کرو کہ میں کون ہوں اور پھر اپنے نفسوں پر نگاہ ڈالو اور انہیں سرزنش کرو اور پھر غور کرو کہ کیا میرا قتل اور ہتک حرمت تمہارے لئے درست ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کی بیٹی کا بیٹا اور نبیؐ کے وصی کا فرزند نہیں ہوں جو پہلا مومن ہے اور ان باتوں میں رسول کا تصدیق کرنے والا ہے جو وہ اللہ کی طرف سے لائے تھے؟ کیا حمزہ سید الشہداء میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا جنت میں دو پروں سے پرواز کرنے والے جعفر میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا تم تک رسول اللہؐ کا یہ قول میرے اور میرے بھائی کے بارے میں نہیں پہنچا کہ یہ دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہیں؟ اب اگر تم میری بات کو جھٹلاؤ گے تو ابھی وہ لوگ تم میں موجود ہیں کہ اگر ان سے پوچھو گے تو وہ تمہیں بتلائیں گے۔ پوچھو جابر بن عبداللہ انصاری سے، ابوسعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے اور انس بن مالک سے وہ تمہیں بتلائیں گے کہ انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق رسول اللہؐ کا یہ بیان سنا

ہے۔ کیا یہ قول رسول تمہیں میری خوں ریزی سے روکنے کے لئے کافی نہیں ہے؟"

امامؑ نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "اور اگر تمہیں میری بات میں شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمہارے نبی کی بیٹی کا بیٹا ہوں؟ واللہ مشرق و مغرب کے درمیان کسی نبی کی بیٹی کا بیٹا سوائے میرے کوئی نہیں ہے، نہ تم میں نہ تمہارے غیروں میں۔ تم پروائے ہو کیا میں نے تمہارے کسی شخص کو قتل کر دیا ہے، جس کا بدلہ مجھ سے چاہتے ہو؟ یا میں نے کسی کا مال لے لیا ہے؟ یا میں نے کسی کو جراحت لگائی ہے۔ جس کا قصاص لینا چاہتے ہو؟"

امام حسینؑ کے ان سوالات پر پورا مجمع سناٹے میں آ گیا اور کوئی کچھ نہ بولا۔ اس وقت آپ نے آواز دی:

"اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن شعث اور اے یزید بن حارث، کیا تم لوگوں نے مجھے یہ نہیں لکھا تھا کہ میوے پک چکے ہیں اور باغات شاداب ہیں اور آپ مدد پر آمادہ ایک لشکر کی طرف آئیں گے؟"... "اے لوگو! اگر تم میرے آنے کو ناپسند کرتے ہو تو مجھے چھوڑ دو کہ میں تمہارے پاس سے ایسی جگہ واپس چلا جاؤں جہاں میرے لئے امن و امان ہو۔"

روزِ عاشورہ امام حسینؑ کے کئی خطبے نقل کیے گئے ہیں جن میں سے صرف ایک کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ اس خطبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر دم تک حسینؑ کو امت کی اصلاح کی فکر تھی، اپنی جان کی نہیں، وہ فقط یہ چاہتے تھے کہ مخالفین ان کے خون بہانے سے باز رہ کر واصلِ جہنم ہونے سے بچ جائیں۔

جناب صادق نجمی اپنی کتاب "خطبات، فرمودات و مکتوبات حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا" میں لکھتے ہیں:

"خوارزمی کا بیان ہے کہ امام حسینؑ علیہ السلام دشمن پر پے در پے حملے کرتے ہوئے سخت جنگ میں مشغول تھے۔ ہر حملے میں آپ دشمن کے متعدد افراد کو خاک و خوں میں نہلا دیتے۔ یکبارگی دشمن نے فیصلہ کیا کہ امامؑ پر نفسیاتی ضرب لگا کر ان کے گھٹنے ٹکوا دیں۔ لہٰذا وہ امامؑ اور اہلِ حرم کے خیام کے درمیان حائل ہو گئے اور خیموں پر حملہ شروع کر دیا۔

اس موقع پر امامؑ نے بلند آواز میں پکار کر کہا:

''اے خاندان ابوسفیان کے پیروکارو! اگر تمہارا کوئی دین نہیں ہے، اور قیامت کا بھی تمہیں کوئی خوف نہیں ہے تو کم از کم اس دنیا میں آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کرو، اور اگر خود کو عرب سمجھتے ہو تو اپنے اجداد (کی سیرت) ہی کو پیش نظر رکھو۔''

شمر نے کہا: ''اے حسینؑ کیا کہہ رہے ہو؟''

جواب میں امامؑ نے فرمایا: ''میں تم سے لڑ رہا ہوں اور تمہاری جنگ مجھ سے ہے، ان عورتوں کی کوئی تقصیر نہیں، اپنے ان سرکشوں سے کہو کہ جب تک میں زندہ ہوں میرے حرم پر حملہ نہ کریں۔''

شمر نے کہا: ''فاطمہؑ کے بیٹے میں تمہیں یہ حق دیتا ہوں۔ (یعنی آپ حق بجانب ہیں)۔'' پھر شمر نے اپنے سپاہیوں کو آواز دے کر کہا: ''ان کے حرم سے دور ہو جاؤ اور خود انہی پر حملہ کرو، تمہارا مد مقابل بہت کریم النفس ہے۔''

ہم نے دیکھا کہ شمر، جس نے امامؑ کے مقابلے کے دوران اپنے سپاہیوں کو خیام حسینؑ پر یورش سے روکا، تو ان وحشیوں کا یہ پیچھے ہٹنا صرف وقتی تھا، اور امامؑ کے کلام کی معنوی تاثیر تھی جس نے اس وقت شمر کو متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ امامؑ کی شہادت کے بعد ان اشقیا نے ایک مرتبہ پھر اہلِ حرم کے خیموں پر حملہ کیا، ان کا مال و اسباب لوٹا اور عورتوں اور بچوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ (ص ۳۱۲۔۳۱۳۔۳۱۵)

شہادت سے ذرا پہلے بھی امام حسینؑ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا ہے جو دلوں کو تڑپا دینے والا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اے اللہ کے بندو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے ڈرتے رہو۔ اگر دنیا کسی کے لئے باقی رہتی اور کوئی اس دنیا کے لئے باقی رہتا تو اس کے سب سے زیادہ مستحق انبیاء تھے اس لئے کہ وہی لوگ اللہ کی رضا سے سب سے زیادہ قریب اور اس کے فیصلوں پر سب سے زیادہ راضی رہنے والے لوگ تھے۔ لیکن اللہ نے اس دنیا کو امتحان و ابتلاء کے لئے خلق فرمایا ہے۔ اور اہل دنیا کو فنا ہونے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس دنیا

کی ہر نئی شے پرانی ہو جاتی ہے۔ اس کی نعمتیں ناپید ہو جاتی ہیں اور اس کی خوشیاں بدمزہ ہو جاتی ہیں۔ یہ دنیا رہنے کی نہیں بلکہ سامان سفر کو اکٹھا کرنے کی جگہ ہے۔ تم بھی بہترین سامان سفر مہیا کرو اور وہ تقویٰ ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔"

علامہ طالب جوہری اپنی کتاب "حدیث کربلا" میں "آخری لمحہ" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی تحریر کرتے ہیں کہ........ مگر حضرت امام حسینؑ باوجود کامل مایوسی اور بے کسی اور بے بسی کے، خوش تھے اور مطمئن تھے یہاں تک کہ جب ان کے بچے اور قرابت دار اور ساتھی ختم ہو چکے اور وہ خود بھی زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے اور ان کی زندگی کے چند سانس باقی رہ گئے تب بھی ان کی زبان پر بے صبری کا کوئی لفظ نہیں آیا نہ ان کی حرکت سے کوئی بے صبری ظاہر ہوئی۔ بلکہ انہوں نے آخری سانسوں میں بھی خدائی مخلوق پر احسان کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ جب ان کا قاتل خنجر لے کر ان کے سینے پر چڑھا تو انہوں نے اس پر احسان رکھنے کے لئے بہت دھیمی اور کمزور آواز میں کہا ذرا ٹھہر جا۔ میں بہت جلد مر جاؤں گا۔ اس کے بعد میرا سر کاٹ لینا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری قوم کا اور میرے نانا کا کلمہ پڑھنے والا کوئی مسلمان میرا قاتل ہو اور میرے قتل کی وجہ سے دنیا میں بدنام ہو۔ میں عام لڑائی میں زخمی ہوا ہوں اور ان ہی زخموں سے مر گیا تو کسی خاص شخص کا نام میرے قتل میں نہیں لیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ ایک بے جان لاش کا سر کاٹا گیا ہے۔ اور اگر تو نے میری زندگی میں میرا سر کاٹ لیا تو قیامت تک تیری بدنامی ہوگی اور دنیا تجھ کو رسول اللہؐ کے نواسے کا قاتل کہا کرے گی۔ مگر قاتل نے اس محسنِ عام کی اس عجیب خواہش کو نہ مانا اور زندگی ہی میں حضرت امام حسینؑ کا سر کاٹ لیا۔" (ص ۵۰۸)۔

امام حسینؑ کی زندگی کا ہر ہر گوشہ، کربلا کا ایک ایک واقعہ چونکا دینے والا اور دل کو تڑپا دینے والا ہے۔ اس لئے عزاداری کرنا یا المیۂ کربلا کی یاد منانا نہ تو دکھاوے کے لئے ہوتا ہے، نہ کسی سے ضد بحث کے ضمن میں اور نہ ہی کسی کی دشمنی میں۔ یہ خالصتاً انسانیت اور

خلوص کا مظہر ہے۔

"جناب استاد مطہری کی حسینؑ شناسی" مترجمہ محمد علی ترمذی میں "عاشورا اسلام کا مجسمہ ہے" کے تحت لکھا ہے:

"جب ہم اسلام کی جامعیت کو دیکھتے ہیں تو اس وقت ہمیں تحریک حسینیؑ کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ کربلا میں امام حسینؑ نے کلیات اسلام پر عمل کر کے دکھایا، اسے مجسم کیا، لیکن ایک زندہ مجسم ایک حقیقی جاندار، نہ کہ بے روح جسم۔ انسان جب کربلا کے واقعات پر غور کرتا ہے تو اسے ایسے امور نظر آتے ہیں جن سے وہ حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے یہ واقعات اتفاقیہ نہیں ہو سکتے، آئمہ اطہار کی اس واقعہ کربلا کو زندہ رکھنے کی وصیت اور تاکید کا راز یہ ہے کہ یہ واقعہ اسلام کا مجسم عمل ہے اس لئے اس مجسم اسلام کو فراموش نہیں ہونا چاہیے۔"

روزے ہوں تو ایسے

ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اعمال کا مالک ومختار بنایا ہے۔ وہ جیسے چاہے اپنی زندگی گزارے۔ مگر اس نے اس دنیا کو دارالعمل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے۔ ایک مختصر عرصہ کے بعد وہیں جانا ہے۔ وہ دنیا مختصر نہیں ہے۔ اُس دنیا میں جزا بھی ہے اور سزا بھی۔ اِس دارالعمل میں انسان نے جیسے کام کیے ہیں اُس دنیا میں اس کے نیک کاموں پر انعام اور برے کاموں پر سزا دی جائے گی۔ کون سے اعمال کرنے ہیں اور کون سے نہیں اس کی نشاندہی کے لئے اللہ نے ہادی اور رہنما بھیجے۔ تحریری ہدایت کے لئے کتابیں نازل کیں۔ ان ہادیانِ برحق نے اللہ کے پیغام کو انسانوں تک پہونچایا اور ایمان و عملِ صالح کی تلقین فرمائی۔ اس کام میں انہوں نے صعوبتیں اٹھائیں، قربانیاں دیں اور بعض نے جانوں کے نذرانے پیش کیے۔

ایمان کے لئے اللہ نے عقیدہ کو روشناس کرایا یعنی دل سے کسی بات کو ماننا اور پھر اس پر عمل کرنا۔ ایمان کے تقاضوں میں بنیادی بات اللہ اور اس کے مقرر کردہ ہادی کو تسلیم کرنا اور اس کی ہدایات کی تعمیل کرنا ہے۔ ان ہدایات اور احکامات کی روشنی میں عبادات اور اعمالِ صالح بجالانا ہے۔

اسلامی عبادات میں نماز اولین عبادت ہے بلکہ اسے دین کا ستون کہا گیا ہے۔ اس کے بعد روزے کا حکم ہے۔ یوں تو ہر عبادت کا مقصد انسان کا تزکیۂ نفس ہے لیکن روزہ میں یہ مقصد اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: اے ایمان والو مدد حاصل کرو صبر اور صلوٰۃ سے۔ مفسرین نے یہاں صبر سے مراد روزہ اور صلوٰۃ کے معنی نماز لیے ہیں۔

روزہ کیا ہے اور اس کے بارے میں قرآن مجید میں کیا احکامات ہیں، آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

سورۂ البقرہ۔ آیت ۱۸۳ سے ۱۸۵: ترجمہ: اے ایمان والو، روزہ رکھنا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھا، اسی طرح تم پر بھی فرض کیا گیا، تا کہ تم متقی بن جاؤ (یعنی تم اس کی وجہ سے بہت سے گناہوں سے بچو)۔ (وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ) گنتی کے چند روز اس پر بھی (روزہ کے دنوں میں) جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں میں (جتنے قضا ہوئے ہوں) گن کے رکھ لے اور جنہیں روزہ رکھنے کی قوت ہے اور نہ رکھیں تو ان پر اس کا بدلہ ایک محتاج کو کھانا کھلا دینا ہے اور جو شخص اپنی خوشی سے بھلائی کرے تو یہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور اگر تم سمجھ دار ہو تو (سمجھ لو کہ فدیہ سے) روزہ رکھنا تمھارے حق میں (بہر حال) بہتر ہے۔ (روزوں کا) مہینہ رمضان ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ جو لوگوں کا رہنما ہے اور اس میں رہنمائی اور (حق و باطل کے) تمیز کی روشن نشانیاں ہیں۔ (مسلمانو) تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں اپنی جگہ پر ہو تو اس کو چاہئے کہ روزہ رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اور دنوں میں (روزہ کی) گنتی پوری کرے۔ خدا تمھارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمھارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا اور (شمار کا حکم اس لئے دیا ہے) تا کہ تم (روزوں کی) گنتی پوری کرو اور خدا نے جو تم کو راہ پر لگا دیا ہے اس نعمت پر اس کی بڑائی کرو۔

رمضان المبارک کے پورے ماہ میں روزہ رکھنا واجب ہے۔ فقہ کی رو سے روزہ ایک خاص وقت سے شروع ہو کر ایک مقررہ وقت پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس دوران ہر طرح کے کھانے پینے کی سخت ممانعت ہے۔ بہت سے حلال اور مباح کام حرام اور مکروہ ہو جاتے ہیں۔ دوران روزہ تزکیہ نفس کی شدید تاکید ہے۔ یعنی نیک عادات اپنائے تا کہ رمضان المبارک کے بعد بھی وہ ایسی ہی پاک صاف اور نیکیوں پر مبنی زندگی گزارے۔ دوران روزہ اگر جھوٹ، غیبت یا فحش کلامی زبان تک آئے بھی تو احساس روزہ سے وہ منہ سے باہر نہ نکلے۔ اگر نگاہوں کے سامنے نامحرمات آجائیں تو روزہ دار کی نظریں زمین کی طرف جھک جائیں۔ مختصر یہ کہ روزہ ایک ایسا عمل ہے جو روزہ دار کو پورا سال نیکیوں کی طرف راغب کرنے والا ایک سلسلہ بن جاتا ہے اور یہ سلسلہ زندگی کو سرخ روئی سے ہمکنار کرنے والا بن جاتا ہے۔

آیات قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ روزہ رکھنے کا خاص مقصد "لعلکم تتقون" ہے کہ صاحبانِ ایمان روزہ کی بدولت متقی بن جائیں یعنی ہر کام میں اللہ کے احکامات کی پیروی کرنے والے بن جائیں۔ تقویٰ اس حالت اور ملکہ کو کہتے ہیں جو انسان کو ہر طرح کے گناہ سے روکتی ہے۔

پورے سال میں صرف ماہ رمضان المبارک کے روزے واجب ہیں۔ ان روزوں کے علاوہ اگر کوئی روزہ رکھنا چاہے تو پورے سال روزے رکھ سکتا ہے، سوائے عید الفطر، عید الاضحیٰ اور یوم عاشورہ (دس محرم) کے۔ ان دنوں کے علاوہ پورے سال کے روزے مستحب ہیں یعنی رکھنے پر ثواب اور نہ رکھنے پر گناہ نہیں ہے۔ حضور اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ سال کے بیشتر ایام میں روزے رکھا کرتے تھے خاص کر رجب اور شعبان کے مہینوں میں۔ اسی وجہ سے اب بھی بہت سے صاحبان ایمان رجب اور شعبان کے مہینوں میں مستحب روزے رکھتے ہیں۔ عید الفطر کے فوراً بعد شوال کے پہلے عشرے میں چند روزے رکھنا مستحب ہے۔ ان روزوں کا بے حد ثواب ہے۔ ہر ماہ پہلے تین روز، درمیانِ ماہ میں تین روز اور آخر ماہ تین روز روزے رکھنے کا بہت ثواب ہے۔ دوران حج اگر کسی کے پاس قربانی کی استطاعت نہ ہو تو ذی الحجہ کی دس گیارہ اور بارہ تاریخ کو روزہ رکھنا اس کا بدل ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر شہزادی فاطمہؑ کے پاس قربانی کی استطاعت نہیں تھی چنانچہ آپؑ نے منیٰ میں تین روز تک یہ روزے رکھے۔

جناب علامہ فروغ کاظمی مرحوم کی تالیف کردہ کتاب "تفسیر اسلام" میں جناب امام علی نقیؑ کے باب میں "چار اہم روزے" کے عنوان سے تحریر ہے:

"شیخ ابو جعفر طوسی "مصباح" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اسحاق بن عبداللہ علوی امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امامؑ نے انہیں دیکھ کر فرمایا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے باپ اور چچا کے درمیان بحث چھڑی ہوئی ہے کہ سال کے وہ کون سے روزے ہیں جن کا رکھنا ثواب عظیم ہے۔ اس نے کہا، مولا! بالکل یہی بات ہے۔ آپؑ نے فرمایا سنو، وہ چار روزے جو ثواب عظیم کے حامل ہیں ان کی تاریخیں بالترتیب اس طرح ہیں: (۱) ۱۷ ربیع الاول،

یوم ولادت پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ (۲) یوم بعثت و معراج یعنی ۲۷/ رجب المرجب۔ (۳) ۲۵/ ذیقعدہ کیونکہ اس تاریخ کو زمین کا فرش بچھایا گیا اور سفینۂ نوح کوہ جودی پر ٹھہرا۔ (۴) ۱۸/ ذی الحجہ یوم غدیر، جس دن آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین قرار دے کر مجمع عام میں اس کا اعلان فرمایا۔ اے اسحاق! جو شخص یہ روزے رکھتا ہے اس کے ستر سالہ گناہ بخشے جاتے ہیں۔ (وسائل الشیعہ جلد ۲، ص ۱۲۳، و مناقب ابن شہر آشوب جلد ۵، ص ۱۲۳)۔"

ان کے علاوہ نذر کے روزے واجب ہیں۔ اگر کوئی اللہ سے اپنی مراد پوری ہونے پر ایک یا زیادہ روزے رکھنے کا عہد کرے تو مراد پوری ہو جانے پر اس پر واجب ہے کہ اپنے عہد کو پورا کرے اور عہد کے مطابق روزہ یا روزے رکھے۔

اس موقع پر ہمیں سورۂ الدہر میں "یوفون بالنذر" کے تذکرے کی یاد آ گئی۔ سورۂ دہر (یا سورۂ انسان یا سورۂ ھل اتیٰ) کی آیت ۷ تا ۱۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوگی ڈرتے ہیں۔ اور اس کی محبت میں محتاج اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تو بس خالص خدا کے لئے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلے کے خواستگار ہیں اور نہ شکر گزاری کے۔ ہم کو تو اپنے پروردگار سے اس دن کا ڈر ہے جس میں منہ بن جائیں گے اور چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوں گی۔ تو خدا انہیں اس دن کی تکلیف سے بچالے گا اور ان کو تازگی اور خوش دلی عطا فرمائے گا۔"

تفاسیر میں ان آیات کی شان نزول میں یہ روایت درج ہے:

"ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حسن اور حسین علیہما السلام بیمار ہوئے تو حضرت رسولؐ کچھ لوگوں کے ساتھ عیادت کو تشریف لائے اور جناب امیرؑ سے فرمایا کہ بہتر ہوتا اگر تم اپنے لڑکوں کی صحت کے واسطے نذر کرتے۔ یہ سنتے ہی جناب امیرؑ، جناب فاطمہ زہراؑ اور جناب فضہؓ نے تین تین روزوں کی نذر کی۔ غرض جب دونوں صاحبزادے اچھے ہوئے اور نذر کے پورا کرنے کا وقت آیا تو گھر میں کچھ نہیں تھا۔ جناب امیرؑ نے شمعون یہودی سے تین صاع جو قرض لئے۔ جناب سیدہؑ نے ایک صاع جو پیسا اور پانچ روٹیاں

پکائیں۔ شام کو کھانا ہی چاہتے تھے کہ ایک سائل نے آواز دی "السلام علیک یا اہل بیت محمدؐ، میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا دو، خدا تمہیں جنت کے خوان عطا کرے گا"۔ یہ سنتے ہی سب نے اپنے اپنے آگے کی روٹیاں دے دیں اور فقط پانی پی کر سو رہے اور دوسرے دن پھر روزہ رکھا۔ حسب دستور جناب سیدہؑ نے پھر پانچ روٹیاں پکائیں اور کھانے بیٹھے کہ ایک یتیم نے آواز دی اور سب نے اپنی اپنی روٹی اس کو دے دی اور صرف پانی سے افطار کیا۔ تیسرے روز پھر روزہ افطار کرنے بیٹھے تھے کہ ایک قیدی نے آواز دی اور تیسرے دن پھر سب بزرگواروں نے اپنی اپنی روٹی دے دی۔ چوتھے دن صبح کو جناب امیرؑ نے صاحبزادوں کے ہاتھ پکڑے اور حضرت رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب رسول اللہ کی نظر پڑی کہ بھوک کی شدت سے کانپ رہے ہیں تو فرمایا میں تم لوگوں کو کس قدر تکلیف کی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر خود اٹھے اور ان کے ساتھ جناب سیدہؑ کے مکان میں آئے تو فاطمہ زہراؑ کو محراب عبادت میں دیکھا کہ ان کی پیٹھ پیٹ سے مل گئی ہے اور آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ یہ دیکھ کر آنحضرت کو بہت رنج ہوا۔ یکایک حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور کہا لیجئے یارسول اللہ آپ کو مبارک ہو کہ خدا نے یہ سورہ آپؐ کے اہل بیتؑ کی شان میں نازل فرمایا ہے اور سورہ دہر کی تلاوت فرمائی (تفسیر کشاف جلد سوم، ص ۲۳۹ سطر ۲۹ مطبوعہ مصر) اور اس روایت کو بیضاوی وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔"

ان آیات مبارکہ کے بعد اسی سورہ کی آیات ۱۱ سے ۲۲ تک ان عہد کو پورا کرنے والوں کے لئے انعامات کا تذکرہ ہے۔ ترجمہ: تو خدا انہیں اس دن کی تکلیف سے بچائے گا اور ان کو تازگی اور خوش دلی عطا فرمائے گا اور ان کے صبر کے بدلے (بہشت کے) باغ اور ریشم (کی پوشاک) عطا فرمائے گا وہاں وہ تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے۔ نہ وہاں (آفتاب کی) دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدت کی سردی۔ اور گھنے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور میووں کے گچھے ان کے بہت قریب ہر طرح ان کے اختیار میں۔ اور ان کے سامنے چاندی کے ساغر اور شیشے کے نہایت شفاف گلاس کا دور چل رہا ہو گا اور

شیشے بھی (کانچ کے نہیں) چاندی کے جو ٹھیک انداز ے کے مطابق بنائے گئے ہیں اور وہاں انہیں ایسی شراب پلائی جائے گی جس میں زنجبیل (کے پانی) کی آمیزش ہوگی۔ یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے اور ان کے سامنے ہمیشہ ایک حالت پر رہنے والے نوجوان لڑکے چکر لگاتے ہوں گے کہ جب تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں اور جب تم وہاں نگاہ اٹھاؤ گے تو ہر طرح کی نعمت اور عظیم الشان سلطنت دیکھو گے۔ اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ یقینی تمہارے لئے ہوگا (تمہاری کارکردگیوں کے) صلہ میں اور تمہاری کوشش قابل شکر گزاری ہے۔

آیات ۱۱ سے ۲۲ (۱۲ آیات) میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ نعمات جنت ائمہ اثناء عشر کے واسطے ہیں اور آخری آیت تو ان حضرات کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہونے کی بین دلیل ہے کیونکہ جب بندہ کی اطاعت اس حد کو پہنچی کہ خدا کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا جائے تو اس سے بالاتر اور کیا مرتبہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر تو امام شافعیؒ عالم وجد میں فرماتے ہیں: میں کہاں تک اور کب تک اس جوان (علیؑ) کی دوستی پر ملامت کیا جاؤں گا۔ تو کیا فاطمہؑ کی سی بی بی کسی اور کو بھی ملی ہے اور کیا "ھل اتیٰ" کسی اور کی شان میں بھی نازل ہوا ہے اور عطارؔ نے کیا خوب شعر کہا ہے:

از ستائش لافتیٰ آمد پدید
در سہ نانش ھل اتیٰ آمد پدید

(ترجمہ: اُن (حضرت علیؑ) کی ستائش کے لئے ذوالفقار ("لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار) (سورۂ الحدید ۵۷، آیت ۲۵) آئی اور ان کی (عطا کردہ) تین روٹیوں پر آیاتِ "ھل اتیٰ" نازل ہوئیں۔

اللہ اللہ کیا شان معصومینؑ ہے۔ کیسا ان کا ایثار اور صبر ہے اور پھر جواب میں اللہ کی کیا شان عطا نظر آتی ہے۔ اس سورے میں جتنی بھی عطیات الٰہی کا ذکر ہے، ان پر غور کرنے سے فکر کے کیسے کیسے جواہر ہاتھ آتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ سورۂ دہر اکتیس آیات پر مشتمل ہے۔ خاندان رسالتؐ نے اپنا عہد پورا کیا اور ایثار و عطا کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر نہیں۔ چنانچہ پانچ حضرات کی تین دن لگاتار روٹیاں (یعنی پندرہ روٹیاں) عطا کرنے پر دوگنی سے بھی زیادہ اکتیس آیات کا سورہ نازل ہوا۔

۲۔ جناب فضہؓ جناب امیرؑ و جناب زہراؑ و حسنینؑ کے ساتھ اس روزہ داری اور عطایا میں شامل ہیں۔ سو لفظ ''فضہ'' (بمعنی چاندی) پورے سورے میں تین جگہ موجود ہے۔ یاد رہے کہ ایثار کی یہ داستان تین دنوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ آیت نمبر ۱۲ میں بہترین کپڑوں سے مراد کربلا میں ظالموں کے ہاتھوں ان کے سروں سے چھینی جانے والی چادروں کا عوض ہو سکتا ہے۔ یا یہ ان بے گور و کفن لاشوں کے ایثار کا بدلہ ہو جن کے بدن سے ان کے لباس تک کو لوٹ لیا گیا۔

۴۔ آیت نمبر ۱۹ میں غلمان (خوب صورت بچوں) کا تذکرہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ اللہ کی یہ عنایت اس وجہ سے ہو کہ مسافران کربلا نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے معصوم بچوں کی بھوک، پیاس اور مظلومیت کے ساتھ ساتھ ان کی شہادتیں دیکھیں اور اب جنت میں انہیں ان کی قربانیوں کی جزا کے طور پر یہ نعمات پیش کی جا رہی ہوں۔

۵۔ آیت نمبر ۲۱ میں ذکر ہے کہ انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ شاید اس سے مراد اس ایثار کا عوض ہو جو کربلائے معلیٰ میں خاندان رسالت کی مخدرات عصمت کے زیورات لوٹے جانے کا سبب بنے۔ یا یہ ان کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی صعوبتوں کا اجر ہو۔ اسی آیت میں یہ بھی تذکرہ ہے کہ ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب (شراب طہورا، جو کہ ایک پاکیزہ اور بہترین قسم کا مشروب ہے) پلائے گا۔ شاید یہ شہیدان کربلا اور اسیران کربلا کے اس ایثار کا بدل ہو جو آپ حضرات نے کئی روز پیاسے رہ کر کیا۔ بہترین میووں کے ذکر سے شاید ان کے فاقوں کے امتحان کی جزا مراد ہو۔

سورۂ دہر کے آخر میں ایک اور آیت محمدؐ و آل محمدؐ کی فضیلت کی گواہی میں بڑی اہم ہے۔ یعنی آیت نمبر ۳۰۔ ترجمہ: اور تم تو کچھ چاہتے ہی نہیں جب تک اللہ نہ چاہے۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی رضا کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جناب رسالت مآب کا یہ کہنا کہ "فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے" "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں" "اے علیؑ تمہارا گوشت میرا گوشت، تمہارا خون میرا خون ہے" یہ سب اللہ کی منظوری سے ہے۔

اس طرح جناب امام حسینؑ کے لئے سجدے کو طول دینا، دروازۂ بتولؑ پر روزانہ سلام پیش کرنا، چادر تطہیر میں پنجتن کو یکجا کرنا اور انہیں میدان مباہلہ میں لے جانا، غدیر خم میں جناب امیرؑ کے سر پر تاج ولایت رکھنا وغیرہ وغیرہ سب کچھ اللہ کی مرضی اور منظوری سے ہے۔

روزوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ روزہ دار ان غریبوں کے فاقوں کی تکلیف کا احساس کرے جو نان شبینہ کے محتاج ہیں۔ سورۂ دہر کی تلاوت سے ہم پر یہ آشکار ہوتا ہے کہ وہ فاقہ کشوں کی تکلیف کو کس قدر شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ لگاتار تین روز تک صرف پانی پی پی کر روزے رکھتے ہیں مگر دوسروں کو اس تکلیف سے نہیں گزرنے دیتے۔ تقویٰ کی انتہائی بلندیوں پر ہوتے ہوئے روز محشر کی سختیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ کہتے ہیں 'ہم اس عمل کا نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ کے الفاظ، ہم تو یہ سب کچھ اپنے اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتے ہیں۔'

غرض یہ کہ سورۂ دہر پڑھتے جایئے اور اہل بیت اطہار کی قربانیوں اور صبر کو یاد کرتے جایئے اور اپنے اندر بھی ان کے جیسی صفات پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ ان شاء اللہ، اللہ کے انعامات سے آپ بھی مستفید ہوں گے۔

سورۂ انسان تمام انسانوں کے لئے اللہ کی وعید ہے جو اس نے اہلبیت اطہار کو ان کے حسن عمل کی جزا کے طور انہیں عطا کیا اور امت کو یہ نوید بخشی کہ اگر نیک کام صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے انجام دیں تو وہ بھی ایسی ہی نعمتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

”حسینؑ ایسے تھے“

بغور سن لے زمانہ حسینؑ ایسے تھے
بقا، فنا کو بنایا حسینؑ ایسے تھے

۳ شعبان المعظم سن ۴ ہجری وہ مبارک دن ہے جب ایک تاریخ ساز شخصیت دنیا میں تشریف لائی۔ افضل البشر جناب رسالت مآبؐ کی آنکھ کا تارا، سیدۃ النساء العالمینؑ کا جگر گوشہ، امیر المومنین مولائے کائناتؑ کا یہ دلبند جسے دنیا حسینؑ کے نام سے پہچانتی ہے، جب دنیا میں تشریف لایا تو زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ نور سے بھر گیا، فضائیں جھوم اٹھیں، ہوائیں عطر بیز ہو گئیں۔

اللہ کے نزدیک اس ہستی کا کیا مقام تھا، جناب رسالت مآبؐ کی نگاہوں کو اس بچے کی پیشانی میں کیا نظر آ رہا تھا، جناب فاطمہ زہراؑ اور جناب علی مرتضیٰؑ کی پیش بین نظریں اس کی ولادت پر کیا دیکھ رہی تھیں، اس کا بیان کرنا کارِ دارد ہے۔ آگے چل کر اس بچے کی زندگی نے کیا رخ اختیار کیا اور بعدِ شہادت، آج تک دنیا ان کے بارے میں کیا کہہ چکی اور کیا کچھ کہہ رہی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت امام حسینؑ وہ شخصیت ہیں جن پر جتنا کچھ کہا گیا، جتنا کچھ لکھا گیا، جتنا رویا گیا، جناب آدمؑ سے لے کر آج تک کسی اور شخص پر نہ کہا گیا، نہ لکھا گیا اور نہ رویا گیا۔

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید فرقان حمید میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا تذکرہ کہاں کہاں ہے:

(جن آیات کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی ترتیب قرآن میں ان کے متعلقہ سوروں کے نمبر شمار کے حساب سے کی گئی ہے)۔

۱۔ سورۂ الفاتحہ (۱)۔ آیت ۶ اور ۷: ترجمہ: "(اے اللہ) تو ہم کو سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھ، ان کی راہ جنہیں تو نے اپنی نعمت عطا کی ہے نہ ان کی راہ جن پر تیرا غضب ڈھایا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی۔"

اس آیت کی تفسیر میں مفسرِ قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی صاحب "خلاصۃ التفاسیر" میں فرماتے ہیں:

"یہاں پر انعام یافتہ لوگوں سے مراد انبیاء، صدیقین (یعنی جو قول و عمل میں سچے ہیں)، شہداء اور صالحین (یعنی نیک بندے) ہے۔ صراط مستقیم یعنی "سیدھا راستہ" سے مراد صاحبان نعمت تک رسائی، ان سے محبت، ان کی معرفت، قلبی اور عملی وابستگی اور ان کے طریقۂ زندگی کو اختیار کرنا ہے۔

محققین نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہدایت کے لئے قرآن کافی نہیں، صاحبان نعمت کا دامن پکڑنا (عملی وابستگی) ہی ہدایت ہے۔ اس لئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں (۱) قرآن، جو اللہ کی کتاب ہے (۲) میری عترت اہلِ بیت۔ جب تک تم ان دونوں سے تمسک اختیار کئے رہو گے تو میرے بعد ہرگز ہرگز نہ گمراہ ہو گے اور یہ دونوں کبھی ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پلٹ آئیں" (صحیح مسلم شریف)

غرض "نعمت" سے مراد جاہ و مال دنیا یا زر، زمین، زن نہیں، نعمت سے مراد وہ ہدایت اور توفیق ہے جو خدا کے اطاعت گزاروں کے شامل حال رہی ہے (معانی الاخبار۔ حدیث از علی ابن ابی طالب)۔

یہی صاحبان نعمت بندے، خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سورۂ حمد میں عبد و معبود کے درمیان خدا ان بندوں کا ذکر نہ فرماتا۔ اسی لئے مرشد تھانوی نے لکھا "صراط مستقیم میسر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیروی اہل صراط مستقیم کی، کی جائے اور اس کے لئے محض اوراق کتب کافی نہیں" (تفسیر ماجدی)۔

صاحبانِ نعمت بندے کون ہیں؟

خداوندِ عالم ایسے بندوں کی نشان دہی قرآن مجید میں اس طرح فرماتا ہے:

ترجمہ آیت ۶۹، سورۃ النساء: "اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں تو یہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام و احسان کیا ہے (۱) انبیاء (۲) صدیقین (۳) شہداء (۴) صالحین۔

پھر ہدایت صرف صاحبانِ نعمت تک رسائی ہی کا نام نہیں، ثباتی پہلو کے ساتھ ساتھ سلبی پہلو بھی ضروری ہے یعنی ان اشخاص اور جماعتوں سے بیزاری اور قطع تعلق بھی ضروری ہے جو صراطِ مستقیم سے دوری کا باعث ہیں۔ ان ہی صاحبانِ نعمت سے تعلق جوڑے رہنے کو دین کی اصطلاح میں "تولاّ" اور اللہ کے مغضوب اور گمراہ لوگوں سے قطع تعلق کو "تبرّا" کہتے ہیں۔ حضرت ابو عبداللہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "مغضوب علیہم" یعنی جن پر خدا کا غضب ہوا" سے مراد اہل بیت رسولؐ سے دشمنی کا اظہار کرنے والے ہیں۔ اور "ضالین" یعنی گمراہوں سے مراد "وہ شکوک و اوہام میں مبتلا لوگ ہیں جو معرفت امام نہیں رکھتے۔" (تفسیر علی بن ابراہیم)

بعض روایات میں 'مغضوب علیہم' سے مراد 'یہودی اور 'ضالین' گمراہوں سے مراد نصرانی بھی ہیں۔

غرض صاحبانِ نعمت چار قسم کے لوگ ہیں (۱) "نبیین" جو اللہ تعالیٰ کا پیغام لانے والے اور اس کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ اللہ اپنے علم کی بناء پر ان کا انتخاب فرماتا ہے۔ (۲) "صدیقین" جو قول و عمل کے سچے اور کھرے ہیں۔ ہمیشہ ہر بات سچ اور ہر کام سچائی و خلوص دل سے انجام دیتے ہیں۔ اُن کے سید و سردار حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں۔ جنہوں نے کبھی غیر اللہ کے سامنے سر نہ جھکایا اور قول و عمل کے ایسے سچے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "کل میں اُس کو علم دوں گا' جو مرد ہوگا' جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور اس کا رسولؐ اُس کو دوست رکھتے ہوں گے۔" (صحیح بخاری شریف)

اور حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

"علیؑ کا ذکر کرنا بھی عبادت ہے" یہ حدیث غیر مشروط ہے۔ یعنی علیؑ کا کوئی عمل ایسا نہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو۔ اگر ایک قول یا عمل بھی اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا تو مطلقاً علیؑ کا ذکر عبادت نہ قرار پاسکتا تھا۔ اسی لئے تو امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا: "انا صدّیق الاکبر" یعنی "میں صدیق اکبر ہوں"

عالم اسلام آج بھی حضرت علیؑ کو "کرم اللہ وجہ" کہتا ہے۔ یعنی اللہ نے ان کے چہرے کو غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے محفوظ اور مکرم رکھا۔ اعلیٰ ترین معنی میں تو صدیق کے مصداق حضرت علیؑ اور ائمہ معصومین ہیں لیکن ہر وہ شخص جو قول و فعل میں جتنا سچا ہوگا اتنا ہی صدیق ہوگا۔ کیوں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "بندہ سچ بولتا رہتا ہے، سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ اس کو صدیقین میں لکھ دیتا ہے۔" خاص کر کاروباری معاملات میں سچ بولنے والا یقیناً صدیق ہے کیوں کہ وہ نقصان اٹھا کر سچ بولتا ہے۔

تیسرا گروہ "شہداء" کا ہے جو اللہ کی راہ میں جان دے کر اپنے خون سے اپنی گواہی کو ثابت کرتے ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مالی، جسمانی اور دماغی قربانیاں حق کے لئے دیتے ہیں۔ اور (۴) "صالحین" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے نیک اعمال ان کے برے اعمال پر غالب ہوں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے: "جس کے نیک عمل (برے عمل پر) بھاری ہوں گے وہ اس زندگی میں ہوگا جس سے وہ خوش ہوگا۔"

شہداء کے سید و سردار امام حسنؑ و امام حسینؑ ہیں کیوں کہ ان کی شہادت گویا رسولؐ کی شہادت ہے اور ان کو حضورؐ نے "جنت کے جوانوں کے سردار" فرمایا ہے۔ ان کی بیش بہا قربانیاں عالمین میں آشکار ہیں۔ اللہ نے قربانی کا معیار یہ پیش فرمایا ہے: "تم ہرگز ہرگز نیکی تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم اس شئے میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمھیں محبوب ہے" (آل عمران۔ آیت ۹۲)

حضرت امام حسینؑ نے "اس میں سے کچھ" نہیں بلکہ "سب کچھ" اللہ کی راہ میں قربان

کر دیا۔ گویا قرآنی معیار سے بھی ان کی قربانی بلند تر ثابت ہوئی۔ بقول شاعر: ۔ اہلِ بیت پاک کے ہر سانس کو اے مدعی۔ ہاں ملا کر دیکھ لے آیات قرآنی کے ساتھ۔ اور تمام امت کے صالحین کے سید و سردار اہل بیت رسولؐ کے امام ہیں، کیوں کہ وہ معصوم ہیں اور منصوص من اللہ ہیں۔ وہ ہر گناہ سے پاک ہیں ان کی نیکیاں ضرب المثل ہیں۔ صاحب "تحفہ" تک نے لکھا ہے: "اگر امام کے معنی سب سے آگے ہونے کے ہیں تو اس معنی میں "آلِ محمدؐ" ہی ساری امت کے امام ہیں اس لئے کہ ہر ہر نیکی میں وہ ساری امت سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔"

۲۔ سورۂ البقرہ (۲)۔ آیت ۳۷۔ ترجمہ: اس کے بعد آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھ لئے تو اس نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔

تفسیر نمونہ: "کئی ایک روایات جو طرق اہلبیت سے منقول ہیں میں ہے کہ کلمات سے مراد خدا کی بہترین مخلوق کے ناموں کی تعلیم تھی۔ یعنی محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ اور حسینؑ اور حضرت آدمؑ نے ان کلمات کے وسیلے سے درگاہِ الٰہی سے بخشش چاہی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا۔"

شیخ صدوقؒ کی کتاب "خصال" صفحہ ۱۷۳: "جنت کے دروازے پر لکھے ہوئے کلمات چھ ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ میں جنت میں داخل ہوا تو اس کے دروازے پر چھ کلمات سونے کے پانی سے لکھے ہوئے تھے۔ (۱) لا الٰہ الا اللہ۔ (۲) محمدٌ حبیب اللہ۔ (۳) علیٌ ولی اللہ۔ (۴) فاطمۃ امۃ اللہ۔ (۵) الحسن والحسین صفوۃ اللہ۔ (۶) علیٰ مبغضہم لعنۃ اللہ۔

شہید طالب حسین کرپالوی اعلی اللہ مقامہٗ کی کتاب: "مناقب اہلِ بیتؑ": بعنوان "کلمات حضرت ابراہیم": البقرہ کی آیت ۱۲۴۔ اور وہ وقت یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ کے رب نے اس کا امتحان لیا چند کلمات سے تو اس نے انہیں پورا کردیا۔ تو خدا نے فرمایا کہ میں تمہیں سب انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔

"وہ وقت یاد کرو" اشارہ ہے اس بات کا کہ حضرت ابراہیم کے امتحان کے وقت حضور

اکرمؐ موجود تھے۔ ائمہ علیہم السلام سے منقول روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خمسۂ طاہرین کی وجہ سے اس مشکل ترین امتحان میں کامیاب ہو کر منصب امامت پر فائز ہوئے تھے۔

پنجتن کے نام لکھے ہیں حسیں ترتیب سے
باب جنت پر سجا ہے جیسے گلدانِ علیؑ

۳۔ آلِ عمران (۳)۔ آیت ۶۱۔ (آیہ مباہلہ)۔ ترجمہ: "پھر جب تمہارے پاس علم (قرآن) آ چکا، اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (نصرانی) عیسیٰؑ کے بارے میں حجت کرے تو کہو کہ (اچھا میدان میں) آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو (بلائیں) اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفسوں کو (بلائیں) اور تم اپنے نفسوں کو اس کے بعد ہم سب مل کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔"

مباہلہ کا واقعہ سب جانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بنی نجران کے اکابر عیسائیوں سے کئی روز کی بحث کے بعد جب یہ طے پایا کہ دونوں فریق اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفوس کو لے کر میدان میں مدمقابل ہوں اور جھوٹوں پر لعنت کریں تو اس موقع پر حضور عورتوں کی بجائے صرف ایک خاتون جناب فاطمہؑ، بیٹوں میں جناب امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور نفسوں کی جگہ صرف حضرت علیؑ کو لے کر آئے اور عیسائیوں نے انہیں دور سے دیکھ کر مباہلہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہاں سب سے آگے حضور اکرمؐ، ان کی گود میں جناب حسینؑ اور انگلی تھامے جناب حسنؑ تھے۔ ان کے بالکل پیچھے جناب فاطمہؑ اور سب سے پیچھے جانثار اسلام و رسولؐ حضرت علیؑ تھے۔ چشمِ نظارہ اندازہ کر سکتی ہے کہ گود میں ہونے کی وجہ سے حضرت امام حسینؑ سب سے آگے تھے۔ شاید کیا یقیناً بنی نجران کی نظر سب سے پہلے جناب حسینؑ پر پڑی ہوگی۔ تبھی تو فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ روایات میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ ان کے بڑوں نے کہا "ہم وہ چہرے دیکھ رہے ہیں جن کے بارے میں یقین ہے کہ وہ اگر اشارہ کر دیں تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔"

جنبشِ لب بھی نہ کی اور معرکہ سر کر لیا
سامنے نجرانیوں کے جوں ہی آئے پنجتنؑ

۴۔سورۂ الحج (۲۲)۔آیت ۷۷۔۷۸۔ترجمہ:''اے ایمان دارو رکوع کرو اور سجدے کرو اور اپنے پروردگار کی عباد . . رو اور نیکی کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔اور جو حق جہاد کرنے کا ہے خدا کی راہ میں جہاد کرو۔اسی نے تم کو برگزیدہ اور امور دین میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی۔تمہارے باپ ابراہیمؑ کے مذہب کو (تمہارا مذہب بنا دیا ہے)۔اسی (خدا) نے تمہارے پہلے ہی سے مسلمان (فرماں بردار بندے) نام رکھا اور اس قرآن میں بھی (تو جہاد کرو) تا کہ رسول تمہارے مقابلہ میں گواہ بنیں اور تم تمام لوگوں کے مقابلے میں گواہ بنو اور تم پابندی سے نماز پڑھا کرو، زکوۃ دیتے رہو اور اللہ ہی (کے احکام) کو مضبوط پکڑو، وہی تمہارا سرپرست ہے تو کیا اچھا سرپرست ہے اور کیا اچھا مددگار ہے۔''

ان آیات کے حاشیہ میں حافظ فرمان علی صاحب فرماتے ہیں: ابن مردویہ نے عبدالرحمان بن عوف سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ہم قرآن میں یہ آیت (جس طرح تم نے شروع میں جہاد کیا اسی طرح آخر زمانہ میں جو حق جہاد کرنے کا ہے خدا کی راہ میں جہاد کرو) نہ پڑھتے تھے۔میں نے کہا بے شک پڑھتے تھے لیکن وہ زمانہ آخر کب ہوگا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس زمانہ میں بنی امیہ حاکم ہوں گے اور مغیرہ کی اولاد وزیر ہوگی اور بیہقی نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے (دیکھو تفسیر ''در منثور'' جلد ۴ ص ۳۷۱ مطبوعہ مصر) اور یہ ظاہر ہے کہ مغیرہ کی اولاد یزید کے زمانے میں وزارت پر فائز تھی کیونکہ سب سے پہلے جس شخص نے معاویہ سے بیعت یزید کی تحریک کی اور لوگوں سے بیعت کرائی وہ مغیرہ کوفہ کا گورنر تھا جس نے کوفہ کے چالیس آدمیوں کو اپنے بیٹے کے ساتھ معاویہ کے پاس یزید کی بیعت کے واسطے بھیجا تھا اور جب وہ لوگ بیعت کر چکے تو معاویہ نے اس کے بیٹے سے تنہائی میں پوچھا 'تیرے باپ نے ان لوگوں کا دین وایمان کتنے میں خرید کیا'، وہ بولا چار سو دینار میں۔معاویہ نے کہا پھر بھی بہت ارزاں ہے۔اللہ اکبر، معاویہ کو بھی اپنی بے ایمانی

اور مخالفت حق کا اس درجہ یقین تھا۔ بہر حال یہ زمانہ جس کو خدا فرماتا ہے امام حسینؑ کے جہاد کا زمانہ اور آپ کے جہاد عظیم کا ذکر ہے اور خدا آپؑ کے ساتھ دینے کا ذکر فرماتا ہے۔

۵۔ سورۂ الاحزاب (۳۳)۔ آیت ۳۳۔ آیۂ تطہیر۔ ترجمہ: ''اے (پیغمبر کے) اہل بیتؑ! اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔''

اس کا مختصر احوال یہ ہے کہ مباہلہ کا اعلان ہو جانے پر حضورؐ متفکر تھے کہ کس کس کو لے کر بنی نجران سے مقابلے کے لئے جایا جائے۔ کیونکہ معاملہ مباہلہ کا یعنی بددعا کرنے کا تھا اور اس میں ہر کس و ناکس کو نہیں لے جایا سکتا تھا۔ چنانچہ حکم ربی سے آپ کلی الصبح حجرۂ جناب اُم سلمیٰؓ یا حجرۂ جناب سیدہؑ میں تشریف لے گئے۔ حضرات علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو بلوایا (یا وہ باری باری خود آئے)۔ سب پر اپنی ردائے مبارک ڈال کر فرمایا، اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیتؑ ہیں۔ ان سے ہر طرح کے رجس کو دور رکھ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی دعا کی تائید کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرما کر مباہلے میں جانے والوں کا فیصلہ کر دیا۔ یہیں سے حضورؐ ان چاروں کو لے کر مباہلہ میں تشریف لے گئے۔

نور کے پیکر ہوئے یک جا تو بول اٹھے ملک
پاک و پاکیزہ ہے کیسی یہ کساء کی روشنی

اسی سورہ (الاحزاب) کی آیت ۵۶ میں مومنین کو درود پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ درود بھیجنے کا طریقہ جو حضورؐ نے فرمایا اس میں حضورؐ کے ساتھ ساتھ ان کی آل پاک کو بھی شامل فرمایا اور اپنے ساتھ چاروں کو نام بنام بتایا جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام بھی شامل ہیں۔

۶۔ سورۂ الصفٰت (۳۷)۔ آیت ۱۰۷۔ ترجمہ: ''اور ہم نے اسمٰعیلؑ کا فدیہ ایک ذبحِ عظیم (بڑی قربانی) قرار دیا۔''

اس آیت میں لفظ ''ذبحِ عظیم'' پر مفسرین نے بہت لکھا ہے۔ بیشتر کی رائے ہے کہ ذبحِ عظیم سے مراد قربانی حسینؑ ہے جو آپؑ نے ۱۰ محرم الحرام ۶۱ ہجری میں میدان کربلا میں

پیش فرمائی۔ کچھ مفسرین کی رائے میں ذبحِ عظیم سے مراد جناب اسماعیل کی جگہ جنت سے آجانے والا ''موٹا دنبہ'' اور کچھ کے نزدیک یہ ہر سال بڑی تعداد میں عید قرباں کے موقع پر ذبح ہونے والے دنبوں کی کثیر تعداد ہے۔ حکیم الامت، شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے: اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر۔ معنیِ ذبحِ عظیم آمد پسر۔ بہت سے شیعہ و اہل سنت علماء نے اس آیت کی تشریح میں کتابیں لکھی ہیں اور مقالے پیش کئے ہیں۔ جناب اولاد حیدر فوق بلگرامی اور شیخ الاسلام علامہ طاہر القادری صاحبان نے ''ذبحِ عظیم'' کے عنوان سے دقیق کتابیں لکھی ہیں اور اس آیت کے ایک لفظ ''ذبحِ عظیم'' کو شہادت امام حسین علیہ السلام کا مصداق قرار دیا ہے۔ اس وقت (اوائل ۲۰۱۳ء) میں علامہ طاہر القادری کا پاکستان میں طوطی بول رہا ہے اور آپ کی یہ عظیم کاوش (کتاب) پاکستان میں ہر جگہ دستیاب ہے، جو آپ کے عشقِ پنجتنِ پاک اور عقیدۂ ولایت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۷۔ سورۂ الشوریٰ (۴۲)۔ آیت ۲۳۔ آیۂ مودت۔ ترجمہ: ''اے رسول تم کہہ دو کہ میں اس تبلیغ رسالت کا اپنے قرابت داروں (اہل بیت) کی مودت کے سوا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔۔۔۔''

''مودت'' کے عام معنی محبت ہیں مگر محض محبت سے اس لفظ کے معنی بیان نہیں ہوتے۔ مودت ایسی محبت ہے جس میں گہری وابستگی اور اطاعت بھی شامل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ''قربیٰ'' کی مودت فرض قرار دے کر چاہتا ہے کہ امت رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے ایسی محبت کرے جس میں گہری وابستگی اور اطاعت کا جذبہ پنہاں ہو تا کہ مسلمان کی زندگی دنیا کے لئے نمونہ بن جائے۔

تفسیر ''دُرِّ منثور'' از امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی میں آیۂ مودت کی تفسیر میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی تحریر ہے:

''امام ابن منذر ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب

یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کی، یارسول اللہ آپ کے قریبی کون ہیں؟ جن سے محبت کرنا واجب ہے۔ آپؐ نے فرمایا، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور آپؐ کے دونوں بیٹے۔ (تفسیر طبری، زیرِ آیت ہذا، جلد ۲۵، ص ۳۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

"تفسیر ابن کثیر" میں بھی یہی بات قدرے تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ بلکہ اس میں اس روایت کو بھی شامل کیا ہے کہ جب جناب علی ابن الحسین (جناب سجادؑ) کو بعد واقعہ کربلا دمشق قید کرکے لایا گیا اور ایک شامی نے ان سے گستاخی کی تو آپؑ نے اسی آیت کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ اس آیت میں جن قربیٰ سے مودت کا حکم دیا گیا ہے وہ ہم ہی ہیں۔

اس کے علاوہ بہت سی تفاسیر میں "قربیٰ" سے مراد پنجتن پاک ہیں۔ تفصیلات سے اجتناب کرتے ہوئے ہم مندرجہ بالا دو تفاسیر کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

حکمِ رب ہے بس مودّت اقربا کی چاہئے
اجرتِ کارِ رسالت پر ہے اعلانِ رسولؐ

۸۔ سورۂ الدخان (۴۴)۔ آیت ۲۹۔ ترجمہ: "تو ان لوگوں پر آسمان و زمین کو بھی رونا نہ آیا۔"

اس آیت کی تفسیر میں حافظ سید فرمان علی کا حاشیہ: ------ صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ شہید ہوئے تو اس مصیبت پر آسمان بھی رویا اور آسمان کا رونا اس کا سرخ ہو جانا ہے۔ اسی کی مؤید وہ روایت ہے جسے علامہ ابن حجر عسقلانی نے صواعق محرقہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا ایک دفعہ کربلا سے گزر ہوا۔ جب قبر حسینؑ کی جگہ پہونچے تو فرمایا: یہی ہمارے اونٹوں کے بٹھانے کی اور اسباب رکھنے کی جگہ ہے، یہی ہمارے خون بہائے جانے کی جگہ ہے۔ رسولؐ کے اہلِ بیتؑ میں سے کچھ لوگ اسی میدان میں قتل کیے جائیں گے جن پر آسمان بھی روئے گا اور زمین بھی۔

(بہت سے انبیاء کے مقام کربلا سے گزرنے اور گریہ کرنے کی روایات بھی کتب میں موجود ہیں)۔

۹۔ سورۂ الاحقاف (۴۶)۔ آیت ۱۵۔ ترجمہ: "اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا (کیونکہ) اس کی ماں نے رنج ہی سے اس کو جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھائی کے تیس مہینے ہوئے۔"

(حاشیہ حافظ سید فرمان علی صاحب): اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم حمل چھ مہینے ہے کیونکہ خدا دوسری جگہ فرماتا ہے 'مائیں اپنے بچوں کو دو برس کامل دودھ پلاتی ہیں) مگر تاریخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ چھ مہینے میں پیدا ہونے والا بچہ حضرت عیسیٰؑ اور امام حسینؑ کے سوا کوئی دوسرا زندہ نہیں رہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کم سے کم اکیس مہینے بچوں کو دودھ پلانا چاہیے کیونکہ تیس میں سے نو مہینے حمل کے نکال کر اکیس بچتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ جب جناب امام حسینؑ شکمِ جناب سیدہؑ میں تھے تو ماں سے باتیں کیا کرتے تھے جنہیں سن کر جناب فاطمہؑ پریشان ہو جاتی تھیں اور گریہ فرماتی تھیں۔ امامؑ کہتے تھے "اماں میں پیاسا ہوں، اماں میں بھوکا ہوں، اماں میں عریاں ہوں۔" جب ان باتوں کا ذکر بی بی نے جناب رسالت مآبؐ سے کیا تو آپؐ نے بیٹی کو تسلی دی اور امام مظلوم پر پیش آنے والے حالات سے آگاہ فرمایا۔

۱۰۔ سورۂ الرحمٰن (۵۵)۔ آیت ۲۲۔ ترجمہ: "دونوں دریاؤں سے موتی، مونگے نکلتے ہیں" جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا "لولو و مرجان" سے مراد حسن اور حسین علیہم السلام ہیں۔ (حوالہ مفسر قرآن ڈاکٹر محمد حسن رضوی کی معنوی تفسیر)۔ دیگر بالواسطہ حوالے: حافظ سید فرمان علی صاحب کا ترجمہ و تفسیر قرآن۔ تفسیر "دُرِ منثور" بروایت سعید بن جبیر، سفیان ثوری، "مجمع البیان" بروایت حضرت سلمان فارسیؓ، تفسیر قمی وغیرہ۔

سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی نعمات کا ذکر کیا ہے۔ حضرات پنجتنؑ بھی اللہ کی خاص نعمت ہیں، سو ان کا تذکرہ اس سورے میں کیوں نہ ہوتا۔ اگر لولو و مرجان سے مراد صرف موتی مونگے یا چھوٹے بڑے سچے موتی لیا جائے تو اللہ کے نزدیک یہ کوئی ایسی بڑی نعمات نہیں جنہیں جتلایا جائے۔

معدنِ عصمت ، امامت اور نبوّت سیدۃ
اور ہیں حسنینؑ گویا لعل و مرجانِ بتولؑ

۱۱۔سورۂ الدہر (۷۶)۔آیت ۷، ۸ اور ۹۔ترجمہ: "یہ بندے نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔یہ اس کی محبت میں یتیم، مسکین اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) ہم صرف اللہ کی مرضی کی خاطر تمہیں کھلاتے ہیں۔اور نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔"

زمخشری اور فخر الدین رازی دونوں نے نقل کیا ہے کہ یہ آیات کریمہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔جب حضرات حسنؑ و حسینؑ بیمار ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو نذر ماننے کی دعوت دی تو انہوں نے مع جناب فاطمہؑ اور فضہؓ کے تین تین روزوں کی نذر مان لی۔اور جب شفا کے بعد روزے رکھے تو تین صاع جَو لے آئے۔جناب فاطمہؑ نے ایک صاع کی پانچ پانچ روٹیاں تینوں دن تیار کیں اور وقت افطار کبھی مسکین، کبھی یتیم اور کبھی اسیر آ گیا اور سب نے اپنی اپنی روٹیاں اس کے حوالے کر دیں اور پانی سے افطار کر لیا۔تیسرے دن پیغمبر اکرمؐ نے یہ حال دیکھا تو پریشان ہوئے اور جبرئیلؑ سورۂ ھل اتیٰ لے کر نازل ہوئے کہ یہ اہل بیت کے ایثار کی جزا ہے۔

سورۂ ھل اتیٰ (یا سورۂ انسان یا سورۂ الدہر) پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔اور اسے مندرجہ بالا روایت کے پس منظر میں پڑھا جائے تو روح سرشار ہو جاتی ہے۔حضرات اہل بیت کی کیا شان جود و سخا ہے اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی کیا شان عطا ہے۔تین روز کی پانچ پانچ روٹیوں یعنی کل پندرہ روٹیوں کے عوض اللہ تعالیٰ نے دوگنے سے بھی زیادہ کر کے اکتیس آیات کا سورہ عنایت فرما دیا۔

دیتے جاؤ روٹیاں اور لیتے جاؤ آیتیں
ہل اتیٰ رب نے عطا کی بر عطائے پنجتنؑ

کیا عطائے سیدۃ پہ ہے عطا اللہ کی
دوگنی آیات میں ڈھل کے آئیں روٹیاں

۱۲۔ سورۃ الفجر (۸۹)۔ آیت ۱ اور ۲۔ ترجمہ: "صبح کی قسم اور دس راتوں کی قسم"

ان آیات کی تشریح حافظ سید فرمان علی صاحب نے حاشیہ میں اس طرح فرمائی ہے:
محمد بن نصر نے کتاب الصلوٰۃ میں ابی عثمان سے روایت کی ہے کہ لوگ تین عشروں کی بہت تعظیم کرتے تھے، ذی الحجہ و محرم کا پہلا عشرہ اور رمضان المبارک کا اخیر عشرہ، دیکھو تفسیر دُرِّ منثور جلد ۶ ص ۳۴۶، سطر ۱۰، مطبوعہ مصر۔ ان آیات کی مزید تشریح مرحوم خواجہ محمد لطیف انصاری اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے اپنی کتاب "کربلا کی کہانی، قرآن کی زبانی" میں بہت دلآویز اور مدلل انداز میں کی ہے۔ آپ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں صرف ۸ سے ۱۰ ذی الحجہ تک کی اہمیت ہے، دسوں شبوں کی نہیں۔ اسی طرح حدیث کی روشنی میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں طاق راتوں میں نزول قرآن کا اشارہ ہے اور لیلۃ القدر کو صرف رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کا حکم ہے۔ صرف محرم الحرام کا پہلا عشرہ ایسا ہے جس میں نواسۂ رسولؐ پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ اسی لئے پوری دنیا میں اس عشرے کی تمام راتوں میں ذکر حسینؑ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ان کی اور ان کے انصاران باوفا کی شہادت اور قربانی کی یاد منائی جاتی ہے۔

اسی سورہ (الفجر) کی آیت ۲۷۔۲۸۔ ترجمہ: (اور اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں سے کہے گا) اے اطمینان پانے والی جان، اپنے پروردگار کی طرف چل۔ تو اس سے خوش وہ تجھ سے راضی، تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں ایک مختصر عرصہ کے لئے اور ایک خاص کام کے لئے بھیجا۔ تخلیق آدمؑ اور اس کا زمین پر خلیفہ بنایا جانا یوں ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جابجا اس کی تصریح موجود ہے کہ انسان کو دنیا میں اختیار کے ساتھ امتحان کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس آیت میں ان بزرگ لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو احکام الٰہی پر بھرپور اطمینان کے ساتھ عامل ہوئے تو اللہ ان سے خوش ہو گیا اور نوید دی کو وہ اس کے خاص بندوں میں شامل ہو کر بہشت میں داخل ہو جائیں۔

اس میں کیا شک ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے اسلام کی آبیاری کے لئے مکمل اطمینان سے اپنی زندگی اللہ کے حضور پیش کر دی۔ مدینہ سے روانگی سے پہلے جب قبر رسولؐ پر گئے اور جو ہدایات ناناؐ نے نواسے کو دیں، ان پر بھرپور طرح سے عمل کرتے ہوئے، روز عاشورہ جام شہادت نوش فرمالیا۔ یقیناً ایسے ہی لوگوں سے اللہ کہہ سکتا ہے کہ اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف آجا، تو اس سے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ اب میرے خاص بندوں میں شامل ہو کر داخلِ جنت ہو جا۔ بہت سے مفسرین اور علماء نے اس آیت کا مصداق امام مظلوم کو قرار دیا ہے۔

مختصر یہ کہ اس آیت کی تشریح ایک طویل مقالے یا کتاب کی متقاضی ہے۔

۱۳۔ سورۂ العصر (۱۰۳)۔ پورا سورہ۔ ترجمہ: "عصر کی قسم انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے اور آپس میں حق کا حکم اور صبر کی وصیت کرتے رہے۔"

عصرِ عاشور کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب حضرت امام حسینؑ کے ایمان کامل، اعمال صالح، حق اور صبر کی تعلیم پر نظر دوڑائیں تو ان سے زیادہ اس سورے کا مخاطب کوئی اور نظر نہیں آتا۔

صرف صبر اور حق کی وصیت جو امام مظلومؑ نے کی اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ عرفان کی کس منزل پر تھے۔ دعائے عرفہ کے ذریعہ اور مدینہ سے روانگی سے لے کر وقت شہادت تک ہر ہر مقام پر آپؑ نے خطبات اور فرمودات کے جو جواہر پیش کئے ہیں، تاریخ انسانی میں اس کی نظیر نہیں ہے۔ اس سورہ کے ذریعہ مختصر ترین الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے زمانے یا وقت کی قسم کھا کر انسان کامل کی زندگی کا خلاصہ بیان فرما دیا ہے۔ حسینؑ بھی ایسی ہی ہستی کا نام ہے جسے اگر اسلام کے مترادف کہا جائے تو بے جا نہیں۔

۱۴۔ سورۂ الکوثر (۱۰۸)۔ پورا سورہ۔ ترجمہ: "اے رسولؐ! ہم نے تم کو کوثر عطا کیا، تم تو اپنے پروردگار کی نماز پڑھا کرو اور قربانی دیا کرو، بے شک تمہارا دشمن بے اولاد رہے گا۔"

مکہ کے کفار اور مشرک حضور اکرمؐ کو اولاد نرینہ نہ ہونے (یا بچپن میں فوت ہو جانے) کی وجہ سے بے اولاد یا منقطع النسل ہونے کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ سورہ

نازل فرمایا کہ اے رسول ہم نے تمہیں خیر کثیر (فاطمہ جیسی بیٹی) عطا کی ہے جو سراپا خیر ہے اور تمہاری نسل کی ضامن ہے۔ تمہارا دشمن ہی ابتر ہے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی نسل مبارک جناب فاطمہؑ سے چلی۔ ان سے گیارہ امام معصوم پیدا ہوئے اور آج تک بلکہ قیامت تک ان کی نسل کے ذریعہ ہدایت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ شہزادیؑ کا یہ اعزاز سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کے ذریعہ سے ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک باقی رہے گا۔

والفجر، والعصر، نفسِ مطمئن، ذبحِ عظیم
ہیں لبِ قرآں پہ کیا کیا لفظ شایانِ حسینؑ
نسیم امروہوی

بے شک ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا

رمضان المبارک وہ مبارک مہینہ ہے جسے "شہر اللہ" یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ سورۂ قدر کی پہلی آیت میں اللہ نے فرمایا: "بے شک ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے۔" یعنی قرآن مجید، فرقان حمید رمضان المبارک کی ایک مبارک شب میں نازل ہوا۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، جسے لوح محفوظ سے روح الامین جناب جبرئیلؑ لے کر آئے اور قلب جناب رسالت مآبؐ پر اس کا نزول ہوا۔ اس کا بھیجنے والا ربّ برحق، اسے لانے والا امین اور جس پر یہ نازل ہوا وہ بھی رسول برحق ہے۔ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اس میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے باطل کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اس میں کہیں کوئی کجی نہیں۔ اس میں خشک وتر کا ذکر موجود ہے۔ یہ احسن الحدیث کا مصداق ہے۔ اس میں بیان کیے ہوئے تمام واقعات اور قصے سچے ہیں۔ یہ اتنا پراثر ہے جس سے پہاڑ چل سکتے ہیں، مردے کلام کر سکتے ہیں اور زمین وزمان کے فاصلے سمٹ سکتے ہیں۔ اس نے تمام سابقہ کتب آسمانی کی تصدیق کی ہے۔ یہ نوع بشر انسانی کا راہ نما ہے۔ اس میں علم و حکمت، ہدایت اور رحمت کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ ہر روحانی اور جسمانی مرض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مبارک ذکر ہے جو بابرکت لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ اس کی تلاوت عبادت ہے حتیٰ کہ اس پر نظر ڈالنا بھی باعث ثواب ہے۔ یہ فکر وتدبر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ حیات انسانی کے بڑے سے بڑے مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن وہ نور ہے جس کی شعاعیں کبھی ماند نہیں ہوں گی۔ یہ نور ہمیشہ انسان کو جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر سعادت ابدی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ سورۂ ابراہیم، پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "الٓرٰ۔ یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے آپؐ پر نازل کی تاکہ

آپ پروردگار کے فرمان سے لوگوں کو (شرک اور ظلم) کی تاریکیوں سے نکال کر (ایمان، عدل اور صلح) کی روشنی، عزیز وحمید، اللہ کی طرف لے جائیں۔" سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹، میں ارشاد باری ہے: "بالیقین، یہ قرآن نہایت سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔"

قرآن وہ کتاب ہے جس کے ذریعے دنیا کی پسماندہ ترین قوم اس طرح سے تبدیل ہوئی کہ باقی اقوام کے لیے نمونہ بن گئی۔ اس نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جو ہمیشہ کے لیے مثال بن گیا۔

قرآن کے بارے میں:

آیئے دیکھتے ہیں اپنے بارے میں خود قرآن کیا کہتا ہے:

سورۂ البقرہ (۲)، آیت ۹۷: اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ جو شخص بھی جبریلؑ کا دشمن ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریلؑ نے آپؐ کے دل پر قرآن اللہ کے حکم سے اتارا ہے جو سابق کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے، ہدایت اور صاحبان ایمان کے لیے بشارت ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "بشریٰ" کہا گیا ہے)۔

سورۂ البقرہ (۲)، آیت ۱۴۵: اگر آپؐ ان اہلِ کتاب کے پاس تمام آیتیں بھی پیش کردیں کہ یہ آپؐ کے قبلہ کو مان لیں تو ہرگز نہ مانیں گے اور آپ بھی ان کے قبلہ کو نہ مانیں گے اور یہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتے اور علم کے آجانے کے بعد اگر ان کی خواہشات کا اتباع کرلیں گے تو آپ کا شمار ظالموں میں ہو جائے گا۔ (اس آیت میں قرآن کو "علم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ البقرہ (۲)، آیت ۲۵۶: دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کی مضبوط رسّی سے متمسک ہو گیا ہے جس کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے اور اللہ سمیع بھی ہے اور علیم بھی ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "عروۃ الوثقیٰ (مضبوط رسی)" کہا گیا ہے)۔

آل عمران (۳)، آیت ۶۰: حق تمھارے پروردگار کی طرف سے آچکا ہے لہٰذا خبردار اب

تمھارا شمار شک کرنے والوں میں نہ ہونا چاہیے۔(اس آیت میں قرآن کو"حق" کہا گیا ہے)۔

سورۂ آل عمران (۳)، آیت ۶۱: (آیۂ مباہلہ) اے پیغمبرؐ! علم کے آجانے کے بعد جو لوگ تم سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجیے کہ آؤ، ہم لوگ اپنے اپنے فرزندوں، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر اللہ کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت قرار دیں۔(سورۂ النساء کی آیت ۱۴۵ کی طرح اس آیت میں بھی قرآن کو"علم" کہا گیا ہے)

سورۂ آل عمران (۳)، آیت ۱۰۳: اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کردی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم جہنم کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں نکال لیا اور اللہ اسی طرح اپنی آیتیں بیان کرتا ہے کہ شاید تم ہدایت یافتہ بن جاؤ۔(اس آیت میں قرآن کو"حبل اللہ (اللہ کی رسی)" کہا گیا ہے)۔

سورۂ آل عمران (۳)، آیت ۱۳۸: یہ عام انسانوں کے لیے ایک بیان حقائق ہے اور صاحبان تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔(اس آیت میں قرآن کو"بیان حقائق" کہا گیا ہے)۔

سورۂ آل عمران (۳)، آیت ۱۹۳: پروردگار ہم نے اس منادی کو سنا جو ایمان کی آواز لگا رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے۔ پروردگار اب ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری برائیوں کی پردہ پوشی فرما اور ہمیں نیک بندوں کے ساتھ محشور فرما۔ (اس آیت میں قرآن کو"منادی" کہا گیا ہے)۔

سورۂ النساء (۴)، آیت ۱۷۴: اے انسانو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان آچکا ہے اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور بھی نازل کردیا ہے۔(اس آیت میں قرآن کو"نور" کہا گیا ہے)۔

سورۂ المائدہ (۵)، آیت ۴۸: اور اے پیغمبرؐ ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی

ہے جو اپنے پہلے کی توریت اور انجیل کی مصدق اور محافظ ہے، لہٰذا آپ ان کے درمیان تنزیل الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں اور اللہ کی طرف سے آئے ہوئے حق سے الگ ہو کر ان کی خواہشات کا اتباع نہ کریں۔ ہم نے سب کے لیے الگ الگ شریعت اور راستہ مقرر کر دیا ہے اور اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ اپنے دیے ہوئے قانون سے تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے لہٰذا تم سب نیکیوں کی طرف سبقت کرو کہ تم سب کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے۔ وہاں وہ تمہیں ان تمام باتوں سے باخبر کرے گا جن میں تم اختلاف کر رہے تھے۔ (اس آیت میں قرآن کو "مہیمن (مصدق اور محافظ)" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الانعام (۶)، آیت ۱۱۵: اور آپؐ کے رب کا کلمہ قرآن صداقت اور عدالت کے اعتبار سے بالکل مکمل ہے۔ اس کا کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "صدقاً و عدلاً" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الانعام (۶)، آیت ۱۵۳: اور یہ ہمارا سیدھا راستہ ہے۔ اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ جاؤ کہ اللہ کی راہ سے الگ ہو جاؤ گے۔ اسی پروردگار نے ہدایت دی ہے کہ اس طرح شاید متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ (اس آیت میں قرآن کو "صراط مستقیم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الاعراف (۷)، آیت ۲۰۳: اور اگر آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہ لائیں تو کہتے ہیں کہ خود آپ کیوں نہیں منتخب کر لیتے۔ تو کہہ دیجیے کہ میں تو صرف وحی پروردگار کا اتباع کرتا ہوں۔ یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے دلائل ہدایت اور صاحبان ایمان کے لیے رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "بصائر (دلائلِ ہدایت)" کہا گیا ہے)۔

سورۂ توبہ (۹)، آیت ۶: اور اگر مشرکین میں کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کی کتاب سنے۔ اس کے بعد اسے آزاد کر کے جہاں اس کی پناہ گاہ ہو وہاں تک پہنچا دو اور یہ مراعات اس لیے ہے کہ یہ جاہل قوم حقائق سے آشنا نہیں ہے۔ (اس آیت میں

قرآن کو "کلام اللہ" کہا گیا ہے۔

سورۂ یونس (۱۰)، آیت ۱: الٓرٰ۔ یہ پر از حکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔ (اس آیت میں قرآن کو "حکیم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ یونس (۱۰)، آیت ۵۷: اے انسانو! تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا کا سامان اور ہدایت اور صاحبان ایمان کے لیے رحمت، قرآن آچکا ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "موعظہ، شفاء، ہدایت اور رحمت" کہا گیا ہے)۔

سورۂ ابراہیم (۱۴)، آیت ۵۲: بے شک! یہ قرآن لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے تا کہ اسی کے ذریعہ انہیں ڈرایا جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہی اِلٰہِ واحد و یکتا ہے اور پھر صاحبان عقل نصیحت حاصل کریں۔ (اس آیت میں قرآن کو "بلاغ" کہا گیا ہے)۔

سورۂ بنی اسرائیل (۱۷)، آیت ۹: بے شک! یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان صاحبان ایمان کو بشارت دیتا ہے جو نیک اعمال بجالاتے ہیں کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "ہادی" کہا گیا ہے)۔

سورۂ بنی اسرائیل (۱۷)، آیت ۸۲: اور ہم قرآن میں وہ سب کچھ نازل کر رہے ہیں جو صاحبان ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالمین کے لیے خسارہ میں اضافہ کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔ (اس آیت میں قرآن کو "شفا اور رحمت" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الکہف (۱۸)، آیت ۲: اسے بالکل ٹھیک رکھا ہے تا کہ اس کی طرف سے آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے اور جو مومنین ٹھیک اعمال کرتے ہیں انہیں بشارت دے دو کہ ان کے لیے بہترین اجر ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "قیم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الانبیاء (۲۱)، آیت ۴۵: آپ کہہ دیجیے کہ میں تم لوگوں کو وحی کے مطابق ڈراتا ہوں اور بہرہ کو جب بھی ڈرایا جاتا ہے وہ آواز کو سنتا ہی نہیں ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "وحی" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الانبیاء (۲۱)، آیت ۵۰: اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا

ہے تو کیا تم لوگ اس کا بھی انکار کرنے والے ہو۔ (اس آیت میں قرآن کو "ذکرِ مبارک" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الانبیاء (۲۱)، آیت ۱۰۵: اور ہم نے ذکر کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے۔ (اس آیت میں قرآن کو "زبور" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الفرقان (۲۵)، آیت ۱: بابرکت ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا ہے تاکہ وہ سارے عالمین کے لیے عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بن جائے۔ (اس آیت میں قرآن کو "فرقان" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الشعراء (۲۶)، آیت ۱۹۲: اور یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل ہونے والا ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "تنزیل" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الزمر (۳۹)، آیت ۳۳: جو شخص صداقت کا پیغام لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ درحقیقت صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگار ہیں۔ (اس آیت میں قرآن کو "صدق" کہا گیا ہے)۔

سورۂ فصلت (۴۱)، آیت ۴: یہ قرآن بشارت دینے والا اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بنا کر نازل کیا گیا ہے لیکن اکثریت نے اس سے اعراض کیا ہے اور وہ کچھ سنتے ہی نہیں ہیں۔ (اس آیت میں قرآن کو "بشیر اور نذیر" کہا گیا ہے)۔

سورۂ فصلت (۴۱)، آیت ۴۱: بے شک جن لوگوں نے قرآن کے آنے کے بعد اس کا انکار کر دیا ان کا انجام برا ہے اور یہ ایک عالی مرتبہ کتاب ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "عزیز (بمعنی عالی مرتبت)" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الشوریٰ (۴۲)، آیت ۵۲: اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی کی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کن چیزوں کا نام ہے لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا ہے جس کے ذریعہ اپنے بندوں میں جسے چاہتے ہیں

اسے ہدایت دیتے ہیں اور بے شک آپ لوگوں کو سیدھے راستہ کی ہدایت کر رہے ہیں۔ (اس آیت میں قرآن کو "روح" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الزخرف (۴۳)، آیت ۴: اور یہ ہمارے پاس لوح محفوظ میں نہایت درجہ بلند اور پُر از حکمت کتاب ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "علی وحکیم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الدخان (۴۴)، آیت ۲: روشن کتاب کی قسم۔ (اس آیت میں قرآن کو "کتاب مبین" کہا گیا ہے)۔

سورۂ القمر (۵۴)، آیت ۵: انتہائی درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں لیکن انہیں ڈرانے والی باتیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ (اس آیت میں قرآن کو "حکمت" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الواقعہ (۵۶)، آیت ۷۷: یہ بڑا محترم قرآن ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "قرآنِ کریم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الطلاق (۶۵)، آیت ۵: یہ اللہ کا حکم ہے جسے تمہاری طرف اس نے نازل کیا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کی برائیوں کو دور کر دیتا ہے اور اس کے اجر میں اضافہ کر دیتا ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "امر اللہ" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الحاقہ (۶۹)، آیت ۴۸: اور یہ قرآن صاحبانِ تقویٰ کے لیے نصیحت ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "تذکرہ" کہا گیا ہے)۔

سورۂ الجن (۷۲)، آیت ۱: پیغمبر آپ کہہ دیجیے کہ میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے کان لگا کر قرآن کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "عجیب" کہا گیا ہے)۔

سورۂ النبا (۷۸)، آیت ۲: بہت بڑی خبر کے بارے میں۔ (اس آیت میں قرآن کو "نبا العظیم" کہا گیا ہے)۔

سورۂ عبس (۸۰)، آیت ۱۳: یہ باعزت صحیفوں میں ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "صحفِ مکرّمہ" کہا گیا ہے)۔

سورۂ البروج (۸۵)، آیت ۲۱ اور ۲۲: یقیناً یہ بزرگ و برتر قرآن ہے جو لوحِ محفوظ میں محفوظ کیا گیا ہے۔ (اس آیت میں قرآن کو "مجید" اور "لوحِ محفوظ میں محفوظ" کہا گیا ہے)۔

مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام:

تحکیم کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم نے انسانوں کو حکم نہیں بنایا تھا بلکہ قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہوئے تھے اور یہ وہی قرآن ہے جو دو دفتیوں کے درمیان لکھا ہوا تحریر کی صورت میں موجود ہے۔ وہ زبان سے تو بولتا نہیں۔ اس کے لیے ترجمان کی ضرورت ہے۔ انسان وہ ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور جب ان لوگوں نے ہم کو دعوت دی کہ ہم قرآن کو حکم قرار دیں تو ہم ایسی جماعت نہیں ہے کہ جو قرآن سے روگردانی کرنے والی ہو۔"

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

اللہ کی کتاب تمہارے درمیان موجود ہے۔ یہ وہ بولنے والا ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں۔ یہ وہ عمارت ہے جس کے ستون گرنے والے نہیں اور یہ وہ سرمایۂ عزت ہے جس کے حامی شکست کھانے والے نہیں۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۱)۔

شہزادی کونین جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا:

مولائے کائنات کے ارشادات گرامی کے بعد شہزادی کونین جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کا بیان قرآن مجید کے بارے میں جو انہوں نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا، پیش خدمت ہے:

"اللہ کا تمہارے ساتھ ایک عہد و پیمان ہے جو پہلے ہی تمہیں بتا دیا ہے۔ اور تمہارے درمیان اللہ کی ایک یادگار ہے جسے اس نے تم پر خلیفہ مقرر کیا ہے، اللہ کی کتاب جو کہ حکم کو بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب وہی قرآن ہے جو برحق، پھیلا ہوا نور اور عالم گیر حقیقت ہے اور درخشندہ روشن کتاب ہے۔ اس کے بصیرت افروز دلائل، واضح اور روشن ہیں۔ اس کے اسرار و رموز قابل فہم ہیں۔ قرآن کے ظواہر بھی واضح اور آشکار ہیں۔ قرآن کے پیروکار

قرآن ہی کی وجہ سے قابل رشک ہیں۔ قرآن اپنے پیروکاروں کو مقام رضوان یا جنت کی طرف رہبری کرتا ہے۔ قرآن اپنے تدبر سے سننے والوں کو نجات کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نورانی دلائل قرآن ہی کے واسطے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی جانب سے بیان کیے ہوئے واجبات اور منع کیے ہوئے محرمات کو قرآن بیان کرتا ہے۔ اللہ کے روشن اور آشکار دلائل نیز ضمیر کو مطمئن کرنے والے برہان، قرآن ہی کے ذریعہ تم تک پہنچے۔ مستحبات کی فضیلتیں، مباح چیزوں میں اللہ کی طرف سے دی ہوئی آزادی عمل اور قرآن میں لکھی ہوئی شریعت سے قرآن ہی کی بدولت آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ شریعت کے دوسرے مکتوب قوانین بھی قرآن بیان کرتا ہے۔"

اس بیان کے ذریعہ شہزادیؑ نے اس حدیث رسول کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں حضور اکرمؐ نے فرمایا: "عنقریب مجھے بلایا جائے گا۔ میں تمہارے درمیان دو قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت۔" بعض لوگ حدیث اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "میں تمہارے درمیان کتاب اللہ چھوڑے جا رہا ہوں۔" اگر اس حدیث کو بھی مان لیا جائے تو اللہ کی کتاب قرآن خود ہمیں اہلِ بیت کی طرف راہنمائی کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ "اے میرے حبیب! ان سے کہہ دو کہ تبلیغِ رسالت کے حوالے سے سوائے اہلِ بیت کی محبت کے اور کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا۔" (سورۂ شوریٰ (۴۲)، آیت ۲۳)۔ دوسری اہم بات جس کی طرف شہزادیؑ نے متوجہ کیا ہے وہ یہ کہ قرآن مجید میں احکامات بہت واضح، مدلل اور حتمی ہیں۔ زندگی کے ہر ہر معاملے میں اس سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام:

امام زین العابدینؑ نے معارف قرآن کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

"قرآن کی آیات خزانے ہیں۔ جب بھی خزانہ کو کھولا جائے تو تم دیکھو کہ اس میں کیا ہے۔" (اصول کافی ج ۲، ص ۶۰۹)۔

امام محمد باقر علیہ السلام:

اصول کافی میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا:

''جس شخص نے نماز میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھا، اللہ نے اس کے ہر ایک حرف کے بدلے سو نیکی لکھ لی۔ جس نے نماز میں بیٹھ کر قرآن پڑھا، اللہ نے اس کے ہر حرف کے بدلے پچاس نیکیاں لکھ لیں اور جس نے بغیر نماز کے قرآن پڑھا، اللہ نے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں تحریر کر لیں۔''

امام جعفر صادق علیہ السلام:

''اصول کافی'' میں قرآن حکیم کے بارے میں امام ششمؑ کے فرمودات:

ا۔ ہر چیز کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف لوٹائی جاتی ہے اور جو بھی حدیث کتاب اللہ کے مطابق نہ ہو، جھوٹی ہے۔''

۲۔ جس گھر میں مسلمان رہتے ہوں اور قرآن کی تلاوت کرتے ہوں وہ گھر اہل آسمان کو اس طرح نظر آتا ہے جیسے اہل ارض کو کوکب دری دکھائی دیتا ہے۔ اس گھر میں برکت ہوتی ہے اور ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔''

۳۔ مومن کے لیے ضروری ہے کہ جب تک قرآن نہ سیکھ لے یا اس کی تعلیم حاصل نہ کر رہا ہو، موت کی خواہش نہ کرے۔

۴۔ شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کے اعتقادیہ میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: قرآن ایک ہے ایک اللہ کے پاس سے ایک نبی پر نازل ہوا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ راویوں کی طرف سے ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام:

احتجاج طبرسی جلد ۲ میں امام علی نقیؑ کا ایک مراسلہ منقول ہے جو آپ نے اہلِ اہواز کے نام تحریر فرمایا۔ ''یقیناً یہ قرآن حق ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ یہ بات تمام فرقوں کے نزدیک مسلم ہے اور حد اجماع کو پہنچ چکی ہے اور اس اجماع کے بارے میں یہ تمام

فرقے ہدایت و درستی پر ہیں کیوں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔ پس آپ نے فرمایا: جس پر تمام لوگ جمع ہو جائیں اور آپس میں مخالفت نہ کریں وہ حق ہے۔

قصہ مختصر، اللہ کے کلام کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم تک پہونچایا۔ آپؐ کے پردہ فرمانے کے بعد ان کے جانشینوں یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام نے جانوں پر کھیل کر اس کی حفاظت کی۔ یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام نے بعد شہادت نوک نیزہ سے تلاوت قرآن فرمائی۔ مقام فکر ہے کہ اس موقع پر اپنی مظلومیت یا خود پر ہونے والے مظالم کو بیان نہیں کیا بلکہ اللہ کے پیغام کو بیان کر کے ثابت کیا کہ حسینؑ کی یہ جدوجہد ذاتی مقصد کے لیے نہیں بلکہ دین اسلام کی آبیاری کے لیے تھی، توحید و رسالت کی سربلندی کے لیے تھی۔

مآخذ

(۱) ''انوار القرآن'' ترجمہ و تفسیر علامہ السید ذیشان حیدر جوادی، (۲) ''القرآن الکریم'' ترجمہ و حواشی از تفسیر نمونہ۔ مترجمہ: علامہ سید صفدر حسین نجفی۔ (۳) ''خطبہ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا'' حضرت آیت اللہ العظمیٰ مختری۔ (۴) ''الاعجاز فی علوم القرآن'' مولانا سید سبط شبر زیدی۔ (۵) ''قرآن ہمارا عقیدہ'' ثاقب نقوی۔

قرآن اور غدیر

سن دس ہجری میں حضورؐ حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمان تھے۔ اس سے قبل حضرت علیؑ کو حضورؐ نے تبلیغ دین کے لئے یمن بھیجا تھا۔ حضرت علیؑ کی ہدایت سے ہمدان کا پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ واپسی میں حضرت علیؑ بھی مکہ پہونچ گئے اور یمن کے حالات بیان کر کے جو مال وہاں سے ملا تھا حاضر کیا۔ آنحضرتؐ بہت خوش ہوئے اور دریافت کیا یا علیؑ تم نے کیا نیت کی ہے۔ عرض کی جو نیت رسول کی ہے وہی میری ہے۔ میں قربانی کے لئے چونتیس اونٹنیاں لایا ہوں۔ فرمایا چھیاسٹھ میں لایا ہوں۔ اے علیؑ تم مناسک حج اور قربانی میں میرے شریک ہو۔

حج و قربانی سے فارغ ہو کر چودہ ذی الحج کو مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اٹھارہ ذی الحج کو مقام غدیر خم پر پہونچے۔ یہ مقام خارستاں تھا اور آب و گیاہ کے فقدان کی وجہ سے قابل نزول نہ تھا مگر بحکم الٰہی یہاں اترنا پڑا۔ یہاں سے چاروں طرف کو راستے جاتے تھے لہٰذا لوگ متفرق ہو جاتے اور پھر کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں یہ سب مجمع پایا جائے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ جو حکم سنایا جانے کو ہے وہ سب سن لیں۔ چنانچہ حضورؐ نے حکم دیا کہ خس و خاشاک صاف کئے جائیں۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت۔ لوگ سواریوں سے اترے اور اپنی چادریں اور پگڑیاں نیچے رکھ کر بیٹھ گئے۔ پالان شتر کا منبر بنایا گیا۔ حضورؐ اس پر تشریف فرما ہوئے۔ بعد حمد و ثنائے الٰہی پہلے اپنے مرنے کی خبر دی پھر فرمایا لوگو! میں تمھارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں: اللہ کی کتاب اور اپنی عترت اپنے اہل البیت۔ اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آئیں۔ دیکھو میرے بعد ان دونوں سے

سلوک کرنے میں احتیاط سے کام لینا اوران کے حقوق کی رعایت کرنا۔ پھر فرمایا کیا میں تمہارے نفسوں سے اولیٰ نہیں ہوں؟ ہر طرف سے آواز آئی بے شک آپ ہمارے نفسوں سے اولیٰ ہیں۔ پھر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ بھی مولا ہے۔ پھر حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر اتنا اٹھایا کہ سفیدی زیرِ بغل نمایاں ہوگئی۔ پھر دعا فرمائی: خداوندا! دوست رکھ اسے جو اسے دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے جو اسے دشمن رکھے۔ مدد کر اس کی جو اس کی مدد کرے اور ذلیل کر اس کو جو اسے ذلیل کرے۔

اس کے بعد سب نے مبارک باد دی۔ حضرت عمر نے کہا بخ بخ لک یا ابن ابی طالب قد اصبحت مولائی ومولیٰ کل مومن ومومنہ۔ اس حدیث من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کو صاحب ارجح المطالب نے بہت توضیح سے لکھا ہے اور سینئن وار ایک سو اکسٹھ ایسے لوگوں کے نام درج کئے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

یہ تھا واقعہ غدیر کا مختصر احوال جس کے لئے ہم نے مفسر قرآن عالی جناب ادیب اعظم مولانا السید ظفر حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی نقوی الامروہوی کے کتاب "سیرت علی علیہ السلام وحقائق ومعارف اسلام" سے استفادہ کا شرف حاصل کیا۔

اس واقعہ کی اہمیت کیا ہے اور کیا اس کا کوئی قرآنی پس منظر بھی ہے؟ آیئے اس کے لئے قرآن سے رجوع کرتے ہیں۔

پانچویں سورۂ مبارکہ "المائدہ" آیت ۶۷ میں ارشاد باری ہے: "یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک۔ وان لم تفعل فما بلغت رسلتہ۔ واللہ یعصمک من الناس۔ ان اللہ لا یھدی القوم الکفرین۔" ترجمہ: اے رسولؐ جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہونچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہونچایا اور (تم ڈرو نہیں) اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ ہرگز کافروں کی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۳ کا آخری حصہ: "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت

لکم الاسلام دینا۔" ترجمہ: آج میں نے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے اس دین اسلام کو پسند کیا۔

اب ان دو آیات مبارکہ کی تفسیر:

آیہ بلغ کی تفسیر ہر جگہ تفصیل سے موجود ہے۔ ہم نے اس کے لئے مولانا سید مقبول احمد دہلوی اعلی اللہ مقامہٗ کی تفسیر سے رجوع کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں بیشتر حوالے اہلِ سنت مفسرین کے دیئے گئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: "تفسیر عیاشی میں بھی روایت سے مختصراً اسی قدر واقعہ نقل ہوا ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں ثعلبی اور حسکانی وغیرہ کئی مفسرین اہلِ سنت سے قریب قریب یہی واقعہ درج کیا گیا ہے۔ کافی میں جناب امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث منقول ہے۔ جس کا ایک جزو یہ ہے کہ ولایت جناب امیر المومنینؑ کا حکم جمعہ کے دن، کہ عرفہ بھی تھا، آیا تھا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تھا کہ اکمالِ دین اور اتمام نعمت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت کا حکم سنا دینے پر موقوف ہے۔ جناب رسالت مآبؐ نے یہ عرض کیا کہ میری امت چونکہ ابھی ابھی کفر سے داخلِ اسلام ہوئی ہے تو اگر میں اپنے ابن عم کے بارے میں یہ اطلاع دوں گا تو کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ یہ بات میں نے زبان سے کسی سے نہیں کہی تھی بلکہ صرف میرے دل میں ایسا خیال گزرا تھا کہ اللہ کا دوسرا حکم تاکیدی پہونچا جس میں مجھے عذاب سے ڈرایا گیا تھا اگر اس حکم کو نہ پہونچاؤں۔ چنانچہ یہ پوری آیت "یاایھا الرسول بلغ۔" الخ۔ نازل ہوئی تو جناب رسالت مآبؐ نے جناب علی مرتضیٰؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا! ایھا الناس! جو انبیاء مجھ سے پہلے گزرے ہیں ان میں سے ہر ایک کا اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا، جب ان کو بلایا چلے گئے اب قریب ہے کہ میں بھی بلایا جاؤں اور چلا جاؤں، سوال مجھ سے بھی کیا جائے گا اور تم سے بھی۔ اس وقت تم کیا کہو گے؟ سب نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے احکام الٰہی پہونچائے۔ ہماری خیر خواہی کی جو کچھ آپؐ کے ذمہ تھا اسے آپؐ نے ادا فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں اور رسولوں سے افضل جزا آپ کو دے۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا! اللھم

اشھد۔ پھر ارشاد ہوا کہ اے گروہ مسلمین یہ علیؑ میرے بعد تم سب کا ولی اور والی ہے تم میں سے جو حاضر ہیں وہ غائب کو یہ خبر پہونچا دیں۔ جناب امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں، جناب رسالت مآبؐ چونکہ خلق خدا پر علم خدا کے اور اس دین کے جو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا تھا امین تھے، حق امانت ادا فرما گئے۔ نیز انہی حضرت نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو ولایت علیؑ کا حکم دیا اور ان پر آیۂ انما ولیکم اللہ ورسولہ الخ نازل فرمائی اور اولی الامر کی ولایت واجب کی مگر لوگ سمجھتے نہیں تھے کہ وہ کیا چیز ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ ولایت کی تفسیر ان کے لئے ایسی ہی کر دیں جیسے کہ نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ کی تفسیر کی تھی۔ جب اللہ کا یہ حکم پہونچا تو جناب رسالت مآبؐ کو کسی قدر تردد ہوا خوف یہ تھا کہ لوگ مرتد نہ ہو جائیں اور میری تکذیب نہ کریں۔ بس پروردگار عالم کی طرف رجوع کیا تو ادھر سے یہ وحی آئی ... یاایھا الرسول ... الخ۔ حضرتؐ نے امر الٰہی کی تعمیل کر دی۔ یوم غدیر خم "الصلوٰۃ جامعۃ" پکارے جانے کا حکم دیا اور علیؑ کو مولا مقرر فرمایا اور لوگوں کو یہ حکم دے دیا کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو اس امر کی خبر کر دے۔"

اب سورۂ مائدہ کی آیت ۳۔ "الیوم اکملت لکم دینکم" کی تفسیر کے لئے بھی مولانا سید مقبول احمد صاحب دہلویؒ سے رجوع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: تفسیر مجمع البیان میں جناب امام محمد باقرؑ اور جناب امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر روز غدیر خم جب جناب رسالت مآبؐ نے حضرت علی مرتضیٰؑ کو تمام حاضرین کے روبرو کل مخلوق کی ہدایت کے لئے ہادی مقرر فرمایا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان دونوں حضراتؑ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ آخری فریضہ تھا جس کے بعد کوئی اور فریضہ نازل نہیں ہوا۔ کافی میں جناب امام محمد باقرؑ سے یوں منقول ہے کہ ایک فریضہ دوسرے کے بعد نازل ہوتا رہا۔ ولایت سب سے آخری فریضہ تھا جس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: "الیوم اکملت لکم دینکم ... اس کا یہ مطلب ہے کہ میں تمہارے کل فرائض کو پورا کر چکا، اس کے بعد کوئی اور فریضہ نازل نہ کروں گا۔ تفسیر قمی اور تفسیر عیاشی میں بھی ان حضراتؑ سے قریب قریب یہی مضمون درج

ہے۔ (تصریح) دین کے اظہار کا ولایت واعلان خلافت پر کامل ہو جانا اس کے یہ معنی ہیں کہ جناب رسالت مآب کو پروردگار عالم نے جو علم سپرد فرمایا تھا وہ آپؐ نے علی مرتضیٰؑ کو عطا فرمایا اور جو اوصیاء ان کی اولاد میں ہونے والے تھے ان کو سلسلہ بہ سلسلہ پہونچا دیا۔ اور جب ان کو اپنا قائم مقام کر دیا اور لوگوں کو حرام وحلال کے بارے میں ان سے کل امور دریافت کرنے کا موقع مل گیا تو تمام امت کو یہ حکم دے دیا کہ وہ ہر معاملہ میں ان سے رجوع کریں۔ حلال وحرام انہیں سے دریافت کریں اور چونکہ ان کے یکے بعد دیگرے اس امر پر قائم ہونے سے بندوبست استمراری ہو گیا لہٰذا دین کامل ہو گیا اور نعمت پوری ہو گئی۔ (مذکورہ تفسیر بہت طویل ہے، مضمون کے اختصار کے پیش نظر اس کا صرف ایک حصہ پیش کیا گیا ہے۔)

سورۂ مائدہ کی ان دونوں آیات کے تفصیلی مطالب کے بیان میں واقعہ غدیر کا حوالہ قرآن مجید کی بیشتر تفاسیر میں موجود ہے سوائے ان جدید تفاسیر کے جو تعصب کی عینک لگا کر لکھی گئی ہیں۔ آیئے کچھ قدیم تفاسیر پر نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) تفسیر ''دُرِ منثور'' امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی:

سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ (یاایھا الرسول بلّغ ...)

امام ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت ابوسعد خدریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت علی شیر خداؑ کے متعلق غدیر خم کے روز رسول اللہؐ پر نازل ہوئی۔

امام ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے زمانہ میں یوں پڑھتے (یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیاً مولی المومنین) کہ حضرت علی شیر خدا مومنوں کے مولیٰ ہیں۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۳ (الیوم اکملتُ لکُم دینکُم و اتممت علیکم نعمتی. .)

''امام ابن مردویہ اور ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت سعید خدریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہؐ نے غدیر خم کے روز حضرت علیؑ کو اٹھایا اور ان کے لئے ولایت کا اعلان کیا تو جبرئیل امین یہ آیت لائے (تاریخ مدینہ دمشق، جلد ۴۲ صفحہ ۲۳۷،

دارالفکر، بیروت۔)

امام ابن مردویہ، خطیب اور ابن عساکر نے ضعیف سند سے حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب غدیر کا دن تھا۔ یہ ذی الحجہ کی اٹھارہ تاریخ تھی تو نبی کریمؐ نے فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

(۲) ''تفسیر ابن کثیر'' حافظ عمادالدین ابوالفدا ابن کثیر:

سورۂ مائدہ کی آیت ۳ (الیوم اکملتُ لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔۔)

''دو اقوال اس میں اور بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دن لوگوں کو نامعلوم ہے۔ دوسرا یہ کہ آیت غدیر خم کے دن نازل ہوئی ہے۔ جس دن کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کی نسبت فرمایا تھا کہ جس کا مولیٰ میں ہوں، اس کا مولیٰ علیؑ ہے۔ تو گویا ذی الحجہ کی اٹھارویں تاریخ ہوئی جب کہ آپ حجۃ الوداع سے واپس لوٹ رہے تھے۔

تفسیر ابن کثیر میں آیۂ تطہیر (سورۂ احزاب آیت ۳۳) کی تفسیر کے ذیل میں واقعہ غدیر کا ذکر کچھ اس طرح آیا ہے: ''.........صحیح مسلم شریف میں ہے کہ حضرت زید بن حبان فرماتے ہیں: میں اور حصین بن سبرہ اور عمر بن مسلمہ مل کر حضرت زید بن ارقمؓ کے پاس گئے۔ حصین کہنے لگے: اے زید آپ کو تو بہت بھلائیاں مل گئیں۔ آپ نے حضورؐ کی زیارت کی، آپ کی حدیثیں سنیں، آپؐ کے ساتھ جہاد کیے، آپؐ کے پیچھے نمازیں پڑھیں، غرض آپؓ کی بہت خیر و برکت پائی۔ اچھا ہمیں کوئی حدیث تو سنایئے۔ آپؓ نے فرمایا: بھتیجے اب میری عمر بڑی ہوگئی۔ حضورؐ کا زمانہ دور ہوگیا، بعض باتیں ذہن سے جاتی رہیں۔ اب تو ایسا کرو جو باتیں میں از خود بیان کروں، انہیں قبول کرلو، ورنہ مجھے تکلیف نہ دو۔ سنو! مکہ اور مدینہ کے درمیان میں ایک پانی کی جگہ پر جسے خم کہا جاتا ہے، حضورؐ نے کھڑے ہوکر ہمیں ایک خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے اور وعظ و پند کے بعد فرمایا: میں ایک انسان ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ میرے پاس رب کا قاصد آئے اور میں اس کی مان لوں۔ (یعنی پیغام اجل آئے اور اس پر میں لبیک کہوں اور آپ نے یہ اس لئے فرمایا کہ نبی کو آخری وقت میں اختیار دیا جاتا

ہے کہ وہ دنیاوی اور اخروی زندگی میں کسی ایک کو منتخب کرلے اور نبی ہمیشہ آخرت والی زندگی قبول کرتا ہے۔) میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، پہلی کتاب اللہ جس میں ہدایت و نور ہے۔ تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لو اور اسے مضبوطی سے تھام لو۔ پھر آپؐ نے کتاب اللہ کی طرف توجہ دلائی اور خوب متوجہ فرمایا۔ پھر فرمایا ''اور اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔'' تین مرتبہ یہی کلمہ فرمایا۔

قرآن مجید میں واقعہ غدیر کس طرح مذکور ہے ہم نے نشان دہی کردی۔ اب رہ گئی بات لوگوں کے اعتراضات کی تو اس کی تو کوئی حد ہے ہی نہیں کیوں کہ قرآن کی تمام ایسی آیات جن سے اہلبیت اطہار کی فضیلت واضح ہوتی ہے میں نکتہ چینیاں معمول ہیں۔ بہر حال ہم چند اعتراضات اور ان کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں۔

ا۔ پہلی بات تو یہ کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷ میں رسول کو ایک خاص حکم پہونچانے کی تاکید کی جارہی ہے جبکہ اسی سورہ کے ابتداء میں دین کے مکمل کیئے جانے اور اس سے راضی ہوجانے کی نوید دی جارہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ حکم پہلے ہوتا اور اس کی تعمیل کے بعد دین کے مکمل ہونے کی نوید سنائی جاتی۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ ترتیب موافق تنزیل کے نہیں ہے۔ فریقین میں مسلّم ہے کہ پہلا سورہ جو حضرتؐ پر نازل ہوا وہ سورہ اقراء باسم ہے مگر ترتیب میں وہ پارہ عم یعنی اخیر پارہ میں واقع ہے۔ اور پارہ اوّل سے بہت فصل پر واقع ہے اور آیہ ''یا ایھا الرسول بلّغ'' اور آیہ ''اکملت لکم'' تو کم سے کم ایک سورہ اور ایک پارہ میں واقع ہیں۔

۲۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آیہ ''اکملت لکم'' مکہ میں جب حضرت رسول اللہ کا حج آخری ختم ہوا یعنی قبل نزول آیہ ''یا ایھا الرسول بلغ '' کے نازل ہوئی۔ مگر یہ دلیل بالکل غلط ہے کیوں کہ آیہ بلّغ سے ثابت ہے کہ اس وقت تک ایک ایسا اہم اور عظیم کام باقی تھا جس کی تعمیل نہ ہونے سے رضائے پروردگار میں امر رسالت نا تمام تھا۔ یعنی حق تعالیٰ نے فرمایا تھا'' و ان لم تفعل فما بلغت رسالته (یعنی اے محمدؐ اگر تم اس کام کو نہ کروگے تو

گویا تم نے رسالت ہی نہیں کی) پس جب ایسا اہم امر جس کے بغیر تبلیغ رسالت ناتمام تھی تو "الیوم اکملت لکم دینکم" کیوں کر کہا جا سکتا تھا۔ اور یہ بات بعید از عقل ہے کہ بروز عرفہ تو اللہ کہے کہ آج ہم نے تمھارے دین کو کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی اور تمھارے اسلام سے راضی ہوئے اور پھر آٹھ دس ہی دن کے بعد فرمائے کہ اے محمد تم فلاں کام کرو اور اگر نہ کرو گے تو تم نے گویا کار رسالت ہی نہیں انجام دیا۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی کہ آیہ کریمہ "اکملت لکم" بعد آیہ "یا ایہا الرسول" کے آیا۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ آیہ "یا ایہا الرسول" بروز کارروائی غدیر کے آیا تھا اور چونکہ حجۃ الوداع کے بعد جناب رسالتمآبؐ نے سوائے کارروائی غدیر کے اور کوئی ایسی کارروائی نہیں کی جو ہمیشہ نہ کرتے ہوں۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ یہ رضامندی پروردگار عالم کی اور یہ اتمام نعمت اس معبود برحق کا علی مرتضیٰؑ کی جانشینی پر ہوا اور آیت "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" یعنی "آج ہم نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کیا اور آج ہم نے تم پر اپنی نعمتوں کا خاتمہ کیا اور آج ہم تمہارے اسلام سے راضی ہوئے" بعد کارروائی غدیر کے نازل ہوا۔ اس میں ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ خاتم النبیین ہوئے، آپؐ پر رسالت تمام ہوئی اور بعد اس کے سلسلہ امامت شروع ہوا جو قیامت تک قائم رہے گا۔ اس لئے جس وقت سلسلۂ امامت قائم ہو گیا بس دین کی تکمیل ہو گئی اور نعمتوں کا خاتمہ ہو گیا اور پروردگار عالم کی خواہش دین اسلام سے پوری ہو گئی۔

۳۔ واقعہ غدیر دین اسلام کا ایک بہت اہم واقعہ ہے اور اس پر علما و فضلا نے کئی کئی جلدوں پر بسیط کتابیں لکھی ہیں۔ "تفسیر در منثور"، "تفسیر ابن کثیر"، "کنز الایمان" اور دیگر تفاسیر میں مختلف راویوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ آیہ "اکملت لکم" کے نزول کے بعد یہودیوں نے کہا کہ اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی یا اگر ہم جانتے کہ یہ آیت کس دن نازل ہوئی تو ہم اسے یوم عید بنا لیتے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں جانتا ہوں یہ آیت کب اور کہاں نازل ہوئی۔ یہ میدان عرفات میں جمعہ ۹ ذی الحجہ کو نازل ہوئی۔

ہمارا مضمون صرف ''قرآن اور غدیر'' تک محدود ہے اس لئے ہم دوسرے نکات اور ان پر بحث سے صرف نظر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خطبۂ غدیر میں حضورؐ نے قرآنی تعلیمات اور اپنی تیئیس سالہ کاوشِ رسالت کا نچوڑ امت کے سامنے پیش کرنے کے بعد ایک جملہ ایسا کہا جو روح مومن کو ابد تک سرشار کرتا رہے گا اور وہ جملہ ہے: من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ.......زندگی رہی تو اس جملہ پر بات بھی آئندہ۔

دین کی تکمیل ہوئی تھی ولا کے جشن میں
روزِ روشن ، سامنے سب کے ، بہ میدانِ غدیر

مقابر مساجد

انبیاء و اولیاء علیہم السلام کی قبروں کی زیارت اوران کے احترام کے بارے میں یا ان کے شرعی جواز کے سلسلے میں مسلمانوں کے تمام مسالک میں کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ متاخرین حنابلہ جو کہ وہابی کہلاتے ہیں اس بارے میں مختلف عقیدہ و رائے رکھتے ہیں۔ خاندانِ آلِ سعود نے سرزمینِ حجاز میں جنابِ رسالت مآبؐ کی قبر مطہر کے علاوہ تمام مزارات اور روضے شہید کر دیے۔

حضورؐ کی حدیث ہے کہ ”جس نے میرے زیارت میرے انتقال کے بعد کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی اور جس نے میرے قبر کی زیارت کی میں قیامت کے روز اس پر گواہ ہوں گا (یا میں اس کی شفاعت کروں گا)۔“

اس حدیث کے بہت سے راوی ہیں۔ مسلمانانِ عالم جو حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ جاتے ہیں مدینۂ منورہ ضرور جاتے ہیں مسجدِ نبویؐ میں نمازیں پڑھتے ہیں قبرِ مبارک رسولؐ پر ضرور حاضری دیتے ہیں اور سلام پیش کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا مزاراتِ اہلِ بیت و صحابہؓ و ازواجِ مطہراتؓ کی قبروں پر روضے تعمیر کرنا جرم یا حرام ہے؟ جواب یہ ہے کہ جب روضۂ رسولؐ کی تعمیر غلط نہیں ہے تو دیگر اکابر کے روضوں کا وجود بھی غلط نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن مجید فرقانِ حمید سے رجوع کرتے ہیں:

سورۃ الکہف آیت ۲۱ کا آخری حصہ: **قال الذین غلبوا علیٰ امرھم لنتخذنّ علیھم مسجدا۔** ترجمہ: جب مومنین کی رائے ان کی رائے پر غالب آئی انہوں نے کہا ہم تو یہاں (غار کے پاس) ایک مسجد بنائیں گے۔

اس آیت (یعنی سورۃ الکہف کی آیت ۲۱) کے سلسلہ میں "تفسیرِ نمونہ" از ناصر مکارم شیرازی میں لکھا ہے:

اس کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے ارادہ کیا کہ ان کی آرام گاہ کے پاس عبادت خانہ بنائیں۔ قرآن نے زیرِ بحث آیت میں ان کے اس ارادے کو موافقت کے لہجے میں بیان کیا ہے۔ یہ امر نشان دہی کرتا ہے کہ بزرگانِ دین کی قبور کے احترام میں وہابیوں کے خیال کے برعکس مسجد اور عبادت خانہ بنانا نہ صرف حرام نہیں ہے بلکہ اچھا اور پسندیدہ کام ہے۔ اصولی طور پر ایسی عمارتیں کہ جو اہم اور عظیم شخصیات کی یاد کو زندہ رکھیں ان کی تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے ساری دنیا کے لوگوں میں رہا ہے اور آج بھی۔ دراصل اس کام سے ان بزرگوں کے بارے میں ایک طرح سے قدردانی اور احسان شناسی کا احساس ہوتا ہے۔ نیز جیسے کام انہوں نے کئے ان سے ان کی طرف رغبت اور شوق دلانے کا مفہوم بھی اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلام نے نہ صرف اس کام سے منع نہیں کیا بلکہ اسے جائز شمار کیا ہے۔ اس قسم کی عمارتوں کا وجود ایسی شخصیتوں ان کے کام اور ان کی تاریخ کے لئے ایک تاریخی سند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن انبیاء و مرسلین اور دیگر شخصیات کی قبریں نہیں ملتیں ان کی تاریخ بھی مشکوک ہو گئی ہے اور ایک سوال بن کر رہ گئی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کی عمارات ہرگز توحید کی نفی نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے وجود سے اس بات کی ذرہ بھر نفی ہوتی ہے کہ عبادت فقط اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ کیوں کہ احترام کرنا اور ہے اور عبادت کرنا اور ہے (تفسیر نمونہ جلد ۷ ص ۴۲)۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کی قبرِ پرنور کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے:

آیۂ درود یعنی سورۂ احزاب کی آیت ۵۶ کی تفسیر کے سلسلے میں "تفسیر ابنِ کثیر" میں ہے:

"ابنِ ماجہ میں ہے جمعہ کے دن بکثرت درود پڑھو۔ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ جب مجھ پر کوئی درود پڑھتا ہے اس کا درود مجھے پیش کیا جاتا ہے جب تک وہ فارغ ہو۔ پوچھا گیا: موت کے بعد بھی؟ فرمایا: اللہ تعالےٰ نے زمین پر نبیوں کے جسموں کو گلانا سڑانا حرام کر دیا ہے۔ نبی اللہ زندہ ہیں۔ روزی دیئے جاتے ہیں۔

اسی تفسیر میں آگے چل کر ہے کہ:

حضرت کعبؓ کہتے ہیں: ہر صبح ستر ہزار فرشتے اتر کر قبرِ رسولؐ کو گھیر لیتے ہیں اور اپنے پر سمیٹ کر حضورؐ کے لئے دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں اور ستر ہزار رات کو آتے ہیں۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن جب آپ کی قبرِ مبارک شق ہوگی تو آپ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔۔۔" (تفسیر ابنِ کثیر۔ جلد ۴ص ۲۹۳ اور ۲۹۶)۔

"سیرت نبویؐ۔ ایک مطالعہ" میں استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ جناب رسالت مآب کی والدہ گرامی جناب آمنہ کی قبر کے بارے میں لکھتے ہیں:

حضور اکرمؐ اپنی والدہ اور ان کی کنیز کے ہمراہ واپس تشریف لا رہے تھے کہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان "ابواء" نامی مقام پر جو آج بھی موجود ہے' ان کی والدہ گرامی علیل ہو جاتی ہیں' آہستہ آہستہ اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ ان میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہیں رہتی اور آخرِ کار وہیں ان کی وفات ہو جاتی ہے۔ یہ ننھا بچہ اپنی آنکھوں سے دورانِ سفر اپنی ماں کی موت کو واقع ہوتے دیکھتا ہے۔ حضرت آمنہ کو وہیں دفن کر دیتے ہیں۔

اس واقعہ کو لگ بھگ پچاس سال گزر چکے تھے' ہجرت کا قریب قریب تیسرا سال تھا پیغمبرؐ کا ایک سفر کے دوران اسی "ابواء" کے مقام سے گزر ہوا۔ آپ سواری سے نیچے اتر گئے۔ اصحابؓ نے دیکھا کہ آپ کسی سے کچھ کہے بغیر ایک طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ بعض لوگ آپؐ کے پیچھے ہو لئے تاکہ دیکھیں کہ آپؐ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ' بہت دور چلنے کے بعد ایک خاص مقام پر پہونچے' وہاں بیٹھ گئے۔ اور دعا 'حمد اور قل ھو اللہ وغیرہ پڑھنے لگے۔ پھر ان لوگوں نے دیکھا کہ آپؐ گہری سوچ میں ڈوب گئے ہیں اور آپ کی پوری توجہ کا مرکز زمین کا وہی خاص مقام ہے۔ اس حال میں آپؐ زیرِ لب کچھ پڑھ رہے ہیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اصحاب نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ فرمایا: یہاں میرے ماں کی قبر ہے' پچاس سال پہلے میں نے اپنی والدہ کو اسی مقام پر دفن کیا تھا۔ ("سیرتِ نبویؐ' ص ۲۲۸۔۲۲۹)

وفات پیغمبرؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو آپ کے پہلو میں دفن کیا جانا اور حضرت عمرؓ کا آخرِ حیات میں اپنے آپ کو پیغمبر اکرمؐ و حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن کیے جانے کی خواہش کا اظہار بھی قبورِ اکابرین کی عظمت و اہمیت کا بہت واضح ثبوت ہے۔

جن احادیث کا حوالہ مولانا مودودی نے ''تفہیم القرآن'' میں سورۂ کہف کی آیت ۲۱ کی تفسیر میں دیا ہے عرض ہے کہ یہ احادیث سابقہ امتوں کے حوالے سے ہیں جنہوں نے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنایا۔ احکاماتِ نبوی کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں نے کبھی بھی روضۂ رسولؐ یا ائمہ اکرامؑ یا اولیاء و صالحین کے مقابر کو عبادت گاہ نہیں بنایا۔ ہر جگہ جہاں بھی ایسے روضے ہیں ان کے ساتھ مساجد ہیں جہاں نمازِ باجماعت کا اہتمام ہوتا ہے۔ خود مسجدِ نبویؐ میں روضۂ رسولؐ کے اطراف میں قبلہ رو ہو کر مسلمانانِ عالم نماز ادا کرتے ہیں۔ اب تو مسجدِ نبوی کو اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ روضۂ مبارک تقریباً مسجد کے وسط میں ہو گیا ہے۔ اصحابِ صفہ کا چبوترہ جو روضۂ رسولؐ سے بالکل متصل ہے اس پر بھی لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ سامنے روضہ ہوتا ہے' کیا وہ لوگ نعوذ باللہ روضۂ رسول کو سجدہ کرتے ہیں؟ دنیا میں جا بجا اکابرین کے مزارات ہیں جن پر جا کر لوگ نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ملحقہ مساجد میں عبادتِ الٰہی سرانجام دیتے ہیں۔ سعودی عرب کے علاوہ کہیں بھی کفر و شرک یا بدعت کا شور و غوغا بلند نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں صرف عورتوں کو قبور کی زیارت سے منع کیا جا رہا ہے گویا مردوں پر کوئی پابندی نہیں۔ پھر قبور پر مسجد بنانے سے منع کیا جا رہا ہے' قبور کے پاس مسجد بنانے سے نہیں۔ عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ قبور پر مساجد کہیں بھی نہیں ہیں۔ یہ اعتراض بیت اللہ کے حطیم پر کیا جا سکتا ہے جس میں روایت ہے کہ جنابِ حاجرہؑ اور جنابِ اسماعیلؑ کے علاوہ ستر انبیاء علیہم السلام کی قبور ہائے مبارک ہیں۔ لوگ یہاں خشوع و خضوع سے نمازیں بجا لاتے ہیں۔ حطیم میں نماز کی بہت فضیلت ہے' یہاں نماز پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ نماز خانہ کعبہ کے اندر پڑھی گئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانانِ عالم ان احادیث پر عمل پیرا ہیں۔ سوا سعودی عرب' ہر جگہ یعنی

ہندوستان، پاکستان، ایران، عراق، ترکی، شام، اردن، مصر غرض یہ کہ جہاں جہاں انبیاء واوصیاء، صحابہ اکرامؓ، ازواج مطہراتؓ، اہلِ بیت اطہارؑ، اولیاء اللہ، بزرگانِ دین اور معتبرین خدا کے مزارات ہیں ان کی تزک واحتشام سے تزئین کر کے اپنی عقیدت ومحبت کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔ ان مزارات کے ساتھ لازماً مساجد ہوتی ہیں یا اطراف مزار نماز ادا کرنے کی جگہ ہوتی ہے جن میں زائرین قبلہ رو ہو کر عبادتِ الٰہی، شرعی احکامات کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ یہ مقامات تبلیغ دین کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

انہدام جنت البقیع آل سعود کا وہ شرمناک عمل ہے جس پر تاریخ گریہ کناں ہے۔ طاقت اور اقتدار کے زور پر کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی کی کتاب ''تاریخ مکہ مکرمہ'' سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''پھر وہ وقت آیا جب حجاج بن یوسف نے اموی حکمراں عبدالملک بن مروان کو لکھا کہ ابن زبیرؓ نے تعمیر کعبہ میں بعض تبدیلیاں کردی ہیں، کچھ حصہ جو پہلے تعمیر میں داخل نہیں تھا اس کو کعبہ کی عمارت میں داخل کر دیا ہے نیز ایک دروازہ کا اضافہ کر دیا ہے، یہ اطلاع پا کر عبدالملک بن مروان نے حکم دیا کہ ان کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے سابقہ حالت پر بیت اللہ کی تعمیر کردی جائے۔

چنانچہ حجاج نے سابقہ تعمیر (یعنی تعمیرِ قریش) کے مطابق کعبہ کو تعمیر کیا پھر جب عبدالملک بن مروان کو معلوم ہوا کہ حضرت ابن زبیرؓ نے جو تعمیر کی تھی وہ حضرت عائشہؓ سے مروی مذکورہ حدیث کی بناء پر تھی تو وہ بہت پریشان ہوا اور کہا کہ اگر مجھے یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی تو میں حضرت ابن زبیرؓ کی تعمیر کے انہدام کا حکم نہ دیتا۔

بعد میں پھر عباسی خلفاً میں سے کسی نے امام مالکؒ سے پوچھا کہ اگر کعبہ کو گرا کر پھر اسی طرح تعمیر کر دیا جائے جس طرح حضرت ابن زبیرؓ نے بنایا تھا تو کیا حرج ہے؟ امام مالکؒ نے جواب دیا امیر المومنین آپ کو اللہ کا واسطہ بیت اللہ کو بادشاہوں کا کھلونا نہ بنائیں کہ ایک آئے تو وہ اپنی مرضی کے مطابق بنائے پھر دوسرا آئے تو پہلے کی بنائی ہوئی عمارت گرا

کرا پنے طور پر بنائے اور اس طرح اس گھر کی عظمت و ہیبت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہے۔

آل سعود کا جنت البقیع کو تاراج کرنا اسی قسم کا شاہی مشغلہ تھا۔ لیکن ان کو اس اقدام سے باز رکھنے والا اس وقت کوئی نہ تھا۔ جناب سیدہؑ ان کے چار فرزند ائمہ ' بہت سے صحابہ ' ازواج رسولؐ اور حضور کے خاندان کے بے شمار اکابرین کی قبریں گریہ کناں ہیں اور تا قیامت گریہ کناں رہیں گی ۔ ان کی تاراجی سے ان یادگاروں کی محبت اور عقیدت میں اضافہ ہی ہوا ہے کوئی کمی نہیں آئی۔

صدیوں سے تعمیر شدہ یادگاروں کو صرف اس وجہ سے ختم کر دینا کہ وہ صاحبان اقتدار کے مسالک سے مطابقت نہیں رکھتے انتہائی کریہہ عمل ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ہندوستان اور اسرائیل کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کتنی دیدہ دلیری سے صرف طاقت اور تشدد کے بل بوتے پر بابری مسجد کو شہید کر دیا گیا اور دوسری مساجد اور یادگاریں ان کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ کیا ہندوستانی حکومت کے عمل کو سراہا جا سکتا ہے؟ ایک طویل عرصہ سے اسرائیل نے قبلۂ اول پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے کیا پورا عالم اسلام اس پر سراپا احتجاج نہیں ہے۔ اور کیا اسرائیل کو اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ مسجد اقصےٰ میں من مانی ترمیمات کر لے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ سعودی حکومت فہم و دانش مندی سے کام لے اور ان مقدس مقامات کو تزک و احتشام سے نئے سرے سے تعمیر کرائے اور رسولؐ اور آل رسولؑ کی خوشنودی حاصل کرے۔



سیّد رفیق عباس جعفری

E-Mail: rafiqabbasjafri@hotmail.com

مسجد نبوی میں ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ نوافل ادا کر رہے تھے اور بعد میں آنے والے اپنی نماز ادا کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک سوالی مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی۔ وہ شخص پوری مسجد میں گھوما۔ جب کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی تو اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور گویا ہوا "اے اللہ! گواہ رہنا میں نے تیرے رسولؐ کی مسجد میں سب سے مدد طلب کی ہے لیکن کسی نے بھی میرا جواب دینا گوارا نہیں کیا۔" ایسے میں اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو انگلی کے اشارے سے دوران نماز کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ شخص اس نمازی کی طرف تیزی سے گیا تو دیکھا کہ وہ نمازی حالت رکوع میں اپنی انگلی اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ انگلی میں ایک چاندی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ سائل سمجھ گیا کہ نمازی نے دوران نماز اس کا استغاثہ سن لیا ہے اور اپنی نماز کے ختم کرنے سے پہلے اس کے سوال کو پورا کرنا چاہتا ہے اور انگوٹھی والی انگلی سے اشارہ کر کے چاہتا ہے کہ اس سے انگوٹھی اتار لی جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور بآسانی انگوٹھی انگلی سے اتار لی۔ اس کی مایوسی خوشی میں تبدیل ہوگئی کیونکہ اس کی حاجت پوری ہوگئی تھی۔ وہ جھولی پھیلا پھیلا کر دینے والے کو دعائیں دیتا خوشی خوشی چلا گیا۔ انگوٹھی عطا کرنے والے بحرِ جود و سخا حضرت علیؑ تھے۔۔۔۔

اقتباس از مضمون "سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں"

قمر زہرا میموریل اکیڈمی، کراچی